جدید ادب جرمنی

www.jadeedadab.com

شمارہ:10

تُو کس کا سوالی تھا
دامنِ دل جس کا
خود اپنا ہی خالی تھا

مدیران:
حیدر قریشی
نذر خلیق

جدید ادب جرمنی شمارہ:10 مدیران: حیدر قریشی نذر خلیق

JADEED ADAB Literary Urdu Journal (January To June 2008)

Haider Qureshi Rossertsr.6, Okriftel, 65795 Hattersheim, Germany
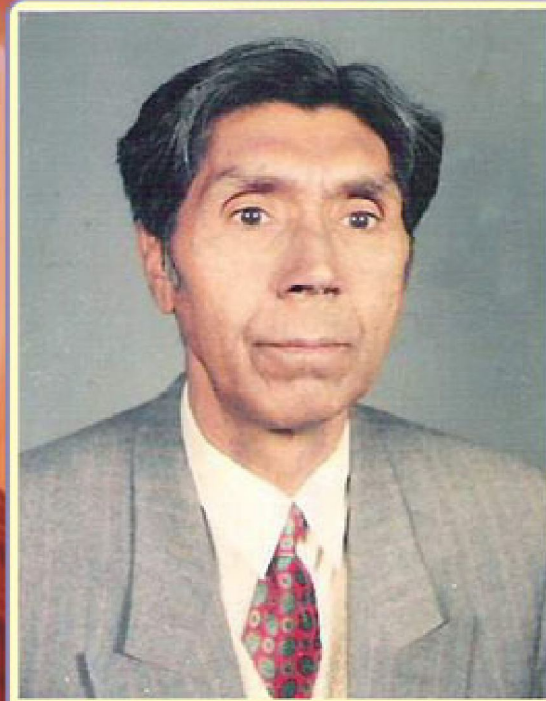
اس لکھے کی تاریخ بنے گی کبھی اکبرؔ
جب تک ہے تمھیں تاب رقم اور بھی لکھنا

ملنے کا پتہ
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(India)
Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-011-23211542
Website: www.ephbooks.com
E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com

اردوستان: انٹرنیٹ کی دنیا کا ایک اہم نام۔ اردو کی سب سے پرانی ویب سائٹ جو اردو سے محبت کرنے والوں کے لئے ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ اردوستان نیٹ ورک کی بنیادی اور اہم ترین ویب سائٹ۔

کاشف الھدیٰ کی نفع و نقصان سے بے نیاز رہ کر اردو کی خدمت کی لگن

www.urdustan.com

حیدر قریشی کا کالم **منظر اور پس منظر** اور کالم **خبر نامہ** بھی ان لنکس پر موجود ہیں۔

http://www.urdustan.com/manzar/

http://urdustan.com/khabarnama/

کتاب گھر: مفت اردو کتب (E-Books) فراہم کرنے والی سب سے بڑی ویب سائٹ، جس میں مختلف موضوعات پر ۱۰۰ سے زائد کتب مطالعہ کے لئے آن لائن دیکھی جا سکتی ہیں یا ڈاؤن لوڈ کی جا سکتی ہیں۔ **www.kitaabghar.com**

اردو دوست ڈاٹ کام : خورشید اقبال کی خوبصورت ویب سائٹ

www.urdudost.com

سہ ماہی ادبی رسالہ **کائنات**، ادبی خبر نامہ **اردو ورلڈ**، ادیبوں کی تصاویر پر مشتمل **ادبی البم**، ای بکس کا سلسلہ **اردو دوست لائبریری** اور دلچسپی کے متعدد دوسرے سلسلوں سے مزین ویب سائٹ۔

حیدر قریشی کے کالموں کا نیا سلسلہ **اِدھر اُدھر سے** بھی اسی سائٹ پر چھپتا ہے۔

سردار علی کی بنائی ہوئی خوبصورت ویب سائٹ **http://sherosukhan.tripod.com/**

کینیڈا سے ریحانہ احمد کی جانب سے جاری کردہ انٹرنیٹ ادبی رسالہ دستک

http://dastak-urduduniya.com/

حیدؔر اک اور ہی دنیا ہے یہ انٹرنیٹ کی
کیا سے کیا ہو گیا ہوں سات برس کے اندر

www.haiderqureshi.com

حیدر قریشی کی تخلیقات پر مشتمل ویب سائٹ جس میں غزلیں، نظمیں، ماہیے، (پانچ شعری مجموعے)، دو افسانوی مجموعوں کے افسانے، ایک مجموعہ کے خاکے، کتاب کھٹی میٹھی یادیں، سفر نامہ سوئے حجاز، انشائیوں کا مجموعہ، حیدر قریشی سے لئے گئے انٹرویوز اور مزید بہت کچھ آن لائن ہے۔ مجموعی طور پر بارہ سے زیادہ کتب ایک ہی ویب سائٹ پر دستیاب ہیں۔

----

http://haiderqureshi.spaces.live.com/

حیدر قریشی کی شعری و نثری تخلیقات کے انگریزی تراجم کی ویب سائٹ۔ جہاں انگریزی تراجم کے ساتھ بعض تخلیقات کے جرمن، ترکی اور عربی تراجم بھی موجود ہیں۔ ترجمہ نگاروں کی تصاویر سے مزین ایک سادہ مگر دلچسپ ویب سائٹ۔ ایک انگریزی ویب سائٹ کی طرف سے لیا گیا انٹرویو اور ایک اور سائٹ کی طرف سے حیدر قریشی کو Auther of the Month (september 06) کے طور پر چھاپنے کے بعد اس سائٹ کی گیسٹ بک پر آنے والے تاثرات کو اس سائٹ پر حوالوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

حیدر قریشی کی شاعری کے تراجم کے لئے اس لنک کو کلک کریں:

http://haiderqureshi.blogspot.com/

حیدر قریشی کے افسانوں کے انگریزی تراجم کے لئے اس لنک کو کلک کریں:

http://haiderqureshisstories.blogspot.com/

سروَر ادبی اکادمی جرمنی کے زیرِ اہتمام

بیک وقت کتابی صورت میں اور انٹرنیٹ پر دستیاب ہونے والا اردو کا ادبی جریدہ

جدید ادب

www.jadeedadab.com

شمارہ:10(جنوری تا جون2008ء)

مدیر حیدر قریشی

مدیر(اعزازی) ڈاکٹر نذر خلیق

رابطہ کرنے کے لئے اور تخلیقات بھیجنے کے لئے ایڈریسز

1-Haider Qureshi Rossertstr.6 , Okriftel, 65795-Hattersheim, Germany.

2- Prof. Dr. Nazar Khaleeq, H. No .163/E, Mohallah Rahimabad, Khanpur-64100, (pak)

جن احباب کے پاس ای میل کی سہولت ہے وہ ان پیج فائل میں اپنا میٹر ان ای میل ایڈریسز پر بھجوائیں۔شکریہ!

hqg786@arcor.de اور khaleeqkhanpur@yahoo.com

ملنے کا پتہ

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108,VAKIL STREET,KUCHA PANDIT, LAL KUAN, DELHI-6,(INDIA)

PH:23215162, 23214465, FAX: 011-23211540

E-MAIL: ephdelhi@yahoo.com

فہرست

تخلیقات سے انتخاب

غزلیں

افسانے

نظمیں

خصوصی مطالعہ

گوپی چند نارنگ مترجم یا مصنف؟

ماہیے

کتاب میلہ: مطالعۂ اقبالیات (ڈاکٹر وسیم انجم)۔ پرورشِ لوح وقلم (ڈاکٹر لدمیلا) غفلت کے برابر (ابرار احمد)۔ خوشبو کا سفر (طاہر مجید)۔ سمندر سوچتا ہے (رئیس الدین رئیس)

تفصیلی مطالعہ:

ڈاکٹر جمیل جالبی، افتخار عارف، عبداللہ جاوید، ڈاکٹر ستیہ پال آنند، دانش غنی، سعید شباب، ھانی السعید المصری، کاوش پرتا پگڈھی، طاہر نقوی، ڈاکٹر مقبول احمد مقبول، شہپر رسول، فیصل عظیم، رئیس الدین رئیس، سلطانہ مہر، سید مزمل الدین، افتخار امام صدیقی، رفیق شاہین، نعیم الرحمٰن، ڈاکٹر انور سدید، ابصار عبدالعلی، اسلم رسولپوری، عبداللہ جاوید۔

ٹائٹل کی پینٹنگ: **عظمیٰ احمد** (جرمنی)
سیٹنگ: **مصطفی کمال پاشا** (دہلی)

ایک چھوٹی سی وضاحت

میری یادوں کا یہ باب (روح اور جسم) جدید ادب کے شمارہ: ۹ میں چھپنے کے لئے پریس میں جا چکا تھا جب مجھے ایک مدت کے بعد پھر جمیل الرحمٰن کا فون آ گیا۔ان کا فون آنے سے خوشی بھی ہوئی اور افسوس بھی ہوا۔میں نے انہیں کھل کر بتا دیا کہ میں نئے باب میں آپ کا ''ذکرِ خیر'' کر چکا ہوں۔انہوں نے کہا کہ کوئی بات نہیں، آپ نے جو لکھا، میں کچھ نہیں کہوں گا۔ان کے ساتھ مختلف ادبی موضوعات پر بات ہوئی۔''**رہے نام اللہ کا!**'' کے مندرجات انہیں بہت پسند آئے تھے۔اس پر بہت خوشی کا اظہار کرتے رہے۔سائنس، مذہب اور ادب کی اپنی اپنی خود مختاری کے ساتھ تینوں کے ربطِ باہم پر دلچسپ باتیں ہوئیں۔بحیثیت شاعر میں نے ان کی خوبیوں کو مانا ہے، خامیوں کا انہیں خود بخوبی علم ہے۔میں جمیل الرحمٰن سے اپنی شدید ناراضی کے دنوں میں بھی اپنے مضمون ''یورپی ممالک میں اردو شعر و ادب: ایک جائزہ'' میں نہ صرف ان کا ذکر کر چکا ہوں بلکہ انہیں یورپ کے ان معدودے چند شعراء میں شمار کیا ہے، جو اردو شاعری کی نام نہاد بین الاقوامیت سے قطع نظر، اردو کی مین سٹریم یا ادب کے مرکزی دھارے کے اہم شعراء کے ہم پلہ ہیں۔نجی سطح پر جو دکھ تھا وہ ان کی دوبارہ ٹیلی فون کالز آنے پر ہونے والی کھلی اور دو ٹوک گفتگو نے دور کر دیا ہے۔شاید بہت ساری غلط فہمیاں عدم رابطہ کے باعث بھی ہو جاتی ہیں۔اللہ انہیں خوش رکھے۔ (ح۔ق) **(جدید ادب کے گزشتہ شمارہ میں چھپنے والی یادوں کی قسط کے حوالے سے یہ نوٹ میں نے اپنی کتاب کھٹی میٹھی یادیں میں سے لیا ہے۔جمیل الرحمٰن اپنے اس فون کے بعد جرمنی میں بھی آئے اور ہم دونوں نے ۳۱ اگست ۲۰۰۷ء کا آدھا دن ایک ساتھ گذارا۔حیدر قریشی)**

Jadeed Adab ist kostenlos,man muss nur die Versndkosten Übernehmen.

گفتگو!

اس بار کسی ادبی مسئلہ پر گفتگو کرنے کی بجائے حکومت پاکستان کی خدمت میں ڈاک کے شعبہ میں کتابوں اور رسالوں کے ساتھ ہونے والے اندوہناک سلوک کا کچھ ذکر کرنا ہے۔ چونکہ ملک میں نئی اور کسی حد تک عوامی قیادت کے سامنے آنے کا امکان ہو رہا ہے تو ان آنے والوں کے سامنے یہ احوال پیش کرنا ہے۔

گزشتہ چند برسوں سے پاکستان میں ڈاک کے محکمہ نے بیرون ملک کتابوں اور رسائل کی ترسیل کے نرخ اتنے ہولناک کر دیئے ہیں کہ نہ تو پاکستان سے کسی ادیب کو ہمت ہوتی ہے کہ اپنی کتاب کسی کو بیرون ملک بھیج سکے اور نہ ہی باہر سے کسی دوست کو کتاب کی فرمائش کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔ دونوں طرف ایک دوسرے کی مجبوری کو بخوبی سمجھ لیا جاتا ہے۔

پاکستان کے برعکس انڈیا میں ڈاک خرچ اندرون ملک اور بیرون ملک اتنے کم ہیں کہ پاکستانی ڈاک خرچ کے ساتھ ان کا موازنہ کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ جرمنی میں بیٹھ کر پاکستان سے چھ مہینے بعد ایک پرچہ چھپوایا تو جتنی رسالے پر لاگت آئی، ڈاک کا خرچ اس سے بھی زیادہ ہو گیا۔ اتنی مہنگائی کے باوجود رجسٹرڈ بک پوسٹ کے کئی پیکٹس منزل پر پہنچ ہی نہیں پائے۔ تین رسالوں کا شدید نقصان اٹھانے کے بعد انڈیا سے جب وہی پرچہ چھپوایا تو پاکستانی ڈاک خرچ کی رقم کے برابر نہ صرف پرچہ چھپ گیا بلکہ امریکہ، کینڈا، یورپ، مصر، ترکی، روس، اور پاکستان وانڈیا میں اس کی ترسیل بھی ہو گئی۔ پاکستان سے چند پرچے چھپوانے اور شدید مالی نقصان اُٹھانے کے بعد اب میں آسانی سے انڈیا سے پرچہ چھپوا رہا ہوں۔ مجھے ذاتی طور پر کچھ ایسا مسئلہ درپیش نہیں ہے۔ لیکن اب بعض پاکستانی ادبی رسائل جو چھ ماہ یا ایک سال کے بعد ایک آدھ کتاب چھاپتے تھے انہوں نے بھی یہی مناسب جانا ہے کہ پرچہ انڈیا سے چھپوا کر وہیں سے اس کی دنیا بھر میں ترسیل کر دی جائے۔ جو ادبی رسائل پاکستان سے چھپ رہے ہیں (چند مستثنیات کو چھوڑ کر) عملاً وہ سب پاکستان سے باہر کے اردو ادیبوں اور قارئین سے کٹ کر رہ گئے ہیں۔ اس پر چند مدیران اور ادیبوں نے احتجاج بھی کیا تھا لیکن وہ احتجاج صدا بصحرا ثابت ہوا۔

اگر نئی آنے والی حکومت کو علم، ادب اور کتاب سے ذرا سی بھی ہمدردی ہو تو ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ ہر طرح کی کتابوں، رسالوں کی بیرون ملک ترسیل کے ڈاک خرچ کو ہندوستانی محکمہ ڈاک کے نرخوں کے برابر لایا جائے۔ آپ ادب اور کتاب دوستی کا اظہار نہ سہی، ادب اور کتاب دشمنی کے ارتکاب سے تو بچیں۔ محکمہ ڈاک کے موجودہ بیرون ملکی نرخ کھلی ادب دشمنی اور کتاب دشمنی ہیں۔

حیدر قریشی

حمدِ باری تعالیٰ

صبا اکبر آبادی

کس نے سمجھی جہاں میں تیری شان
تو قوی و کریم اور سبحان
بخش دے دل کو دولتِ عرفان
اے خدائے رحیم یا رحمان

تیرا قانون لائے تیرے رسول
اب کھلا دے ہمارے دل کے پھول
سب کی کرتا ہے تُو دعائیں قبول
اے خدائے رحیم یارحمان

ایک اک حرف جس کا ہے پُرنور
جس میں ہے تیری حکمتوں کا ظہور
تیرا قرآن آخری دستور
اے خدائے رحیم یارحمان

ہم ہیں تیرے حبیبؐ کی امت
دُور کر ہم سے جو بھی ہو آفت
آسرا دے گی اب تری رحمت
اے خدائے رحیم یارحمان

ہم تیرا شکر ادا کریں کیوں کر
تو نے بخشا ہے ہم کو ہر جوہر
بھیج دے اب فرشتوں کا لشکر
اے خدائے رحیم یارحمان

نعتِ رسول ﷺ

صادق باجوہ (امریکہ)

نبیؐ کا نام گر وِردِ زباں اِک بار ہو جائے
سرورِ جاں میسر ہو یہ دل سرشار ہو جائے

تعجب ہے نظر آتی نہیں جلووں کی تابانی
جمالِ مصطفیٰؐ سے نیند خود بیدار ہو جائے

تعصب سے عدو کی چشمِ بینا ہوگئی اندھی
نظر آئے نہ جو دشمن کا بھی غمخوار ہو جائے

محبت کی نظر شفقت سے پُر وہ نورِ فارانی
پڑے انکی نظر تو دشت بھی گلزار ہو جائے

تمنا دید کی دل میں مچلتی ہی رہی اکثر
خوشی کی انتہا ہو خواب میں دیدار ہو جائے

سنبھل کر ہر قدم اُٹھے متاعِ دل بھی رکھ لینا
کہیں ایسا نہ ہو تُو راندۂ دربار ہو جائے

گناہوں میں گھرا ہوں اک ذرا چشمِ کرم مجھ پر
مرے حامی، مرے آقا مری سرکار ہو جائے

چلے کچھ بھیگتے اشکوں کا نذرانہ لئے صادق
اگر ہو بختِ یارائی تو بیڑا پار ہو جائے

نعتِ رسول ﷺ

جسٹس رانا بھگوان داس

(پاکستان سپریم کورٹ، اسلام آباد)

نبیِ مکرم ﷺ ، شہنشاہِ عالی — بہ اوصافِ ذاتی و شانِ کمالی

جمالِ دو عالَم تری ذاتِ عالی — دو عالَم کی رونق تری خوش جمالی

خدا کا جو نائب ہوا ہے یہ انساں — یہ سب کچھ ہے تیری ستودہ خیالی

تو فیاضِ عالَم ہے، داتائے اعظم — مبارک ترے در کا ہر اک سوالی

نگاہِ کرم ہو نگاہوں کا صدقہ — ترے در پہ آیا ہوں بن کے سوالی

میں جلوے کا طالب ہوں اے جانِ عالَم — دکھادے، دکھادے وہ شانِ جمالی

ترے آستانہ پہ میں جان دوں گا — نہ جاؤں، نہ جاؤں، نہ جاؤں گا خالی

تجھے واسطہ حضرتِ فاطمہؓ کا — مِری لاج رکھ لے دوعالَم کے والی

نہ مایوس ہونا یہ کہتا ہے بھگوؔن
کہ جودِ محمد ﷺ ہے سب سے نرالی

شہزاد احمد (لاہور)

حلقہ ارباب ذوق اسلام آباد کے سالانہ اجلاس ۲۰۰۷ء میں دیا گیا

خطبۂ صدارت

خواتین و حضرات!

میں آپ کا، حلقہء اربابِ ذوق اسلام آباد کا بے حد ممنون ہوں۔آپ نے ذرہ نوازی کی۔ حلقے نے دعوت دے کر اور آپ نے تشریف لا کر۔آج میرا ارادہ حلقہ سے اپنا تعلق بیان کرنے کا نہیں، حالانکہ میں اس کا سیکریٹری جنرل بھی رہ چکا ہوں، لاہور شاخ کا سیکریڑی بھی۔راولپنڈی حلقے سے بھی میرا تعلق خاص رہا ہے۔

آج میں آپ کے سامنے کچھ سوال پیش کرنے کی جسارت کروں گا۔ یہ سوال مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں، شاید آپ بھی اسی طرح محسوس کرتے ہوں۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ ادب کو تخصیص کا رنہیں ہونا چاہیے۔ دنیا کا ہر سوال ادب کا سوال ہے کیونکہ ادب کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی اور ادب نے علوم کے تمام مسائل کو اپنا دائرہ کار بنایا ہے۔شاعری کے بارے میں عام طور پر یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ وہ بری طرح ماضی پرستی کا شکار ہے۔عہد کوئی بھی ہو سمجھا یہ جاتا ہے کہ گزرا ہوا زمانہ بہت بہتر تھا اور وہ عہد جس میں ہم زندہ ہیں، تاریخ کا بد ترین زمانہ ہے۔ یہ تاثرات تو شیکپیئر کے ہاں بھی ملتے ہیں اور اس زمانے کے شاعروں میں بھی جس کو عہد زریں کے نام سے ہم یاد کرتے ہیں۔

شاعری، خواب اور جوک (Joke) کا آپس میں بہت گہرا رشتہ ہے۔ میں نے جان بوجھ کر جوک کا انگریزی لفظ استعمال کیا ہے کیوں کہ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ مزاح اور لطیفے دونوں کے زمرے میں نہیں آتا۔ مثال کے طور پر غالبؔ کے ہاں ایسے بظاہر نیم سنجیدہ اشعار بار بار نظر آتے ہیں جو اصل میں کسی دکھ یا تکلیف کا اظہار کرتے ہیں۔انہیں سن کر زیادہ سے زیادہ آپ مسکرا سکتے ہیں، ہنس نہیں سکتے۔ ہنسنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ توانائی کو اچانک release کر دیا جائے چنانچہ مزاحیہ شاعری کم کم ہی شاعری ہوتی ہے۔ وہ انسان کی توانائی کو اچانک خارج کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔اور ہم سب لوگ اپنے اندر اس قدر گھٹن کا شکار ہوتے ہیں کہ ہم اس توانائی کو خارج کرنے کے وسیلے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ قہقہہ تخلیق کرنے کا سبب بن سکتے ہیں ان

کی مقبولیت میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ کہتے ہیں کہ ہمیں کسی عورت کے گال کا ایک تل پسند آجائے تو ہم پوری عورت سے شادی کر لیتے ہیں۔

شاعری اور خواب کے تار و پود ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں، کچھ سمجھ میں آنے والے اور کچھ سمجھ میں نہ آنے والے۔ مگر شاعری کی ایک قسم ایسی بھی ہے جس کے معانی اس کے لفظوں سے زیادہ نہیں ہوتے، اگر بین السطور دیکھنے کی کوشش کی جائے تو ایک خلا کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔ فوری طور پر سمجھ میں آنے والی شاعری زیادہ تر اسی زمرے میں آتی ہے، اس طرح کی شاعری کو آگے بڑھانے میں فی زمانہ مشاعروں نے بھی خاصا کردار ادا کیا ہے۔ شاید اسی وجہ سے بار بار یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ شاعری سے ہم کیا توقعات رکھتے ہیں؟

اپنے اس موقف کو واضح کرنے کے لئے میں ایک مثال دینا چاہتا ہوں، کیونکہ دنیا کی بہت سی حکمت مثالوں ہی کے ذریعے دوسروں تک پہنچائی گئی ہے۔ سائنس کے بارے میں صدیوں تک یہ تاثر قائم رہا کہ سائنسی اصول اصل میں بے حد سادہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ نیوٹن نے اس نظریے پر مہر اثبات ثبت کردی۔ اس کے مداحوں نے کہا ''نیوٹن ظاہر ہوا اور روشنی ہوگئی۔'' اگرچہ نیوٹن کی دی ہوئی روشنی ہمارے لئے اب بھی بہت کارآمد ہے مگر یہ اس شاعری کی طرح ہے جس کے بین السطور معانی مفقود ہوتے ہیں۔ اگر اصول بے حد سادہ ہو تو اسے زندگی میں صرف ایک بار دریافت کرنا کافی ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کے مزید معانی تو دریافت نہیں کئے جاسکتے مگر اس کا اطلاق زندگی کے کئی شعبوں پر کیا جاسکتا ہے۔ بہت سے پرندے تو غلیل سے بھی شکار کئے جاسکتے ہیں، کچھ کیلئے تیر کمان کافی ہوتے ہیں اور کچھ پرندے بندوق کے نشانے پر بھی نہیں آتے۔

بیسویں صدی کے آغاز ہی میں سائنس اس قدر پیچیدہ ہوگئی تھی کہ اسے صحیح معنوں میں جاننے والے ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے۔ اس کے بعد یہ بھی کھلا کہ یہ جاننے والے بھی آدھی سچائی سے آشنا تھے کیونکہ بقول ہائزن برگ سچائی جانی ہی نہیں جاسکتی:

تو نے جانا مجھے تو کیا جانا تجھ سے اچھا نہ جاننے والا

اب بقول ڈاکٹر عبدالسلام سائنس اس قدر پیچیدہ ہو چکی ہے کہ بغیر ریاضی پر دسترس حاصل کئے سائنس میں کارہائے نمایاں انجام نہیں دیے جاسکتے۔ امریکی ایٹم بم بنانے والا جرمن سائنس دان Oppen Hiemer جب بلیک ہول دریافت کرتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ کوئی خاص دریافت نہیں، کوئی بھی پوسٹ ڈاکٹریٹ کا طالبعلم یہ خدمت سرانجام دے سکتا تھا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ آئن سٹائن کی طرح E=MC2 جیسا کوئی فارمولا دریافت کیا جائے۔ یہ فارمولا بنانے والے سائنس دان آئن سٹائن کا یہ حال تھا کہ وہ کہتا تھا کہ بلیک ہول کا وجود ہی نہیں، جب اسے یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ یہ تصور اس کے نظریات سے ابھرتا ہے تو اس نے بڑی مایوسی کے عالم میں کہا ''ہاں یہ ہوسکتا ہے'' مگر اس نے بلیک ہول کے طبعی وجود کو کبھی تسلیم نہ کیا۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد کوئی سیدھی سادھی اور سامنے کی چیز نہیں رہ گئی۔ جو کچھ ہمارے تجربے میں آتا ہے وہ واہموں کا ایک سلسلہ ہے۔ اگر ایٹم ہر وقت حرکت میں رہتے ہیں تو ٹھوس پن پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ اس لئے ہم جن چیزوں کو ٹھوس خیال کرتے ہیں، وہ اصل میں توانائی کی ایک ٹھہری ہوئی صورت ہیں یا کم از کم ہمیں ٹھہری ہوئی نظر آتی ہیں۔ اقبال نے اس استدلال کو اپنے خطبات میں فلسفے اور مذہب کے بعض معتقدات کو سچ ثابت کرنے کے لئے استعمال کیا۔

اقبال کے زمانے تک جو سائنس ہم تک پہنچی، وہ نادرست تو نہیں کہی جاسکتی، مگر اسے غیر متعلق ضرور قرار دیا جاسکتا ہے۔ اقبال نے ایڈنگٹن کے حوالے سے ہائزن برگ کے نظریے کو لاتعین (Indeterminacy) کہا مگر یہ خبر ابھی تک نہیں پہنچی تھی کہ وہ لاتعین (Uncertainty) بھی ہے۔ جو کچھ اقبال نے سائنس سے سیکھا اس کی ایک جھلک مسجد قرطبہ میں موجود ہے، مگر آئن سٹائن کی طرح اقبال بھی ان مضمرات کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں تھے، جو ان کے بنیادی فلسفے سے مطابقت نہیں رکھتے تھے، لہٰذا وہ بھی آئن سٹائن کی طرح ان تصورات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوئے، جو خود اس فلسفے کو مزید گہری بنیاد فراہم کر سکتے تھے۔ اس مفہوم کو واضح کرنے کے لئے خاصی طویل گفتگو کی ضرورت ہے مگر میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا، صرف اس قدر عرض کروں گا کہ آئن سٹائن کو سمجھنا اس لئے مشکل نہیں ہے کہ اس کے اندر کوئی ایسا بھید ہے، جو انتہائی الجھا ہوا، ریاضی کی سطح پر بقول کارل سیگان (Carl Sagan) ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ آئن سٹائن کو سمجھنے کے لئے جتنی ریاضی کی ضرورت ہے وہ میٹرک کے ہر طالب علم کو آتی ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ وہ جن تصورات کا ذکر کرتا ہے وہ ہماری عام زندگی میں ہم پر کبھی نہیں گزرتے۔ یہی مسئلہ کوانٹم طبیعات کا بھی ہے کہ وہ جہانِ کبیر (Macrocosm) اور جہان صغیر (Microcosm) کے جن پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے، اس کا بھی کوئی واسطہ ہماری عملی زندگی سے نہیں ہے۔

لہٰذا سائنس دو طرح کی ہے۔ ایک تو وہ جسے ہم عام زندگی سے مطابقت رکھنے کے باعث قبول کرتے ہیں اور دوسری وہ جو ہمارے روزمرہ کے تجربات سے مختلف ہونے کے باعث ہمارے لئے بالکل اجنبی ہوگئی ہے۔ موجودہ زمانے میں، جو Space کا زمانہ ہے، کہا جا سکتا ہے کہ اس بات کا امکان پیدا ہوا ہے کہ ہم مکان یعنی Space کے اندر دور تک داخل ہوسکیں، اس معاملے میں ادب اور شاعری پیش رو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نے کچھ نظمیں Space کے حوالے سے لکھی تھیں، کتاب کا نام ''اترے مری خاک پر ستارہ'' تھا۔ اس کے آخر میں، میں نے ایک حکایت بیان کی تھی، اب اسے دہرا دیتا ہوں:

''جب خلاء باز ایک دور دراز کہکشاں کے کسی آباد سیارے پر پہنچے، تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں نوع انسانی (Homosapien) پہلے سے موجود ہے، چنانچہ انہوں نے ان سے سوال کیا کہ تم اس سیارے پر کس ذریعے سے پہنچے۔''

جواب ملا: ''شاعری کے ذریعے۔''

اس بات کو شاید سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا کے بہت سے علوم شاعری کے ذریعے دریافت ہوئے۔ اس کی وجہ بہت سادہ سی تھی۔ فلسفہ، مذہب، سائنس اور دوسرے علوم اپنی حدود رکھتے تھے، جن سے باہر نکلنا ان کے بس میں نہیں تھا مگر شاعری ایک ایسا ضدی بچہ ہے جو کسی حد کو قبول نہیں کرتا اور وہ ہمہ وقت ساتواں در کھولنے پر اصرار کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا اس نے کئی در وا کئے، پھر امکانی سطح پر ان کے فلسفے اور علوم بنائے گئے۔ اگر شاعری نہ ہوتی تو علوم بھی آغاز نہیں ہو سکتے تھے۔

تخلیقی واردات کی حد تک سائنس اور شاعری میں کوئی فرق نہیں، شاعری اب فلسفے سے دور ہوتی جا رہی ہے مگر سائنس سے قربت بڑھ رہی ہے، یہ شاید شاعری کی خصلت میں ہے کہ وہ نامعلوم کو ہمہ وقت تلاش کرتی رہتی ہے۔ اب تو طبیعات کا بھی یہی حال ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اس کے بعض بڑے بڑے تصورات تجربہ گاہوں میں ثابت نہیں کئے جا سکتے۔ ان میں بلیک ہول، Big Bang اور ارتقاء Evolution سبھی کچھ شامل ہے، اس لئے یہ سمجھنا درست نہیں ہوگا کہ سائنس کی کوئی یقینی بنیاد موجود نہیں۔ جدید سائنس کے اعلیٰ تر اور آفاقی شعبے اس طرح کی بنیاد رکھتے ہی نہیں کہ انہیں یقنی علم کہا جا سکے۔

انہی مسائل میں سے ایک مسئلہ Time یعنی زمان کا بھی ہے۔ میں اس جاودانی سوال کو اس لئے اٹھا رہا ہوں کہ Space سے تعلق پیدا کرنے کے بعد یہ پھر سے بے حد اہم سوال کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

پال ڈیویز (Paul Davies) کا خیال ہے، زمان کا تصور بھی اس قدر پرانا ہے جس قدر خود انسانی فکر، مگر پرانے زمانے کے لوگ زمان یعنی Time کے بارے میں کسی تشویش یا پریشانی کا شکار نہیں تھے، نہ ہی اس سلسلے میں انہیں کسی طرح کا کوئی الجھاؤ تھا۔ یونانی فلسفہ دوام (Eternity) اور موجود وقت کے مباحث سے بھرا پڑا ہے۔ تاہم دنیا بھر کے مذاہب میں زبان کا مسئلہ مرکزی اہمیت کا حامل ہے اور صدیوں تک ان تصورات پر بحث ہوتی رہی ہے۔ سائنس کے اندر وقت ایک پیمائشی مقدار کے طور پر داخل ہوا اور ایسا کرنے والے گلیلیو (Galileo) اور نیوٹن تھے مگر اپنے طور پر ان کی اہمیت ہمارے ہی دور میں واضح ہوئی، سٹیفن ہاکنگ (Stephen Hawking) نے A Brief History of Time لکھ کر کائنات کی پوری تاریخ ایک دھاگے میں پرونے کی کوشش کی تھی۔ یہ کتاب فروختگی میں بھی اپنا خاص ریکارڈ رکھتی ہے۔ اگرچہ بہت کم لوگ اس کو سمجھتے ہیں مگر خریدتے سبھی ہیں، ہمارے ہاں تو یہ رواج بھی نہیں ہے۔

بیسویں صدی کا ایک عظیم واقعہ آئن سٹائن کا تصور زمان تھا، جس نے دنیا بھر کے تصورات زمان کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اگرچہ اس تصور کے بارے میں بھی بہت سے شبہات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ مگر تا حال اس کی جگہ لینے والا کوئی تصور موجود نہیں، خود آئن سٹائن بھی اس امر سے آگاہ تھا اور اس امر پر حیرت کا اظہار بھی کیا کرتا تھا کہ یہ

خیال اس سے پہلے کسی کو کیوں نہیں سوجھا، کیونکہ اس کے نزدیک یہ سامنے کی بات تھی۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ مکان یعنی Space کے تین ابعاد (Dimensions) ہیں، یعنی لمبائی، چوڑائی اور گہرائی یا موٹائی، آئن سٹائن نے ان میں ایک اور جہت یا بُعد کا اضافہ کر دیا تھا اور بُعد خود زمان تھا۔ مختصر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابعاد اصل میں ایک ہی اکائی ہیں۔ آئن سٹائن کے بارے میں یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ وہ اشیاء میں وحدانیت (Monotheism) تلاش کرتا تھا۔ ایٹم کے اندر جو قوتیں ہیں ان کے بارے میں اس کا یہی خیال ہے کہ یہ سبھی قوتیں اصل میں ایک ہی قوت کے مختلف مظاہر ہیں۔ ڈاکٹر عبدالسلام کو نوبل انعام اسی حوالے سے ملا تھا۔ خیر یہ ایک الگ بحث ہے۔

فی الحال ہم آئن سٹائن کا نظریہ مکان و زماں پر بات کر رہے ہیں۔ عام طور پر ہم زمان و مکاں کی بات کرتے چلے آئے ہیں مگر نظریاتی طبیعات کو اس بات پر اصرار ہے کہ مکان کا لفظ پہلے آئے یعنی ہمیں مکان و زمان کہنا چاہیے۔ رہا یہ سوال کہ مکان اور زمان ایک دوسرے سے کس طرح متعلق ہیں تو جدید طبیعات کہے گی کہ زمانِ مطلق (Absolute Time) جیسی کوئی شے موجود نہیں۔ کیونکہ زمان، مکان کے ساتھ متعلق ہے، لہٰذا اسے مکان ہی کے حوالے سے پہچانا جائے گا، اگر سیارہ بڑا ہوگا تو زمان سست رو ہو جائے گا اور اگر سیارہ چھوٹا ہوگا تو زمان تیز رو ہو جائے گا۔ انسان کے حوالے سے اسے سمجھنے کے لئے جو مثال دی جاتی ہے وہ بھی خاصی دلچسپ ہے، انسان کی لمبائی، چوڑائی اور موٹائی میں تو کوئی کلام نہیں مگر مذکورہ انسان جیسی زندگی گزار چکا ہے یا گزارنے والا ہے، وہ اس کی چوتھی جہت یا بُعد ہے۔

آئن سٹائن کو اپنا نظریہ متعارف کرائے ایک صدی گزر چکی ہے، مگر وہ ابھی تک کوئی عام فہم نظریہ نہیں ہے۔ ہمارے ادب اور شاعری میں اس کی مثالیں تو موجود ہیں مگر قاری ان تک مشکل ہی سے رسائی حاصل کرتا ہے۔ یہاں یہ کہنا شاید ضروری ہو کہ برگساں کی طرح اقبال نے بھی آئن سٹائن کی ایک توجیہہ کو قبول نہیں کیا تھا مگر حیرت انگیز طور پر وہ ان کے مضمرات سے آگاہ تھے۔ اقبال سے اب تک صورت حال بے حد تبدیل ہو چکی ہے اور زمانِ مطلق کے ماننے والے اب چند ایک ہی رہ گئے ہیں۔

اب چونکہ Space کے ساتھ ہمارا تعلق گہرا ہوتا چلا جا رہا ہے لہٰذا یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہم مکان کے ساتھ اپنے تعلق کو سمجھیں اور شاعری کرتے وقت مستقبل کا حوالہ ہمیشہ ہمارے مدِ نظر رہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ روایت سے انکار کیا جائے کیونکہ روایت کے بغیر شاعری ممکن ہی نہیں ہے لیکن روایت کی جدید تر توجیہہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ شاعر اپنے فردا کو بھی نگاہ میں رکھے۔ بالکل اسی طرح جیسے مذہبی لوگ عاقبت کی فکر کرتے رہتے ہیں اور ان کی زندگی کا ہر ہر لمحہ عاقبت کو سنوارنے کی سعی میں گزرتا ہے۔

یہ بات ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ ہم تا دیر کرۂ ارض پر قیام نہیں کر سکتے، صرف انسان کی مہم جوئی ہی اس کی وجہ نہیں ہے بلکہ کائنات کو جاننا اور اس کے ساتھ ہمہ وقت تعلق میں رہنا شاید روایت پسندی سے زیادہ

اہمیت اختیار کرنے والا ہے۔مگر اس رستے میں تا حال رکاوٹیں بھی بہت ہیں، جن کو دور کئے بغیر Space کے ساتھ رشتہ بنایا ہی نہیں جا سکتا، کچھ رکاوٹیں تو علمی اور تکنیکی ہیں مثلاً یہ کہ کہکشاں کے اندر کشش موجود ہے مگر کہکشاؤں کے مابین گریز(Repulsion) موجود ہے، وہ ہمہ وقت ایک دوسرے سے دور ہو رہی ہیں۔ Space Ship انتہائی سست رفتار سے چل رہی ہے کیونکہ طے کرنے والا فاصلہ لامتناہی طور پر زیادہ ہے۔دوسری طرف یہ بھی ہے کہ روشنی کی رفتار پر سفر ممکن نہیں ہے، ایسی صورت میں سفر کرنے والی ہر شے توانائی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

مگر انسانی ذہن، خدا اسے ہمیشہ زندہ اور تابندہ رکھے، ایسے متخیلہ کا حامل ہے جو کسی اصول کا پابند نہیں ہے لہٰذا اپنے لئے خود راستے بناتا ہے۔تاہم آئن سٹائن کے بعد سے وقت، مکان کی چوتھی جہت بن کر رہ گیا ہے بلکہ اس نے تو یہ بھی ثابت کیا کہ روشنی کمیت (Mass) رکھتی ہے اور جب وہ کسی بڑے ستارے کے پاس سے گزرتی ہے تو اس کے تجاذب (Gravity) کی وجہ سے خم کھا جاتی ہے۔لہذا جب ہم رات کو آسمان پر ستارے دیکھتے ہیں، وہ وہاں موجود نہیں ہوتے، جہاں وہ ہمیں نظر آتے ہیں۔اگرچہ روشنی کی رفتار تیں کلومیٹر فی سیکنڈ سے زیادہ ہے تاہم کچھ کہکشائیں ایسی بھی ہیں جن کی روشنی ہم تک اڑھائی لاکھ ارب سالوں کے بعد پہنچتی ہے۔اگر وہ کہکشائیں ختم بھی ہو چکی ہیں تو یہ ممکن ہے وہ ہمیں لاکھوں برس آسمان پر موجود نظر آتی رہیں۔ان کے فاصلے کا اندازہ ہم اس بات سے لگائیں کہ سورج کی روشنی ہم تک پہنچنے میں آٹھ منٹ لگاتی ہے اگر خدانخواستہ سورج اچانک بجھ جائے تو آٹھ منٹ تک ہمیں معلوم نہیں ہوگا کہ وہ موجود نہیں لہذا سارا آسمان ایک واہمہ ہے اور شاعری واہموں کی دلدادہ۔

دوسری شے جو شاعری کو بے حد مرغوب ہے متناقضہ (Paradox) بنانا ہے۔ایسی شے جو بیک وقت ہو بھی اور نہیں بھی ہو، وہ جمع بھی ہو منفی بھی، سیاہ بھی ہو اور سفید بھی۔سائنس کی زبان میں ہم ایٹم کا مشاہدہ کسی تجربہ گاہ میں کر رہے ہوں تو اگر ہم اسے Particle کے طور پر دیکھنا چاہیں گے تو Particle لگے گا اور اگر موج Wave کی طرح دیکھنا پسند کریں گے تو وہ ہمیں موج ہی لگے گا:

یہ توہّم کا کارخانہ ہے یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

باتیں کرنے والی تو بہت ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ مجھے آپ کا زیادہ وقت نہیں لینا۔ یہ مشکل مجھے مشاعرے میں بھی پیش آتی ہے۔غزل میں لکھتا تو اکثر طویل ہوں مگر مشاعرے میں چند شعروں پر اکتفا کرتا ہوں۔ایک تو میرے مضامین کئی بار قدرے اجنبی ہوتے ہیں اور دوسرے شاعری علم بیان کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنا ردِ عمل بیان کرنے کے لئے کی جاتی ہے۔

فی الحال میں اپنے ہم عصر شاعروں سے جو ہر چند عمر میں مجھ سے چھوٹے بھی ہو سکتے ہیں، یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اپنی شاعری کو صرف معلوم تک محدود نہ رکھیں کچھ نہ کچھ سفر غیر معلوم کی طرف بھی کرنا چاہیے۔اسی سے انسان کی متخیلہ میں جلا آتی ہے، کہے ہوئے اشعار تھوڑے بہت ردِ عمل کے ساتھ کہتے چلے جانا آخر کب تک؟ اس

وقت دنیا میں نئے موضوعات اس قدر زیادہ ہیں کہ ذرا سی جستجو سے آپ کو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ آپ حیران ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے مگر یہی حیرانی تو شاعری اور شاید یہی زندگی بھی ہے:

یہ حقیقت ہے کہ میں زندہ اسی کے دم سے ہوں سانس بھی لینے نہیں دیتی جو حیرانی مجھے

مجھے ماضی کی عظمت سے انکار نہیں مگر فی زمانہ ہمارے لئے منفی اور مثبت دونوں سطحوں پر فردا کی اہمیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ میں War of the World کی بات نہیں کر رہا اگرچہ وہ بھی ممکن ہے۔اگرچہ کوئی ثبوت ابھی تک فراہم نہیں ہوا مگر ہمارا دل گواہی دیتا ہے کہ ہم اس عظیم اور ہر طرف سے ایک ہی طرح نظر آنے والی کائنات کی واحد زندگی نہیں ہیں۔سائنس فکشن تو ایسی کئی آبادیاں ذہنی سطح پر تخلیق کر چکی ہے۔

مگر ہمیں سب سے زیادہ خطرہ خود انسان سے ہے اگر انسان کسی اور سیارے پر زندگی تلاش کرے اور وہاں آباد ہو جائے تو کیا وہ ہماری زمین کو نو آبادی بنانے کی کوشش تو نہیں کرے گا! زمین کے جو حصے بعد میں دریافت کئے گئے ہیں ان میں سے کئی حصوں کو تو انسان نے آبادی بنا رکھا ہے لیکن جمہوریت کے نعروں کے باوجود کوئی ہمیں بنیادی حق دینے کو تیار نہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ Space کی فتوحات کے بعد بھی ایسا ہی ہوگا۔ترقی یافتہ اقوام وہاں اپنی آبادیاں قائم کر لیں گی اور ہمیں اپنی بقا کی جنگ نئے انداز سے لڑنی پڑے گی۔ یہ مت سمجھئے گا کہ ایسا ہونا ابھی بہت دور کی بات ہے۔ممکن ہے اس میں چند صدیاں لگ جائیں مگر یہ واقعہ جلد بھی وقوع پذیر ہو سکتا ہے۔جو کچھ بھی ہو اب انسان کی سرگرمیاں مختلف قسم کے توسل تلاش کرنے تک محدود نہیں رہ سکتیں۔

ایک مشکل یہ بھی ہے کہ شہر کی روشنیوں نے آسمان کی عظمت چھین لی ہے۔اب ہم کبھی کبھار ہی آسمان دیکھتے ہیں۔ ہمارا طبیعی علم صرف چاند اور سورج تک محدود ہے حالانکہ خود ہماری کہکشاں جو اربوں کہکشاؤں میں سے ایک ہے اس میں بھی ہماری حیثیت نہ ہونے کے برابر ہے۔اربوں ستاروں اور سیاروں میں ہمارا نظام شمسی ایک کونے میں ذرا سی جگہ پر پڑا ہے۔ یہ ممکن ہے اگر کسی اور کہکشاں سے کوئی مخلوق آئے تو وہ اتنی دور تک ہماری کہکشاں کے اندر آنے کی کوشش ہی نہ کرے۔سر فریڈ ہائل(Sir Fred Hoyle) جو Big Bang کو تسلیم نہیں کرتے اور کائنات کو ابدی مانتے ہیں کہتے ہیں کہ اکثر وبائی بیماریاں خلا سے ہم پر وارد ہوتی ہیں لہذا خلا ایک خطرہ بھی ہے جس سے نمٹنا ضروری ہے۔

شاعری کی حد تک میں صرف یہ کہوں گا کہ ہمارے شعور نے درجہ بدرجہ ترقی کی ہے۔کبھی وہ صرف چیزوں سے آگاہ تھا پھر وہ شعور بنا اور چیزوں سے ہمارے رشتے قائم ہوئے۔ پھر خود شعوری آئی اور ہم نے اپنے آپ کو پہچاننے کی سعی کا آغاز کیا۔اب ہمیں ایک ایسے دماغ کی ضرورت ہے جو Space کی جانچ ٹھیک کر سکتا ہو۔اس کے لئے ہم نے کمپیوٹر تو کیا سوپر کمپیوٹر بھی ایجاد کر لئے ہیں مگر خود دماغ کے اندر بعض تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔مگر آپ جانتے ہیں کہ ارتقا نہایت سست رفتار معاملہ ہے اور ہم اتنی جلدی میں نہیں کہ لاکھوں سال انتظار نہیں

کر سکتے۔اس امر کا آغاز ہو چکا،انسان کی ذہانت کو بڑھانے کے لئے اس کے دماغ میں چپس (Chips) یا اس طرح کی کوئی اور چیز یا چیزیں لگائی جائیں تا کہ وہ کائنات کے سب سے بڑے ریاضی دان کے اس معمے کو سمجھنے کا آغاز کر سکے۔خوش قسمتی سے خدا ہمیں تسخیرِ کائنات کی دعوت خود دیتا ہے،قرآن کا آٹھواں حصہ غور وخوض کرنے پر ہے۔اتنا زور تو نماز قائم کرنے اور زکوۃ دینے پر بھی نہیں دیا گیا۔

لہٰذا انسان کو یہ خوش خبری پہنچے کہ کائنات پھر اس کی تسخیر کی منتظر ہے۔اس کا آغاز پہلے بھی شاعروں نے کیا تھا۔اب بھی یہ میدان شاعروں کے لئے کھلا ہے اور ایک آسانی یہ بھی ہے کہ اب وہ سائنس اور کمپیوٹر سے لیس ہیں اور کائنات کو جاننے کی بہتر صلاحیت رکھتے ہیں۔

آیئے ماضی کے ساتھ ساتھ مستقبل کی طرف بھی دیکھنا شروع کریں۔اگر ہم اس راہ پر چل ہی نکلے ہیں تو رفتار کو کچھ اور بہتر کرنا ہو گا مگر یہ یاد رکھیں کہ اس طرح کی تحریک اور امنگ ہمیں اپنے ماضی ہی سے ملے گی۔

خواتین و حضرات !

میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے میری معروضات کو سنا مگر یہ ضروری نہیں کہ آپ انہیں حرف بہ حرف سچ تسلیم کریں۔آپ جو اختلاف بھی کرنا چاہیں،وہ میرے لئے سعادت کا باعث ہو گا۔بہر صورت میں نے ایک سوال آپ کے سامنے رکھ دیا ہے جو نیا بھی کہا جا سکتا ہے اور پرانا بھی۔ **شکریہ !**

مجھے مذہب اور سائنس کے اس پہلو سے دلچسپی ہے جہاں سائنس آزادانہ طور پر کائنات اور اس کے بھیدوں کی نقاب کشائی کا کوئی مرحلہ سر کرتی ہے اور **لا الٰہ** ..کا منظر دکھاتی ہے اور وہیں کہیں آس پاس سے مذہب کی بخشی ہوئی کوئی روحانی کیفیت یا کوئی مابعد الطبیعاتی لہر مجھے اس نفی میں سے اثبات کا جلوہ دکھاتی ہے اور **الا اللہ** کی صدائیں آنے لگتی ہیں۔اور یہ سارا سائنسی اور مابعد الطبیعاتی آہنگ میری ادبی جمالیات میں میری ادبی استطاعت کے مطابق اپنے رنگ دکھانے لگتا ہے۔کمپیوٹر کے چپ کی کارکردگی منکر نکیر اور یومِ حساب پر ایمان پختہ کرتی ہے تو کلوننگ کا تجربہ حیات بعد الموت کا سائنسی ثبوت دے کر اس عقیدہ پر مجھے مزید راسخ کرتا ہے۔خلا کو نکال دینے سے ساری کائنات کا مادہ سوئی کی نوک پر سما جانے،اور پھر کسی اینٹی میٹر کے اس سے ٹکرانے کے نتیجہ میں اس کے بھی غائب ہو جانے کا سائنسی دعویٰ مجھے اس قیامت پر پکا یقین دلاتا ہے جس میں ساری کائنات فنا ہو جائے گی اور صرف خدا کی ہستی باقی رہے گی۔میرا شروع سے یہی خیال رہا ہے کہ سائنس خدا کی نفی کرتے ہوئے اسی کی طرف جا رہی ہے،مذہب روحانی طور پر اسی کی طرف سفر کراتا ہے اور ادب بھی جمالیاتی سطح پر اسی حقیقتِ عظمیٰ کی طرف سفر کرتا ہے۔اور بس۔۔۔(حیدر قریشی کی یادوں کا ایک باب **رہے نام اللہ کا** سے اقتباس مطبوعہ **جدید ادب** شمارہ جنوری تا جون ۲۰۰۷ء)

ڈاکٹر ستیہ پال آنند (کینڈا)

عینی آپا، کچھ یادیں، کچھ باتیں

''چار پانچ برس بڑا ہونا تو کچھ بھی نہیں...'' عینی آپا نے کہا تھا، ''...اور پھر جب ہماری عمر ستر سے بڑھنے لگتی ہے، تو چار پانچ تو کیا،دس بارہ برس بھی کسی گنتی میں نہیں آتے۔اور پھر وہ محاورہ بھی تو ہے،عمر بہ عقل است نہ بہ سال!'' پھر فوراً ہی تصحیح کر دی،''عقل نہیں،'بزرگی' ہے یہاں،لیکن دونوں کا مطلب تو ایک ہی ہے نا؟''

میں نے کہیں غلطی سے یا جلدی میں یہ کہہ دیا تھا کہ میں ان سے چار پانچ برس چھوٹا ہوں۔

لیکن عینی آپا بخشنے والی نہیں تھیں۔''اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ تم مجھ سے زیادہ عقلمند ہو!'' اور پھر اسی سانس میں بولتی چلی گئیں۔''اب خوشونت مجھ سے کافی سینئر ہے،لیکن میں نے کبھی اسے 'تو' کہہ کر مخاطب نہیں کیا۔'' پھر جیسے ایک خیال کی پیٹھ پر دوسرے کو لادتے ہوئے بولیں''لیکن خوشونت سے بات ہمیشہ انگریزی میں ہوتی ہے،اور انگریزی میں You is you, whether for one, or for two, or for all present. '' ایک لحظہ توقف کیا،پھر مزید ایک پھلجھڑی میری طرف پھینکی،''یہ نہ سمجھنا کی صرف تم ہی انگلش کے پروفیسر ہو اور Ph. D. ہو، اور اس کی grammar سے واقف ہو!''

بزرگی اور عقل اور عمر والے محاورے کے سلسلے مجھے پھر بھی خوف رہا کہ اگر تصحیح در تصحیح کر دوں،تو برا نہ مان جائیں۔برا تو خیر نہیں مانتی تھیں،لیکن موڈ بدل لیتی تھیں۔

فون کی گھنٹی بجی۔دوسری طرف صغرا مہدی تھیں۔چونگے پر ہاتھ رکھ کر بولیں،''اب لمبی بات چیت ہو گی۔تم اپنے لیے ایک کپ چائے اور بنا لو۔میرے لیے مت بنانا....''

(سین۔نوئڈا،ان کا اپارٹمینٹ۔۱۹۹۱ء)

....

بہت بڑا جمگھٹا تھا۔کم از کم ایک سو سے کچھ اوپر لوگ تھے۔واشنگٹن،ڈی سی (امریکا) کے میری لینڈ کے نواحی بلدیاتی علاقے میں ڈاکٹر عطیہ کا گھر ایسا گھر نہیں تھا،جسے صرف گھر کہا جائے۔

یہ ایک بنگلہ نما محل تھا۔بڑے کمرے میں،عین سامنے دیوار پر کوئی تین فٹ کے سائز میں ایک تصویر تھی،جس میں

فیض احمد فیضؔ اور احمد فرازؔ 'یک جان دو قالب' والے محاورے کی زندہ مثال بنے بیٹھے ہوئے تھے، ڈاکٹر عطیہ کے نفیس ذوق اور شاعر نوازی کی ایک مثال، لیکن مجھ جیسے بت شکن محمود غزنوی کے لیے کوئی بھی سومنات ہو، میرا تیشہ ہمیشہ میرے ہاتھ میں رہتا تھا۔ اس لیے جونہی ذرا سی مہلت ملی، سامنے کے صوفے پر بیٹھی ہوئی عینی آپا سے میں نے کہا، ''وہ تصویر دیکھی ہے آپ نے؟'' مسکرائیں زیر لب، ایک خمیدہ تبسم۔ بولیں، ''تم کہیں بخشو گے بھی ان دونوں کو؟'' میں نے کہا، ''نہیں آپا، مجھے تو ساقی فاروقی کی ایک بات یاد آ گئی۔ اس نے دونوں کو لندن کے اپنے ہی گھر میں اکٹھے بیٹھے دیکھ کر کہا تھا، 'اب تم دونوں جڑواں تو لگتے نہیں، لیکن یہ فرازؔ تم سے اتنا کم عمر ہوتا ہوا بھی تمہارا نقّال، جسے تم پنجابی 'نقلچی' کہتے ہو، اس حد تک ہے کہ اگر تم اپنی کسی نظم یا غزل میں ایک بار 'جاناں' لکھو گے، تو یہ تمہارے تتبع میں، لیکن تم سے بازی مارلے جانے کے لیے، دو بار 'جاناں جاناں' لکھے گا۔''

''تم تو وہاں موجود نہیں تھے، کہاں سے سنی تم نے یہ بات؟'' عینی میں موقع واردات پر موجود نامہ نگار کی روح حلول کر آئی۔

''آپا، خفا مت ہوں مجھ سے۔ ساقی نے ہی مجھے بتائی تھی!'' اور اس سے پیشتر کہ وہ کچھ اور کہہ سکیں، میں نے ایک لقمہ اور دیا تھا۔ ''ساقی نے فیض کو یہ بھی کہا تھا، کہ اس کے سگریٹ کی راکھ جھاڑنے کا انداز بھی تمہاری نقل ہے۔ اس طرح یہ فیضؔ تو بننے سے رہا، فرازؔ بننے کا نصب العین بھی کھو بیٹھے گا۔''

''بخش دو ان دونوں کو اب!'' آپا نے حکم دیا، ''کوئی اور بات کرو...، لیکن غزل کی مخالفت کی بات نہیں..''

پاس بیٹھے ہوئے کئی احباب (صغرا مہدی بھی اتفاقاً موجود تھیں) مسکرائے تھے، کیونکہ اب جھینپنے کی میری باری تھی۔ **(سین ۔ میری لینڈ، امریکا۔ ڈاکٹر عطیہ کا دولت کدہ، ۱۹۸۹ء)**

....

نومبر ۱۹۶۷ء۔ بمبئی۔ عینی آپا سے پہلی ملاقات ان کے رسالے Imprint کے دفتر میں ہوئی۔ میں ساحر لدھیانوی کے گھر سے (جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا) تین بسیں بدل بدل کر بمشکل تمام پہنچا۔ مجھے عینی آپا سے ''ٹربیون'' چنڈی گڑھ کے لیے، ان کے ناول ''آخر شب کے ہم سفر'' پر ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ ملنے پر، انٹرویو لینا تھا، اور اس کے لیے انہوں نے مجھے ورکنگ لنچ پر ہی اپنے دفتر میں دعوت دی تھی۔

مجھے پہلی نظر میں وہ بے حد حسین اور sexy لگیں۔ (تب تک انہیں آپا کہنے کا رواج ابھی ''روش عام'' نہیں ہوا تھا!) کشادہ پیشانی لیکن آنکھوں تک پہنچتے پہنچتے ذرا سی خمیدہ، تلوار کی سی کاٹ رکھتی ہوئی تیز زبان، body language میں آنکھوں، بھوؤں اور پیشانی کے اتار چڑھاؤ، لبوں کی سکڑن یا پھیلاؤ، ہاتھوں کی مضطرب

حرکت،۔۔۔ مجھے وہ بہت اچھی لگیں۔

''آپ ملک راج آنندؔ کے کچھ لگتے ہیں؟'' صحیح جملہ تو یاد نہیں ہے، لیکن کچھ ایسا ہی سوال کیا تھا انہوں نے۔ میں نے فی الفور عرض کیا تھا، جی نہیں، لیکن میں انہیں مُلک چچا کہہ کر بلاتا ہوں۔ ویسے بھی ہماری پنجاب یونیورسٹی کے کیمپس پر ٹیگور پروفیسر آف آرٹس کے طور پر ان کی تقرری اور ان کے ساتھ ہر روز صبح سیر پر جانے والے مجھ جیسے نوجوان انہیں چچا مُلک ہی بلاتے ہیں۔ پھر ان کے استفسار پر کہ مجھے ان سے کیا پوچھنا ہے، میں نے درجنوں سوال کیے، لیکن بقول ان کے، ہر سوال گھوم پھر کر ایک ہی زمرے میں آ جاتا تھا، کہ ورجنیا ولف اور جیمز جوائس کے طرز تحریر میں لکھے ہوئے ان کے ناول کیا اردو ادب پر ایک مغربی پیوند کاری نہیں ہے؟ اور ان کا جواب ہر بار ایسے ہی کانٹوں سے بھرا ہوا تھا جیسے کہ وہ مجھے یہ سمجھانے کا جتن کر رہی ہیں، کہ اے انگریزی کے پروفیسر، خدا کے لیے یہ بات سمجھ، کہ اسلوب ایک طرف، اور موضوع، مضمون اور متن دوسری طرف، کیا ایک ناولسٹ کو ان دو چیزوں کو الگ الگ نہ رکھ کر صرف یہ یقینی نہیں بنا سکتا کہ اس کا طرز تحریر ایسا ہو کہ اسے ایک کے لیے دوسرے کی قربانی نہ دینی پڑے۔ لیکن اردو کا قاری تو کیا، ایک دو کو چھوڑ کر اردو کا نقاد بھی اس سے آگاہ نہیں ہے۔

''آگ کا دریا'' کو عینی آپا کا Magnum Opus کیوں سمجھا جاتا ہے، اس کا علم مجھے اس انٹرویو کے وقت ہی ہوا۔ عینی نے کئی سوالوں کا جواب جھلا کر مجھے دیا لیکن بات میری سمجھ میں آ گئی۔ ''آگ کا دریا'' زمانوں، بلکہ قرنوں پر محیط ہے۔ یہ تاریخ اور وقت کو برصغیر کے جغرافیہ سے منسلک کرتا ہوا ایک ایسا Fictional Testament ہے، جو چوتھی صدی عیسویں سے شروع ہوتا ہے، اور آزادی کے بعد، یعنی ہندوستان اور پاکستان کے دو الگ الگ ملکوں کے طور پر دنیا کے نقشے پر ابھرنے کے وقت تک آگے بڑھتا ہے۔ زمان اور مکان کے اس پھیلاؤ کو سمیٹنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ناولسٹ صدیوں پر محیط اس سفر کے راستوں پر آزادی کے ساتھ گھوم پھر سکے، آس پاس کی پگڈنڈیوں پر گامزن ہو، پیچھے مڑ کر دیکھے اور پھر اپنی کہانی کو سمیٹتا ہوا آگے بڑھ جائے۔ مجھے آج تک عینی کا ایک جملہ نہیں بھولتا۔ ''کیا آپ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے؟ کچھ لوگ آج بھی ہندوستان کی تاریخ کو میر قاسم کے سندھ پر حملے سے شروع کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس سے پہلے کی تاریخ اور عرب کے دور جاہلیت کی تاریخ میں کوئی فرق نہیں ہے۔'' ان کا جملہ انگریزی میں تھا، لیکن جب میں نے کہا کہ تاریخ ایک تسلسل ہے، تو انہوں نے پھر کہا، Yes, it is a continuum and the sooner we know this truth, the better it would be for all of us, and damn it, my novel encompasses four thousand years.

آج جب میں باز آفرینی کے طور پر اس انٹرویو کو یاد کرتا ہوں، تو مجھے عینی آپا کی بات یاد آتی ہے۔ میرے انگریزی کے پروفیسر ہونے کی وجہ سے یا میری ذہنی تربیت کو صیقل کرنے کے لیے انہوں نے ایک انگریزی نقاد کا جملہ دہرایا تھا۔ اس نقاد نے ورجنیا ولف اور جیمز جوائس کی شعوری رو کے بارے میں اور وقت کی رفتار کے نامنقسم ریلے کے

آگے بڑھنے یا پیچھے ہٹنے کے بارے میں کہا تھا۔

You can stand still in Time and move back and forth in Space, or stand still in Space and move back and forth in Time.

بعینہ یہی فارمولہ عینی آپا کے ناولوں پر منطبق ہوتا ہے۔ ''ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ'' نے اس کتاب کے انگریزی ترجمے River of Fire پر تبصرے میں ایک نا قابل فراموش جملہ لکھا تھا، جسے میں یہاں درج کر رہا ہوں۔ "River of Fire" is to Urdu fiction what "A Hundred Years of Solitude " is to Hispanic literature. یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ عالمی سطح پر عینی آپا کی وہی حیثیت ہے جو Milan Kundera کی یا Gabriel Garcia Marquz کی ہے۔ سلمان رشدی وغیرہ 'چھٹ بھیئے' عینی کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے۔

....

جن لوگوں نے ''آگ کا دریا'' اور اس کے بعد کے تین ناول پڑھے ہیں، وہ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ جہاں کئی حالتوں میں ''آگ کا دریا'' عام قاری کے لیے نا قابل عبور ہو جاتا ہے، وہاں ''آخر شب کے ہمسفر''، ''گردش رنگ چمن'' اور آخری ناول ''چاندنی بیگم'' کا پڑھنا نسبتاً آسان ہے۔ یہ شاید ایک لاشعوری عمل تھا جس کے تحت انہیں اپنی تحریر میں عام فہم، روزمرہ کی زبان کا استعمال (جو پہلے کم کم تھا) لے آنے کی ضرورت پیش آئی۔ امریکا میں ہوئی بات چیت میں مجھے، معصومیت کے ساتھ، لیکن اپنے گستاخ لہجے میں یہ پوچھنے میں کچھ برا نہیں لگا، کہ کیا وجہ ہے کہ ''آگ کا دریا'' کے ٹائیٹل میں کوئی اضافت نہیں تھی، یعنی اسے ''دریائے آتش'' یا ''جوئے آتش'' بھی کہا جا سکتا تھا، لیکن بعد کے ناولوں میں اضافتیں موجود ہیں۔ ''آخر شب کے مسافر'' میں ایک اضافت ہے، جب کہ ''گردش رنگ چمن'' میں دو ہیں۔ کچھ حیرت زدہ سی رہ گئیں تھیں عینی آپا! کہنے لگیں، ''میں نے اس طرف کبھی دھیان نہیں دیا، لیکن تم پروفیسر لوگ تو مین میخ نکالتے ہی رہتے ہو۔'' اور تب میں نے وہ بات کہی جو میں بہت پہلے کہنا چاہتا تھا۔ ''برعکس اس کے، ان ناولوں کے اسلوب میں زبان کا روزمرہ سے انسلاک ایک قدرتی بہاؤ کی طرح ہے، جو ''آگ کے دریا'' میں نہیں تھا۔ یعنی آپ کو، لاشعوری طور پر ہی سہی، یہ احساس ضرور ہوا ہے کہ ان ناولوں کے پڑھنے والے اوسط درجے کے تعلیم یافتہ لوگ ہیں، اور وہ چاہے وقت اور فاصلے کی قلابازیوں کو برداشت کر لیں، زبان کے سلسلے میں ناول نگار سے کوئی سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔''

بہت بڑی بات کہہ گیا تھا میں! وہ مسکرائی تھیں، اور دیگر سننے والوں سے (بے نیاز نہیں بلکہ با نیاز) مجھے کہنے لگیں۔ ''تم اس پر ایک مضمون لکھو تو مجھے ایک نقل ضرور بھیجنا۔ اب چونکہ میں مختصر افسانے بہت کم لکھتی ہوں، بلکہ لکھتی ہی نہیں، اس لیے رسالے مجھ تک نہیں پہنچتے۔ مجھے خوشی ہوگی۔''

....

قرۃ العین حیدر، یعنی عینی آپا، کو انگریزی ہجوں میں Annie Apa بنا لیا گیا تھا، اس لیے کہ انگریزی

میں "double "A سے الفاظ شروع نہیں ہوتے، اور Annie تو لڑکیوں کا ایک عام نام ہے۔

ایک معروف اہل قلم سجّاد حیدر یلدرم کی صاحبزادی، ناز و نعم میں پلی ہوئی، بے حد حسین و جاذب نظر، متناسب خال و خد، جو اگر انگریزی میں لکھتی تو اس کا نام اور کام عالمی سطح پر تسلیم کیا جاتا اور Booker Prize تو کیا، شاید نوبل پرائز کی بھی حقدار مانی جاتی۔ جب اردو، یعنی ''ایک نادار ملک کی نادار زبان'' (فیضؔ) کا پلّو پکڑ کر یہ لڑکی جوان ہوئی، تو یہ زبان شاعری میں تو نہیں، لیکن فکشن کے تناظر میں ابھی ایام طفلی میں تھی۔ یہ اس خاتون کی ہمت تھی کہ اس نے وہ راستہ اختیار کیا جو ترقی پسندی کا راستہ نہیں تھا، (''آخر شب کے ہم سفر'' اس کا منہ بولتا ثبوت ہے!) اور جسے ترقی پسند نقادوں نے سرمایہ دارانہ نظام کا Camp Follower کہہ کر مسترد کر دیا تھا۔

لکھنؤ کے Isabella Thorburn College کا گریجویٹ ہونا خود میں ہی ایک بڑی بات تھی، لیکن عینی کی نظر تو دور اس افق پر ٹکی ہوئی تھی، جسے اسے سر کرنا تھا۔ ہجرت کر کے پاکستان پہنچی، کہ اس نئے ملک کو تو اس جیسے معماروں نے ہی تراش کر ایک نئے روپ میں سجانا تھا، لیکن مارشل لاء کے بعد، اور مقامی اہل قلم کا بدلتا ہوا وہ رجحان دیکھ کر جو ادب برائے اسلام کی طرف جھک گیا تھا، ہندوستان لوٹ آئی۔ یہاں آ کر کھلی فضا میں سانس لیا۔ Imprint کی مدیر کے طور پر ۴۶۹۱ء سے ۸۶۹۱ء تک کام کیا، پھر اپنی دل پسند ملازمت، یعنی السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا میں خوشونت سنگھ کے ساتھ سات برسوں تک رہی۔ وزیٹنگ پروفیسر کے طور پر کئی یونیورسٹیوں، اور شہروں، مثلاً کیلیفورنیا، شکاگو، وسکانسن، اور ایریزونا میں تدریسی فرائض سر انجام دئے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کی خان عبدالغفار خان چیئر کی پروفیسر امیریٹس Professor Emeritus رہی۔ ناول لکھے، افسانے لکھے، لیکچر دیے، سیمناروں میں شرکت کی اور وہ سب کچھ کیا جو وہ کرنا چاہتی تھی۔ ''پاکستان میں رہ کر میں کیا کرتی؟ ایک غیر شادی شدہ عورت اس معاشرے میں ایک فاضل پرزہ بھی ہے اور شک کی نظر سے بھی دیکھی جاتی ہے۔''

انعاموں اور ایوارڈوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ میں پورے تو چیک نہیں کر پایا، مگر جو یاد آ رہے ہیں، وہ لکھ رہا ہوں۔ ہندوستان کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ، بھارتیہ گیان پیٹھ ایوارڈ ۹۸۹۱ء میں ان کے ناول ''آخر شب کے مسافر'' پر ملا۔ اس سے بہت پہلے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ۷۶۹۱ء میں مل چکا تھا۔ سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ ۹۶۹۱ء میں دیا گیا۔ ۵۸۹۱ء میں غالب ایوارڈ تفویض ہوا۔ ۵۰۰۲ء میں سرکار ہند کی طرف سے 'پدم شری' دیا گیا۔ کچھ برسوں کے بعد انہیں 'پدم بھوشن' دیا گیا جو ایک ہندوستانی شہری کے لیے تیسرے نمبر کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ ''روپے تو، ظاہر ہے استعمال میں لائے جاتے ہوں گے، مگر ان شیلڈوں اور Plaques کا آپ کرتی کیا ہیں۔؟'' میں نے پوچھا تھا۔ ''سجا کر رکھتی ہوں۔۔۔ تم ان کا کیا کرتے ہو؟'' ترکی بہ ترکی جواب تھا۔

عینی آپا نے ایک درجن ناول اور چار افسانوی مجموعے لکھے۔ بہت سا کام ایسا کیا جو ترجمے کے زمرے میں آتا ہے۔ ۸۴۹۱ء میں جب ان کی عمر صرف ۲۲ برس کی تھی، ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''ستاروں سے

آ گئے'' چھپا۔ پھراس کے بعد کتابوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ ''شیشے کے گھر'' اور ''میرے بھی صنم خانے'' نے انہیں بامِ عروج پر پہنچایا۔ ''گردش رنگ چمن'' میں ناول نگار نے سارے عالم کی مختلف النوع تہذیبوں کو یکجا کر کے، ایک Jigsaw puzzle بنا کر پیش کیا ہے۔ اس ناول کی خوبصورتی یہ ہے کہ بغیر کسی نتیجے پر پہنچے، بغیر کسی conclusion پر پہنچے، یہ ناول ختم ہو بھی جاتا ہے اور نہیں بھی ہوتا، کیونکہ زندگی تو بہرحال کسی نقطۂ اختتام تک پہنچ کر بھی ختم نہیں ہوتی۔

....

میری عینی آپا سے آخری ملاقات دہلی میں ہوئی۔ میں پاکستان کے ایک ماہ کے دورے سے لاہور، پنڈی، میرپور، پشاور، سرگودھا، کراچی ہوتا ہوا لوٹا تھا۔ دہلی میں سات دنوں کے لیے ایک ایسے مہمان خانے میں مقیم تھا، جو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی وساطت سے مجھے مہیا کیا گیا تھا اور ایک کار بھی میری تحویل میں تھی۔ عینی آپا کو فون کیا تو بہت خوش ہوئیں۔ دوسری صبح کا وقت مقرر ہوا۔ میں پہنچا تو ریحانہ ملی۔ ریحانہ اور عینی کا رشتہ مالکن اور نوکرانی کا نہیں بلکہ ماں اور بیٹی کا ہے۔ وہ ان کو نہلاتی ہے، سر پر مہندی کی رنگت کی تیزی یا ہلکے پن کا خیال رکھتی ہے، کپڑے استری کرتی ہے، کھانے پینے کا خیال رکھتی ہے۔ فالج دائیں طرف گرا تھا، اس لیے ابھی فعال تھیں۔ بول کر لکھواتی تھیں، ایک نوجوان صبح اور ایک شام کو ان کے فلیٹ میں dictation لینے کے لیے آتا تھا۔ جب ٹائپ کر کے لاتا، تو اس کی پروف ریڈنگ خود کرتی تھیں۔

میں ان کے پاس دو گھنٹے ٹھہرا۔ بیچ بیچ میں بولتے بولتے وہ تھک گئیں، تو مجھے کہنے لگیں، ''اب تم کچھ کہو۔'' جن امور پر بات ہوئی، ان میں ایک سرفہرست رہا، اور ہم بار بار اس کی طرف لوٹ کر آتے رہے۔ یہ امر تھا ساٹھ اور ستّر کی دہائی میں پاکستان میں ''آگ کا دریا'' کے تناظر میں ایک فضول قسم کی گرما گرمی، جس میں ان کے مخالفین نے یہ الزام لگایا کہ وہ پاکستان کے وجود کو ہی تسلیم نہیں کرتیں، اور ''آگ کا دریا'' دراصل پاکستان نہیں، بلکہ ''ہندوستان، یعنی بھارت'' کی تاریخ کو کھنگالتا ہے۔ وہ پاکستان میں بسنے کے ارادے سے گئی تھیں، لیکن اس قسم کی گفتگو نے، جو بآواز بلند تقاریب میں اور اخباروں یا ادبی رسالوں کے اداریوں میں کی گئی، ان کے دل کو اچاٹ کر دیا، اور وہ انڈیا لوٹ آئیں۔ کہنے لگیں، ''کسی کا کیا قصور تھا؟ اس وقت 'ادب برائے اسلام' کے ریلے میں کچھ پرانے ترقی پسند ادیب بھی بہہ گئے تھے۔'' میں نے کہا، ''لیکن یہ بات تو انتظار حسین نے کہی تھی کہ آپ نے ''آگ کا دریا'' میں تقسیم ہند کو ہندو مسلم مشترکہ ورثے کی شکست قرار دیا، اور انتظار حسین تو ادب برائے اسلام کا حامی نہیں ہے۔'' بولیں، ''ہوں، یہ بات تو درست ہے، لیکن جو کچھ اس نے کہا تھا، اس کو صحیح تناظر میں سمجھا ہی نہیں گیا، اور اس بات کو Taken for granted مان لیا گیا کہ میں اینٹی پارٹیشن ہوں۔'' پھر کہنے لگیں، ''اچھا ہی ہوا، میں لوٹ آئی۔ وہاں بہت دوست احباب تھے، لیکن سبھی بے بس۔ یوں بھی اس معاشرے میں اکیلی عورت کے

لیے، جو لکھتی بھی ہو، اور سماجی جانور social animal بھی ہو، رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لوگ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں۔ یہاں میں ایک بھرپور زندگی جی سکی ہوں۔''

میں نے ''کار جہاں دراز ہے'' کا ذکر کیا اور کچھ کہنے ہی والا تھا، کہ وہ بول اٹھیں، ''اب لوگوں کو بھی میری درازیٔ عمر کے ختم ہونے کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا، اللہ تو کیا کرے گا!''

میں نے رخصت چاہی کہ گیسٹ ہاؤس کی کار کی واپسی کا وقت مقرر تھا۔ بولیں، ''گڈ بائی۔۔'' 'بائی' کو انہوں نے یوں لمبا کر کے ختم کیا کہ ان کی سانس ہی اٹک گئی اور وہ کھانسنے لگیں۔ میں رک گیا، لیکن ریحانہ نے مجھے اشارے سے سمجھایا کہ میں خاموشی سے رخصت ہو جاؤں۔ پانی سے بھرے کپ میں ایک چمچ دوا ملا کر پلاتی ہوئی ریحانہ کی اور عینی آپا کی وہ تصویر اب تک میرے دل پر نقش ہے اور مجھے ساحر لدھیانوی کی چار سطریں یاد آ رہی ہیں۔

ہر چیز تمہیں لوٹا دی ہے
ہم لے کے نہیں کچھ ساتھ چلے
پھر دوش نہ دینا، جگ والو
ہمیں دیکھ لو، خالی ہاتھ چلے

------------------------------------۲۶/اگست ۲۰۰۷ء

قرۃ العین حیدر سے دو بار ملاقات ہوئی۔ ایک بار جب وہ پہلی بار پاکستان آئیں تو ان کے اعزاز میں فیصل آباد کے چناب کلب نے ایک ادبی تقریب کا بھی اہتمام کیا تھا۔ میں اس میں شریک ہوا تھا اور تقریب کے بعد بھی ان کے ساتھ تھوڑی سی گفتگو ہوئی تھی۔ تاہم اس ملاقات کا حاصل فوٹو سیشن رہا۔ کشور ناہید لاہور سے ان کے ساتھ آئی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ جو بڑے بڑے مردوں کے سامنے مردانہ وار گفتگو کرتی ہیں وہی کشور ناہید ان کے سامنے سراپا نیاز بنی ہوئی تھیں۔ قرۃ العین حیدر سے دوسری ملاقات سال ۲۰۰۰ء میں لندن میں ہوئی۔ یہاں بھی ایک کانفرنس چل رہی تھی اور یہاں بھی سلام دعا، پہلی ملاقات کا ہلکا سا ذکر اور فوٹو سیشن۔ فیصل آباد والی تصویر انہیں دنوں میں ماہنامہ ماہِ نَو لاہور میں چھپی تھی اور لندن والی تصویر تو انگلینڈ اور جرمنی کے رسالوں میں چھپ چکی ہے۔ پہلی ملاقات میں وہ زور آور دکھائی دی تھیں جبکہ اس بار وہ بہت کمزور لگ رہی تھیں۔ تاہم ان کے ساتھ ملنا بھی میرے لئے ملاقاتِ مسیحا و خضر جیسی بات تھی۔ (**حیدر قریشی** کی کتاب کھٹی میٹھی یادیں کے **تشکیل** کراچی میں زیرِ اشاعت باب --**ادبی کائنات میں رنگ** سے اقتباس)

ڈاکٹر حامد اشرف (اودگیر، انڈیا)

قرۃ العین حیدر کا افسانہ

''نظارہ درمیاں ہے'' فکری و فنی تناظر میں

قرۃ العین حیدر بیسویں صدی کی ایک ایسی افسانہ نگار ہیں، جو دنیائے اردو کے تمام افسانہ نگاروں سے مختلف ہیں۔ ان کے ہاں زباں و بیاں، تصوّر و تخیّل اور اسلوب بالکل نیا اور انوکھا ہے۔ ان کے افسانوں کی تہیں بڑی پیچ دار ہوتی ہیں، جہاں قاری کی تنقیدی بصیرت ہی رسائی حاصل کرتی ہے۔ اگر قاری میں یہ وصف نہ ہو تو وہ ان کے افسانوں کی معنویت نہیں سمجھ سکتا۔ وہ ایک منفرد افسانہ نگار کے طور پر اپنی انمٹ اور سدا بہار شناخت قائم کر چکی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کی افسانوی خدمات گذشتہ نصف صدی پر محیط ہیں۔ انہوں نے ترقی پسندی کا عروج و زوال بھی دیکھا اور جدیدیت کا آغاز و ارتقاء بھی، قدیم افسانہ نگاروں کی مثالیت پسندی بھی ملاحظہ کی اور روایت سے بغاوت کا رجحان بھی۔ مولانا حالؔی نذیر احمد اور اسماعیل میرٹھی کی اصلاح پسندی بھی دیکھی اور اپنے والد سجاد حیدر اور والدہ نذر سجاد حیدر کے علاوہ حجاب اسماعیل، مہدی افادی، میر ناصر دہلوی، نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھپوری کی رومانیت کا گہرا مطالعہ کر کے ان کا اثر قبول کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے بھی رومانی رنگ میں ڈوبے دکھائی دیتے ہیں، لیکن یہ رومانیت ان کے پیش رو افسانہ نگاروں سے مختلف ہے۔

قرۃ العین حیدر نے جس زمانے میں افسانہ نگاری کی ابتدا کی، اس وقت پہلی عالمی جنگ رونما ہو چکی تھی اور دوسری عالمی جنگ کے خدشات سر ابھار رہے تھے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ ہر ہندوستانی خوف و ہراس، بے چینی، مایوسی اور الجھنوں کا شکار تھا۔ بہار اور بنگال میں ہوئے قحط نے ہزاروں انسانوں کو زندگی سے محروم کر دیا تھا۔ ادباء و شعراء اور ناقدینِ ادب "ادب برائے ادب" کے بجائے "ادب برائے زندگی" کی دہائی دے رہے تھے۔ فرائیڈ کا نظریہ "تحلیلِ نفسی" زور پکڑ چکا تھا۔

قرۃ العین حیدر نے اپنا پہلا افسانہ "یہ باتیں" پانچ صفحات پر تحریر کیا، جبکہ ان کے پہلے افسانوی مجموعے "ستاروں سے آگے" (۱۹۴۶ء) میں ایک افسانہ "مونا لیزا" (۵۳) صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ انہوں نے "روشنی کی رفتار" کے زیرِ عنوان چوتھا افسانوی مجموعہ تخلیق کیا، تو ان کے افسانوں میں وہی قوّت و حرکت جو روشنی

میں ہوتی ہے، ان کا وصف بن گئی۔ "وقت" ان کے ہاں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ زمان و مکاں کو وقت کے تقاضوں اور رفتار کے پیشِ نظر افسانوں میں پیش کرتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کا افسانہ اپنی رفتار خود ہی متعین کرتا ہے "روشنی کی رفتار" میں ایک افسانہ "نظارہ درمیاں ہے" بھی ملتا ہے، جو اردو افسانوں میں اپنی مقبولیت اور پہچان رکھتا ہے۔ دراصل اس افسانے کے ذریعے مصنّفہ نے دولت مند طبقے کی مکّاری، خود غرضی اور موقع پرستی کو پیش کیا ہے افسانہ اپنے اندر بیانیہ تاثر لیے ہوئے ہے۔ فلیش بیک یا شعور کی رو کا استعمال نہیں ہوا ہے۔ افسانہ " تارا بائی " کی آنکھوں سے شروع ہوتا ہے، جو بہت خوبصورت اور روشن ہیں۔ ان آنکھوں میں عجیب سی کشش ہے۔ وہ آنکھیں افسانے کے ہیرو سے وابستہ ہر شے کو گھورتی رہتی ہیں اور انہی آنکھوں کی بدولت تارا بائی کا پورا جسم آنکھوں بھرا نظر آتا ہے۔ افسانے کی بنیاد بھی یہی آنکھیں ہیں اور آغاز و اختتام بھی!

تارا بائی، خورشید عالم اور الماس بیگم (میاں بیوی) کے ہاں ملازمہ ہے، جس کی گفتگو فلیٹ کے مستری سے ہوتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خورشید عالم نے فرانس میں سات سال تعلیم حاصل کی ہے۔ اسی دوران انہیں پیرس میں ایک ہندوستانی پارسی لڑکی " مس پیرو جا دستور " سے محبت ہو گئی اور اس کے ساتھ ان کی منگنی بھی ہوئی اور ڈیڑھ سال سے وہ اسی پارسی دوشیزہ مس پیرو جا کا انتظار کر رہے تھے، جو حکومتِ ہند سے ملے وظیفے پر پیرس سے تعلیم پوری کر کے ہندوستان آنیوالی تھی کہ ان کی بے روزگاری اور والد کی بیماری، دور کرنے کا الماس بیگم بہانہ بن گئیں۔

الماس بیگم، ضد، خود غرضی، اور مکّاری کی مثال ہیں۔ وہ پہلے اپنی خالہ کے ساتھ مل کر خورشید عالم کو پانے کے لیے سازش رچاتی ہیں۔ بعد از آں پیرس سے واپس آئی ہوئی پیرو جا دستور سے ملاقات ہونے پر یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ خورشید عالم کی منگیتر ہے، وہ خورشید عالم کو اپنا منگیتر بتاتی ہیں۔ پیرو جا، الماس بیگم کی position اور دولت و حشمت دیکھ کر راستے سے ہٹ جاتی ہے، بلکہ ہٹا دی جاتی ہے اور اس طرح الماس بیگم کی سازش کامیاب ہو جاتی ہے۔ لیکن، یہ کامیابی ایک ایسی لڑکی کی محبت کی خیرات ثابت ہوتی ہے، جو پانے سے زیادہ کھونے کی قائل ہے، جو یہ اچھی طرح جانتی ہے کہ جسے چاہتوں کی حدوں تک چاہا جائے، اور جس کی چاہت پانے کے بعد کسی اور کو چاہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی اگر اس سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ جائیں تو محبت امر ہو جاتی ہے۔

الماس بیگم کی بے حس مگر شاطر ذہنیت کا ثبوت اس وقت ملتا ہے، جب خورشید عالم والد کی بیماری کی خبر پا کر گاؤں گیا ہوا ہے۔ جہاں اسے الماس بیگم کا خط ملتا ہے کہ " پیرس سے آئی ہوئی پیرو جا دستور سے ملاقات ہوئی۔ وہ کسی امریکی آدمی سے منسوب ہو گئی ہے اور اس کے ساتھ ہوٹل سینڈ اینڈ میں ٹھہری ہوئی ہے "۔ خورشید عالم شہر آنے کے بعد حقیقت جاننے کے لیے پیرو جا دستور کے مکان جاتا ہے۔ جہاں اس کی ملاقات اس کی بوڑھی اور بہری چچی سے ہوتی ہے، جو کوئی بات نہ ٹھیک سن سکتی ہے اور نہ سمجھ سکتی ہے، لیکن وہ یہ جانتی ہے کہ پیرو جا دستور کو اسی شخص کا انتظار ہے۔ وہ اسی امریکن آدمی کا کارڈ خورشید عالم کو دیتی ہے کہ پیرو جا وہیں ملے گی۔ یہاں صرف قاری

واقف ہے کہ غریب پیروجا دستور امریکن آدمی کی بیٹی کو ٹیوشن پڑھانے کی خاطر ہوٹل جاتی ہے۔لیکن، خورشید عالم غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے اور ٹھیک اسی طرح، جس طرح پیروجا دستور اپنی اور الماس بیگم کی حیثیت اور رتبے کا خیال کر کے خورشید عالم کے راستے سے ہٹ گئی تھی، وہ بھی اپنی حالت کا موازنہ مالدار امریکن سے کرتا ہے اور پیروجا کی محبت کا خیال دل سے نکال کر الماس بیگم سے منگنی کر لیتا ہے۔

الماس بیگم کی خود غرضی کا تیسرا موڑ اس وقت سامنے آتا ہے، جب منگنی کی رات مقامی ہسپتال سے خورشید عالم کے لیے فون آتا ہے کہ پیروجا سخت بیمار ہے اور حالت بہت نازک ہے۔فون الماس بیگم ریسیو کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ خورشید عالم یہاں نہیں ہیں۔منگنی کی پارٹی میں الماس بیگم کے فیملی ڈاکٹر صدیقی بھی ہیں، جو مقامی ہسپتال سے دو گھنٹے بعد دوبارہ فون آنے پر اپنے فرض کی ادائیگی کی خاطر ہسپتال چلے جاتے ہیں۔پھر ایک دن جب وہ تارابائی کو خورشید عالم اور الماس کے گھر میں دیکھتے ہیں تو یہ راز بیان کرتے ہیں کہ ان دونوں کی منگنی کی رات محبت کی ماری پیروجا دستور نامی پارسی لڑکی نہایت کسمپرسی کی حالت میں مر گئی اور اس کی وصیّت کے مطابق ایک اندھی لڑکی کو اس کی آنکھیں گرافٹ کی گئیں اور تارابائی ہی وہ لڑکی ہے۔الماس بیگم کا چہرہ فق ہو جاتا ہے۔خورشید عالم لڑکھڑاتے ہوئے اندھوں کی طرح کچھ ٹٹولتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔تارابائی کے پیچھے آنے پر وہ اسے باؤلوں کی طرح تکنے لگتے ہیں کہ یہ اسی پیروجا کی آنکھیں ہیں، جو ان کے عشق میں گھل گھل کے مر گئی اور انہیں پتہ بھی نہ چلا۔

افسانے کا اختتام میرابائی کے ایک شعر پر ہوتا ہے، جس کا پس منظر یہ ہے کہ موت کے تصوّر سے سہم جانے والی لڑکی، ایثار اور قربانی کی مورت، پارسی پیروجا کی لاش کو برجِ خموشاں میں موت کی رسم کے مطابق کنویں کے طاق میں بٹھا دیا گیا ہے۔وہ عشق میں ناکام ہو کر اپنے محبوب سے ملنے اور اسے دیکھنے کی آس دل میں لیے دنیا سے رخصت ہو گئی۔اس کی آنکھین تارابائی کو گرافٹ کر دی گئی ہیں۔پیروجا کی لاش کوّے اور گدھ کی غذا بنتی جا رہی ہے۔افسانے کا اختتامی شعر قرۃ العین حیدر کی نگاہِ انتخاب سے افسانے کی تفسیر بن گیا ہے ؎

کاگا سب تن کھائیو ، چن چن کھائیو ماس
دوئی نیناں مت کھائیو ، پیا ملن کی آس

اس طرح یہ افسانہ حالات کے بہاؤ میں بہتے ہوئے خورشید عالم کی بے بسی اور محبت میں ملی ہوئی دائمی کسک اور تڑپ کا مظہر ہے اور الماس بیگم پر یہ بات صادق آتی ہے کہ " محبت اور جنگ میں سب جائز ہے" جبکہ افسانے کا تیسرا اور اہم کردار مس پیروجا دستور اس بات کی غمّازی کرتا ہے کہ ذہن کی ہزاروں آنکھیں ہیں، دل کی آنکھ صرف ایک۔لیکن، جب محبت ختم ہو جائے تو زندگی ختم ہو جاتی ہے۔

خلیق انجم (دہلی)

صبا اکبرآبادی کی غزل

''ہر درد کی صدا میں شریکِ فغاں ہوں میں''

صباؔ اکبرآبادی صاحب سے براہِ راست میرا کوئی تعارف نہیں ہے۔وہ ایک شاعر کی حیثیت سے میرے سامنے آئے اور میں نے ایک قاری کی حیثیت سے ان سے ملاقات کی اور اُن سے ادبی سطح کی اس ملاقات میں انسانی رشتوں کی گرم جوشی کا لطف آیا۔اب شاعری کے علاوہ اُن سے ملاقات کا امکان بھی نہیں کہ اگر کبھی اُن سے بالمشافہ ملاقات کا موقع ملتا تو شاید ایسے ہی یا اس سے بھی کچھ زیادہ گرم جوشی کا لطف آتا۔

فنکار جتنا جینوئن genuine یعنی اصل یا حقیقی ہوگا۔اس کی شخصیت اور اُس کے فن میں اتنا ہی تال میل زیادہ ہوگا۔صباؔ اکبرآبادی کی غزلوں کے مطالعے سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میں ایک حقیقی شاعر کے کلام سے گزر رہا ہوں۔اس اعتبار سے میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی شاعری میں ہمیں جو کچھ نظر آتا ہے وہ محض قدرتِ کلام کا ظہور نہیں بلکہ ان کی اپنی ذات کا عکس ہے۔ان کی شاعری کی دوسری اہم خصوصیت مجھے یہ نظر آئی کہ صباؔ ایک انفرادی لب و لہجے کے شاعر ہیں۔آج کی غزل جس طرزِ بیان کا مطالبہ کرتی ہے، اُس کے بے شمار نمونے اس شاعری میں بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں، اس لیے اس طرزِ بیان کو انگیز کر لینا کچھ ایسا دشوار بھی نہیں لیکن عام مقبولیت کی سطح پر اس کا ایک دور رس نقصان فنکار کو یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنی تخلیق کو بکاؤ مال بھی بنانا چاہتا ہے تو منڈی کی ضروریات اُس کی اُپج پر حاوی ہو جاتی ہیں اور شاعر کی انفرادیت دب کر رہ جاتی ہے۔شکر ہے کہ صباؔ صاحب نے ایسا نہیں کیا جس کی وجہ سے اشعار میں اُن کا وہ انفرادی لب و لہجہ برقرار رہا جو ایک شاعر کو دوسرے شاعر سے ممیّز کرتا ہے۔صباؔ اکبرآبادی کی زبان انتہائی شستہ، صاف، سلیس اور رواں ہے اور کیوں نہ ہوں میرؔ، غالبؔ اور نظیرؔ (نذیرؔ) سے لے کر سیمابؔ اکبرآبادی اور میکش اکبرآبادی کے شہر کا شاعر جو اپنی ادبی روایت سے رشتہ برقرار رکھے گا تو کچھ ایسا ہی اسلوب لے کر سامنے آئے گا جو صباؔ کا ہے۔زبان انتہائی سادہ اور سلیس۔کلام میں عطف اور اِضافت کا استعمال آٹے میں نمک کے برابر۔ایہام تقریباً نہ ہونے کے برابر اور جہاں ہے

اُس کی ضرورت اور حُسن کو برقرار رکھے ہوئے، تجربات ومشاہدات، کیفیات اور احساسات کے بیان کا اپنا ہی ایک انداز۔ اُنھوں نے اپنے کلام کو زبردستی چٹ پٹا بنانے کی کوشش نہیں کی۔ چناں چہ اس طرزِ کلام کا شاعر ہی یہ شعر بھی کہہ سکتا ہے:

ہوس پرست ادیبوں پہ حد لگے کوئی
تباہ وہ کرتے ہیں لفظوں کی عصمتیں کیا کیا

دوسرے مصرعے کے آغاز میں تباہ کی جگہ خراب کا لفظ بھی آ سکتا تھا۔ پھر شاید یہ شعر فحاشی کی سرحدوں کو چھو لیتا۔ پھر ایک زیریں لہر جو صفِ اوّل سے صفِ آخر تک ہر جگہ موجود ہے۔ وہ یہ ہے کہ زیادہ تر ایک خود کلامی کا سا انداز ہے۔ بیشتر مقامات پر ایسا لگتا ہے جیسے وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہے ہوں اور اگر کہیں اپنی ذات سے باہر تخاطب بھی ہے تو اس حسین انداز سے:

ہاتھوں کو ڈبو آئے ہو تم کس کے لہو میں
پہلے تو کبھی اتنا نہ تھا رنگِ حنا تیز

اگر کبھی ہم اس شعر کے بارے میں سوچتے ہوئے دور تک پیچھے جائیں تو بین السطور میں میرؔ کا یہ مصرعہ بولتا ہوا صاف سنائی دیتا ہے:

اُس نے کل رو رو دیا ہاتھ کو دھوتے دھوتے

اب ذرا صبا صاحب کے یہاں کشمکشِ زیست کا پہلو بھی دیکھیے:

کیسے تعلقات کی زنجیر توڑ دوں
میں وہ سفینہ ہوں کہ جو لنگر میں قید ہوں
تیرے الطاف و عنایات کا رخ غیر کی سمت
میرے احساس و خیالات کا رخ تیری طرف

....

درد دینے کے وہاں ساماں بہت
اور تڑپنے کی اجازت کم سے کم

....

زندگی میں اکتاہٹ پیدا کرنے والی سب سے بڑی شے یکسانیت ہے۔ خواہ وہ خوشی ہی کیوں نہ ہو۔ یہ وہ نازک سا احساس ہے جو ہر ایک کو محسوس نہیں ہوتا۔ دیکھیے یہ شعر:

باہمی ربط میں رنجش بھی مزا دیتی ہے
بس محبت ہی محبت ہو ضروری تو نہیں

فانؔی کا آئیڈیل موت تھا لیکن اُس کی انا کا تقاضا یہ تھا کہ اُس نے کہا:

موت ملے تو مفت نہ لوں
ہستی کی کیا ہستی ہے

زندگی کی کلفتوں سے گھبرا کر انسان موت کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے لیکن اِدھر دامنِ یوسف زلیخائے زیست میں بھی اُلجھا دکھائی دیتا ہے۔ صباؔ کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

مرنے کی خواہشوں میں بھی اُلجھے ہوئے ہیں ہم
ہے زندگی بھی اپنے لیے لازمی ابھی

چکبستؔ کا ایک شعر ہے:

الٰہی خیر ہو میں نے قفس میں خواب دیکھا ہے
کہ شمعِ صحنِ گلشن بن گیا ہے آشیاں میرا

اسی سے ملتی جلتی بات صباؔ نے بھی کہی ہے لیکن ''الٰہی خیر ہو'' کے خوف سے مبرّا ہو کر کچھ اپنے ہی انداز میں اس طرح:

سوزِ دل سے گوشۂ تنہائی میں کیا فائدہ
اس طرح جلئے چراغِ رہ گزر ہوجایئے

عالمیت نے پسماندہ اور ترقی پذیر ملکوں کے باشندوں کے پیروں میں ہجرتوں کی وہ بلیاں باندھی ہیں کہ اب اس کا کوئی اختتام نظر نہیں آتا۔ اب اس موضوع پر صباؔ کو سنیے:

ابھی تو ایک وطن چھوڑ کر ہی نکلے ہیں
ہنوز دیکھنی باقی ہیں ہجرتیں کیا کیا

اب بھلا میں صباؔ کے اشعار پر اپنی کیپشن لگا لگا کر اس تحریر کے قاری کو کہاں تک بور کرتا جاؤں، اس لیے چند اشعار کے ساتھ قاری کو تنہا چھوڑتے ہوئے اپنی مداخلتِ بے جا کا سلسلہ بند کرتا ہوں ورنہ کہیں صباؔ اکبر آبادی کے قاری کو مجھ سے یہ شکایت نہ پیدا ہو جائے کہ تم نے صبا صاحب کے اشعار کو مکتب کا سبق بنا کر کیوں رکھ دیا؟ اب ملاحظہ ہو آخر میں صباؔ کے مختلف رنگوں کے ساتھ چند اشعار متنوع مضامین کے ساتھ۔۔

پستی نے بلندی کو بنایا ہے حقیقت
یہ رفعتِ افلاک بھی محتاطِ زمیں ہے

کام آئے گی مزاجِ عشق کی آشفتگی
اور کچھ ہو یا نہ ہو ، ہنگامۂ محفل سہی

ہم بھی بندے ہیں ہمیں بھی مقدرت اتنی تو ہے
وہ خدا بن جائے جس کے سامنے سجدہ کریں
طاقتِ دیدار ظاہر اور آنکھوں کو یہ شوق
بس تمھیں دیکھا کریں، دیکھا کریں، دیکھا کریں

اوراسی غزل کا یہ شعر بھی دیکھئے۔

چاہتے یہ ہیں کہ راہِ زندگی ہموار ہو
سوچتے یہ ہیں کہ دنیاکو تہہ و بالاکریں

-

ازل سے آج تک سجدے کیے اور یہ نہیں سوچا
کسی کا آستاں کیوں ہو، کسی کا سنگِ در کیا ہے

....

تیلیاں خون میں تر دیکھیں قفس کی تو صبا
اپنی سوکھی ہوئی آنکھوں پہ میرا دھیان گیا

....

جب دورِ بیخودی تھا تو مشکل نہ تھی کوئی
یہ عہدِ ہوش ہے تو کچھ آساں نہیں ہے اب

....

حلق میں چبھ رہے ہیں کانٹے سے
لب پہ گلہائے تر کا قصّہ ہے

صبا اکبرآبادی کی شاعری کا جائزہ اگر سنجیدگی سے لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن کی شاعری میں وہ تجربات اور مشاہدات بھی موجود ہیں جن سے ہمارے بہت سے بزگ شعرا واقف بھی نہیں تھے اور یہ تجربہ اور مشاہدہ وقت سکھاتا ہے۔

عبداللہ جاوید (کینڈا)

جوگندر پال

ہمارے دور کا ایک اہم کہانی کار

جوگندر پال ہمارے دور کا وہ افسانہ نگار ہے جو قد آور لگتا نہیں کہ بلا جھجک عظیم کہلایا جا سکے لیکن اُس کا قلم تھامنے والا ہاتھ شاید ساری دنیا کو اپنے احاطۂ تحریر میں سمیٹے ہوئے ہے اور اپنے مالک کو نہ صرف عظیم بلکہ لمحہ بہ لمحہ عظیم سے عظیم تر بنانے میں مصروف ہے۔ آج کے دور میں جب مشرق کے شعر و ادب پر مغرب کے شعر و ادب کی نئی نئی سچّی جھوٹی، کھری کھوٹی تحاریک کی یلغار جاری ہے جوگندر پال ان معدودے چند افسانہ نگاروں میں سے ایک ہے جو اس یلغار سے انتہائی کامیاب اور مثبت انداز میں عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے قدرتی حقِ انتخاب سے کسی صورت دست بردار نہیں ہوئے۔ بیرونی اثرات میں سے صرف اُن کو قبول کیا جو دیس کی مٹی کے ہم طینت اور ہم مزاج محسوس ہوئے اور ان کو نظر انداز کر دیا جو بالکل اجنبی اور بے جوڑ لگے۔ مثال کے طور پر علامت پال کے افسانوں میں ہے بھی اور نہیں بھی۔ ہے، ان معنوں میں کہ اس کے کردار ہوتے ہوئے بھی گوشت پوست کے جیتے جاگتے آدمی ہوتے ہیں۔ نہیں ہے۔۔، ان معنوں میں کہ اس کا علامتی افسانہ یعنی وہ افسانہ جس کو نقادوں نے علامتی افسانہ تسلیم کیا ہے علامتی ہونے کے باوجود افسانہ ہونے سے باز نہیں رہتا۔ اُس کا استعاراتی پہلو اپنی طوالت اور وسعت کے باوجود واقعیت کا خاتمہ نہیں کرتا۔ نتیجے کے طور پر افسانے میں کہانی کا وجود برقرار رہتا ہے۔ ہمارے اردو+ ہندی یا ہندی+ اردو ادب میں آج کے افسانے پر جو کڑا وقت آیا ہے اس کا بڑا سبب ہمارا احساس کمتری ہے جس کو مغربی ادب کے مقابلے میں ہم میں سے بیشتر لکھنے والے اور ادب کے پارکھ یعنے تنقید نگار اپنے آپ پر مسلط کئے رہتے ہیں۔ احساس کمتری ہم کو نقالی کے راستے پر لگا دیتا ہے۔ نقالی کے راستے پر چل کر ہم یہ بھی فراموش کر بیٹھتے ہیں کہ ہم کون ہیں؟ ہماری اصلیت کیا ہے؟ ہماری جڑیں کہاں ہیں؟ جبکہ مغرب کا ادب نئے نئے رجحانات، تجربات اور میلانات کی زد میں ہونے کے باوجود اور نئی نئی ادبی تحاریک کی آپسی کش مکش کے سائے میں بار بار پلٹ پلٹ کر اپنی گراس روٹس کی جانب مراجعت کرتا رہتا ہے۔ اس ضمن میں امریکی شعر و ادب کو ایک مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

ایک جانب امریکہ جدید ترین ادبی میلانات' رجحانات اور تحاریک کی سب سے بڑی منڈی ہے اور امریکی نقاد اور ادیب ان کے عالمی آڑھتی تو دوسری جانب امریکہ کا شعر و ادب قدیمی نخلِ ثقافت سے وابستہ و پیوستہ رہتا ہے۔ اس نکتے کی وضاحت کے لیے مَیں لارا فرمین LAURA FURMAN کے ایک تبصرے سے دو فقروں کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ سوزان فوم برگ شائفر کے مشہور افسانے ''بھیڑیئے'' پر بات کرتے ہوئے وہ کہتی ہے:

''اس کی کہانی 'بھیڑیئے' قاری کو اس جرأت سے آشنا کرتی ہے جو شائفر سے مخصوص ہے اور ساتھ ہی استعارے پر اس کے عبور سے' اس کی تخیلاتی پرواز اور بحفاظت زمین پر اُتر آنے کی صلاحیت سے۔ کہانی قاری سے واقعیت کی سطح پر ابلاغ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے طول دیئے ہوئے استعارے کی سطح پر بھی باتیں کرتی ہے۔ لمبی ازدواجی زندگی اور بڑھتی عمر کی دہشت سے لبریز''۔ آج کے امریکی ادب نے کہانی کی واقعیت کو بلی چڑھا کر علامتی افسانے کو پروان چڑھانا گوارا نہیں کیا اور نہ ہی اس کی قدر افزائی کی۔ لارا فرمین کا ذکر چھڑ گیا ہے تو یہ بھی ملاحظہ کریں کہ مشہور امریکی افسانہ نگار الائیس منرو کے بارے میں وہ کہتی ہے: ''یوں لگتا ہے کہ منرو افسانے کے فارم کو پیچیدہ سے پیچیدہ بنانے میں لطف لیتی ہے لیکن اُس کو ٹوٹنے نہیں دیتی۔''

آپ نے ایک مرتبہ پھر ملاحظہ کیا کہ آج کے امریکی ادب میں جدت کو روایت کی شکستگی کے بغیر قبول کرنے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ آج کا امریکی افسانہ کسی طور بھی بے جڑا نہیں کہلایا جا سکتا۔ اسی طرح جوگندر پال بھی جدید بلکہ جدید تر افسانہ نگار ہے لیکن بے جڑا نہیں۔ اس کا قلم اُسی زمین سے اُگا ہے جس زمین سے منشی پریم چند کا قلم اُگا تھا۔ جس کی زبان بھی پریم چند کی زبان کی مانند عوام کی زبان ہے۔ اس زبان کا تانا' بانا کھڑی بولی اور ہلکی سی پنجابی بولی سے تیار ہوا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس کی بولی میں لچر پن نہیں ملتا۔ وہ بازار کی زبان میں لکھتا ہے لیکن اُس کی زبان بازاری نہیں۔ اس کی زبان یوں بھی اس کی اپنی نہیں۔

مَیں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن میرا قیاس یہی کہتا ہے کہ وہ گھر میں پنجابی بولتا ہوگا۔ باہر پنجابی آمیز ہندی+اردو جبکہ ساری عمر اُس نے انگریزی پڑھائی۔ اس کے افسانوں کی زبان اُس کے کرداروں کی زبان ہے اس کے کرداروں کی اکثریت نچلے اور درمیانی طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا قلم اونچے طبقے پر نہیں چلا۔ اُس کے افسانوں میں اونچا طبقہ بالراست داخل نہیں ہوتا۔ وہ ایک سچا قلم کار ہے۔ وہ اپنے چاروں طرف بکھرے ہوئے افسانوں کو اپنے مشاہدے سے پابہ زنجیر کر کے اپنے سوچنے والے ذہن اور محسوس کرنے والے دل سے گزار کر فطری اور انتہائی بے ساختہ انداز میں کاغذ پر منتقل کر دیتا ہے۔ اس کی افسانہ نگاری کا کمال یہ ہے کہ اس کی ٹکنیک' اُس کی فن کاری' اُس کی محنت اور وہ خود کبھی ظاہر نہیں ہوتے۔ وہ پڑھنے والے کو اپنے افسانے کے اندر داخل کر لیتا ہے۔ پڑھنے والا افسانے کو واقع ہوتے ہوئے نہ صرف دیکھتا ہے بلکہ کرداروں کے اندر اُتر کر اُن کو محسوس بھی کرتا ہے۔ پڑھنے والا افسانے کے اندر سے اور افسانہ پڑھنے والے کے اندر سے ہو کر گزرتا ہے۔ یہاں

مَیں افسانہ' کردار اور قاری کی بات کر رہا ہوں کہانی کار کی بات نہیں کر رہا۔ وہ تو اِن سب میں ہے لیکن سب سے الگ اپنی موجودگی کا مکمل اِخفا کیے ہوئے۔ یہ معاملہ تو ہے ہی کہ فن کا اِخفا ہی فن ہے لیکن یہ فن کار کا اخفا ہمارے نقادانِ فن کی نظروں سے کس طرح اوجھل رہا؟

جوگندر پال کے کرداروں پر بات کرتے ہوئے مَیں اس نکتے پر زور دینا پسند کروں گا کہ اس کے کردار بظاہر سیدھے سادھے ہوتے ہیں لیکن ہوتے بے حد پیچیدہ (complex) ہیں۔ پیاز کی مانند وہ پرت پرت کھولنے پر کھلتے ہی چلے جاتے ہیں۔ ہر پرت گنجینۂ معنیٰ کا طلسم ثابت ہوتا ہے اور پڑھنے والے کو ایک نئی معنویت سے یا معنوی اشاریت سے آشنا کرتا ہے۔ اس معنویت یا معنوی اشاریت کا ابلاغ کرداروں کی خارجی سطح پر بھی ہوتا ہے اور داخلی سطح پر بھی۔ کرداروں اور پلاٹ کا باہمی رشتہ ایسا نہیں کہ اس سے صرفِ نظر کیا جا سکے۔ جوگندر پال کا افسانہ کرداروں کے اعمال اور افعال سے تشکیل ہوتا نظر آتا ہے۔ یہ کردار اپنے قول اور فعل میں آزاد دکھائی دیتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ہر کردار زندہ اور منفرد ہے۔ اگر تابع ہے تو اپنی انفرادی سوچ کا' پابند ہے تو اُس ماحول کا جس میں وہ سانس لے رہا ہے۔ اس کے علامتی کردار' نمائندہ کردار بھی زندہ' منفرد اور با اختیار افراد ہونے کے حق سے دست بردار ہوتے نظر نہیں آتے۔ افسانے کی مرکزیت اگر ان کو باندھے رکھتی ہے تو وہ ڈور نظر نہیں آتی جس سے وہ بندھے ہوئے ہیں۔ سب سے بڑی بات ایسی کسی ڈور کو حرکت دینے والی انگلیاں بھی دکھائی نہیں دیتیں جن سے لکھنے والے ہاتھ تک رسائی ہو۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پلاٹ جیسی کوئی چیز جوگندر پال کے افسانوں میں ہوتی بھی ہے یا نہیں ہوتی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پال کے افسانوں میں پلاٹ ہوتا ہے اپنے سارے لوازمات کے ساتھ۔ وہی کہانی کو اپنے سفر پر لے جاتا ہے اور سفر کو اختتام پذیر کرتا ہے۔ یہ اور بات کہ وہ اپنے ہونے کا اعلان نہیں کرتا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جوگندر پال اپنے کردار اور پلاٹ کے ساتھ کیا کرتا ہے اس کے بارے میں کوئی واضح فیصلہ کرنا آسان نہیں ہے۔ اگر میں ایسا کرنے بیٹھ جاؤں تو اپنے آپ کو 'اُوور سمپلی فائی' کیے بغیر نہ رہ سکوں گا۔ میرے خیال میں وہ کردار اور پلاٹ کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ اسکے ذہن کے تخلیقی نہاں خانے میں افسانہ پورا کا پورا تخلیق پاتا ہے اور کاغذ پر اتارے جانے سے پہلے کچھ وقت رہتا ہے۔ اس دوران افسانے کے جملہ عناصر ایک دوسرے سے شیر و شکر ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کی تخلیق و تشکیل' تعمیر و تخریب اور تکمیل کرتے ہیں۔ افسانہ نگار کو یہ سہولت حاصل ہے جب کہ ناول نگار اس سے محروم ہے۔ افسانہ نگار ڈیوڈ مینس David Means نے کیا خوب کہا ہے: ''مجھے کہانیاں لکھنا زیادہ پسند ہے۔ مجھے یہ اچھا لگتا ہے کہ ایک پوری چیز کو اپنے سر میں رکھوں اور اس کو دیر تک گھماتا رہوں۔''

جوگندر پال کرتا کیا ہے؟ کہانیاں لکھتا ہے۔ لڑکے لڑکیوں کو پڑھاتا رہا ہے۔ کوئی تعجب نہیں آج بھی کسی کو پڑھاتا ہو۔ کہتے ہیں استاد آخری سانسوں تک استاد رہتا ہے۔ پڑھانے لکھانے کی عادت کبھی نہیں

چھوٹتی۔ پڑھانے لکھانے کے ساتھ ساتھ وہ پڑھتا لکھتا بھی ہے۔ یہ پڑھنا لکھنا بھی ساری عمر کا سودا ہے، سودائے عشق کی طرح۔ پال اس معاملے میں بھی پیچھے نہیں اگرچہ عمر ڈھل چکی۔ اگر یقین نہ آئے تو اُن کتاب ''کھلا'' کا انتساب دیکھ لیجئے۔ ایک جانب لکھا ہے ''تیرا ہی تیرا'' اور دوسری جانب تحریر ہے ''کرشنا کے لیے''۔ جوگندر پال کتابیں پڑھنے کے ساتھ آدمیوں کو بھی پڑھتا ہے۔ آدمیوں کو چھوڑیئے وہ جانوروں کو بھی پڑھتا ہے۔ اللہ کی جملہ مخلوقات کو پڑھتا ہے۔ جاندار اور بے جان۔ پڑھنے کے ساتھ وہ جانتا بھی ہے۔ وہ ہونے کو اور نہ ہونے کو جانتا اور سمجھتا ہے۔ اس کی کہانیوں میں مغرب کی وجودیت بھی ہے اور مشرق کی بھی۔ کبھی تو کبھی وہ نی ہیلسٹ Nihilist بھی لگنے لگتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ بس جاننے میں لگا ہوا ہے اور اپنے پڑھنے والوں کو بھی اس پر مائل کرنا چاہتا ہے۔ اپنی کہانیوں میں خود تو کچھ نہیں کہتا البتہ اس کی کہانیاں بہت کچھ کہتی ہیں اس کی کہانی کا قاری کہانی پڑھنے کے بعد وہ نہیں رہتا جو وہ پڑھنے سے پہلے تھا۔ اس نے ایسی کہانیاں بھی لکھی ہیں جو اینٹی سٹوریز (کہانیاں) بھی کہلائی جا سکتی ہیں لیکن پڑھنے والا شاید یہ محسوس نہیں کرسکتا۔ اس کو ایسا ہی لگتا ہے کہ اس نے جو کچھ پڑھا وہ کہانی ہی تھی۔ ایک بھلی یا شاید بُری بات پال میں یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو دہراتا ہے۔ بعض اوقات وہ پلاٹ کو دہراتا ہے اور کبھی کردار کو۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کو کوئی موضوع، کوئی مرکزی خیال Theme، کوئی کردار ہانٹ کرتا ہے تو اس کو نئے انداز میں ٹریٹ کرنے کے لیے دہرانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ بہرحال اس مرحلے پر اس کے چند ایک افسانوں کا حوالہ ناگزیر ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے سب سے پہلے اس کے افسانے ''عفریت'' کو پڑھا جائے۔ اس کے بنیادی کردار ہیں مَیں، بچہ اور ۔۔۔۔ راون۔ راون جس کو ہر سال جلایا جاتا ہے لیکن وہ ہر سال بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ نہ صرف بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے بلکہ ہر نئے سال وہ اونچے سے اونچا ہوتا جاتا ہے۔ 'بچہ' جو 'میں' کا بچہ ہے۔ شاید 'میں' کی بیوی کے عاشق کا 'بچہ' ہے۔ 'میں' اس حقیقت سے واقف ہوتے ہوئے بھی بچے سے اس قدر وابستہ ہو چکا ہے کہ اس سے دستبردار ہونے پر راضی نہیں۔ بچے کی ماں کا یہ مسئلہ تھا کہ وہ کسی شادی شدہ آدمی پر عاشق تھی۔ چونکہ وہ حاملہ ہو چکی تھی تو مجبوراً 'میں' سے شادی کی اور جب عاشق کی بیوی پراسرار حالات میں چل بسی تو اس نے 'میں' سے طلاق لے کر عاشق سے شادی کر لی اس کہانی میں مرد کردار چار ہیں۔ پہلا مرد تو راون ہے جس نے دس سروں کا مالک ہونے کے باوجود رام کی بیوی اور لکشمن کی بھابی کو ہرنے کی حماقت کی۔ دوسرا مرد 'میں' ہے جس کی بیوی کو ایک اور مرد یا ایک راون اپنی سیتا کو ٹھکانے لگا کر ہر لیتا ہے لیکن یہ 'میں' رام کہلانے کا مستحق نہیں ہے ایک تو اس کا لکشمن جیسا کوئی بھائی نہیں ہے دوسرے وہ خود بھی ایک 'راون' ہے یعنے تیسرا راون جس نے ایک غریب آدمی کی بیوی کو ہر لیا ہے جو اس کے گھر نوکرانی بن کر آئی ہے لیکن 'میں' کی عورت اور 'میں' کے حرامی بچے کی ماں بن کر رہنے پر مجبور ہے جب کہ اس کا اپنا شوہر بیوی سے اور بچہ ماں سے محروم ہو گیا ہے۔ دونوں مردوں نے دو مردوں سے ان کی بیویاں اور بچے سے اس کی ماں ہر لی ہیں اور راون کے پتلے کا قد

سال بہ سال دراز سے دراز تر ہوتا جاتا ہے۔ کہانی کا ایک اور رخ۔ مَیں ہوٹل کے کاروبار کی آڑ میں افیون اور کوکین کے عوض مغربی ممالک سے ہتھیار سمگل کر رہا ہے۔ مغرب اپنی طاقت سے اتنا خوفزدہ ہے کہ ہوش وحواس کھو کر جینا چاہتا ہے اور مشرق لڑتا بھڑتا نہ رہے تو اسے اپنی آزادی کا یقین نہیں ہوتا۔ 'میں' دونوں کی ضروریات پوری کرنے میں جُتا ہوا ہے۔ چنانچہ کہانی میں دسہرے کی رسومات کا اختتام تخریب کاروں کی شوٹنگ پر ہوتا ہے۔ مَیں اپنے آپ کو حق بجانب گردانتے ہوئے سوچتا ہے ''لوگ مرتے ہیں تو میرا کیا دوش؟ مُردے گننا بے کار لوگوں کا شغل ہے۔ میں تو سیدھے سیدھے اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔ جیسے بھی ایک کے دس بن جائیں۔''

''عفریت'' کو آپ نے دیکھا کہ انسانی زندگی پر کس طرح محیط ہے۔ یہ عفریت ہمہ جہتی ہے۔ بین الاقوامی عفریت جو اپنی عسکری طاقت کو سنبھالنے میں ناکام ہو کر بَولا ہو گیا ہے۔ جنس کا عفریت جس کا قد سال بہ سال دراز تر ہوتا جاتا ہے۔ معاشی بدحالی کا عفریت جو بچوں کو ماؤں سے اور بیویوں کو شوہروں سے محروم بنا رہا ہے اور تخریب کاری اور دہشت گردی کا عفریت انسانی خون سے ہولی کھیلنے میں مصروف ہے۔ اس کا علاوہ ڈرگ ایڈکشن کا جو ساری انسانیت کو اپنی لپیٹ میں لیتا جا رہا ہے۔ 'عفریت' جیسے افسانے کو پڑھ کر ہم ایک اس سے مختلف افسانے کو پڑھتے ہیں جو مکالمہ ہے یا شاید خود کلامی اس کا فیصلہ قاری پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کا عنوان ہے 'گلزار'۔ یہ افسانہ مشتمل ہے دو کرداروں مرشد اور مرید پر اور دو مقامات ویرانہ اور گلزار پر۔ چونکہ یہ فقرات کے تانے بانے سے تشکیل پاتا ہے اس سبب سے چند ایک فقرے ہم بھی اٹھا لیتے ہیں۔

''آنکھ کھلنے پر نظر چھن جاتی ہے''

''ہماری نجات صرف اسی مقام پر ممکن ہے جہاں ہمارے اعزا ہمیں یکا وتنہا چھوڑ کر اپنی راہ ہو لیتے ہیں''

''ہاں مرشد۔ مجھے اپنا ہونا تو بہرحال محسوس ہوتا ہے''

''نہیں پسرم۔ ہونا دراصل نہ ہونا ہے''

''تمہاری باتیں میرے سر کے اوپر سے گزر جاتی ہیں۔ مرشد''

''تمہارے سر ہو تو اس پر سے بھی گزریں مگر تمہارے تو سر ہے نہ دھڑ۔ تم ہو ہی کیا جو کچھ ہوتے۔''

''بلیک مَین'' عفریت کی طرح جوگندر پال کی ایک قابلِ ذکر کہانی ہے۔ ظاہر میں تو ایک ایسے آدمی کی کہانی جو ایک عقبی گلی میں رکھے ہوئے ڈرموں کے کوڑے سے کباڑیئے کے مطلب کی چیزیں بٹور کر پیٹ پالتا ہے جس کی اپنی ایک کہانی ہے لیکن ڈرموں سے متعلقہ کوٹھیوں کی کہانیاں بھی اس آدمی کی کہانی سے جُڑی ہوئی ہیں۔ جوگندر پال کے اندر پریم چند اور منٹو اور کبھی کبھی بیدی جھلکنے لگتا ہے۔ اس افسانہ نگار کو کسی عصر یا کسی مکتبہ فکر تک محدود کرنا بڑی زیادتی ہوگی۔ وہ حد بندیوں میں آنے والا فن کار نہیں ہے اسی میں اس کی بڑائی ہے۔ منٹو کا ذکر آ گیا ہے تو یہ بھی کہنا پڑ رہا ہے کہ منٹو کی کہانیوں کی مانند جوگندر پال کی کہانیاں بھی غیر متوقع انجام سے دوچار

ہوتی ہیں۔ یہ اور بات کہ پال کی کہانی میں یہ ٹوئیسٹ Twist اکثر و بیشتر فکر کی سطح پر ہوتا ہے۔ یہاں اس کا بھی ذکر کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا کہ منٹو کے بارے میں یہ بھی کہا گیا (یہ سچ بھی ہوسکتا ہے) کہ اس نے یہ ٹکنیک مشہور امریکی افسانہ نگار او۔ ہنری سے لی تھی جس کا اصل نام ولیم سڈنی پورٹر تھا۔ غیر متوقع انجام والی کہانیوں کی جوگندر پال کے ہاں بہتات ہے کیوں کہ یہی اس کا فن ٹھہرا ہے لیکن جن کہانیوں کا موضوع جنس ہے اور وہ غیر متوقع انجام سے بھی دو چار ہوتی ہیں کچھ کم نہیں، بغیر تلاش کے مل جاتی ہیں۔

''ہری کیرتن'' کے بڑے بابو بگڑے بابو تھے کسی اوباش عورت کی زلف میں الجھے ہوئے۔ بڑے بابو کی سورگباشی ماں نے ان کی پتنی کو اس ٹارگٹ پر لگا رکھا تھا کہ صبر کے ساتھ اپنے میاں کو راہ راست پر لے آئے۔ ایک مدت کے بعد حالات کے کسی دھچکے نے اُن کو اس عورت سے چھڑایا اور اِن کی راتوں کو گھر اور بیوی کا راستہ دکھایا۔ ساتھ ہی انہوں نے دفتر سے چھٹی لے کر پتا کی خدمت شروع کر دی۔ ان کو دوائیاں بھی باقاعدگی سے دینے لگے۔ پتا بہت جلد سدھار گئے۔ ایک دن جب ان کی پتنی کسی مذہبی عورت کے انداز میں ہری کیرتن کی باتیں کر رہی ہوتی ہے تو بڑے بابو اس پر یہ راز افشا کرتے ہیں کہ انہوں نے ایک دن پتنی اور سسر کو منہ سے منہ ملائے دیکھ لیا تب ہی چھٹی لے کر پتا کی خدمت شروع کی لیکن ایسی خدمت کہ دوائی جگہ سادی گولیاں دیتے رہے تا آنکہ وہ مر گئے۔ 'جادو' کی نوکرانی بھابو جو 'عفریت' کی نوکرانی کی مانند جوان نہیں ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی جو گھر کی مالکن کو پسند آئی اس کا تنخواہ کے لیے بارے تنگ نہ کرنا۔ البتہ اس کے بارے میں یہ سنا تھا کہ اس نے جہاں پہلے کام کرتی تھی اس کے بچے پر جادو کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مالکن نے اپنے بچے کو اس سے دور رکھا جب کہ بھابو بچے کو دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھی۔ بھابو کا اپنا ایک بچہ تھا اس کے ساتھ کسی کے بلادکار (Rape) کی نشانی۔ وہ مَسیں بھیگنے سے پہلے ہی گھر سے بھاگ گیا تھا۔ وہ ایک آس لگائے رکھتی شاید وہ اس کے پاس لوٹ آئے ساتھ ہی وہ یہ سوچنے لگتی کہ وہ کیسے آئے گا وہ تو کسی عورت کے ساتھ مزے سے رہتا ہوگا۔ وہ بے جان اشیا سے بھی باتیں کرتی تھی جیسے وہ زندہ افراد ہوں۔ ان سے وہ اپنے لڑکے کا ذکر بھی کرتی تھی۔

گھر کی مالکن نے اپنے بچے کو بھابو سے محفوظ رکھا کیوں کہ اس نے یہی سنا تھا کہ وہ بچوں پر جادو کرتی ہے۔ اس کہانی کا انجام مالکن کی توقع کے برخلاف ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

''میں پتھر کا پتھر دیوار سے جڑا ہوا تھا اور پھوٹ پھوٹ کر دیکھے جا رہا تھا کہ اپنی جان چھڑک چھڑک کر بھابو نے ایک ایک بے جان شے میں جان ڈال دی ہے۔ مجھ میں بھی!''

آپ جان گئے ہوں گے کہ یہاں 'مَیں' گھر کا مالک ہے۔ مالکن کا شوہر۔

افسانہ ''پھول'' کا خاص کردار دریائے گنگا ہے جس کو لوگ گنگا میّا پکارتے ہیں۔ گنگا میّا گزر بھی جائے تو عین مین وہیں ہوتی ہے جہاں سے گزر گئی ہو۔ گنگا میّا سے مرادیں مانگنے کے لیے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔

عقیدہ یہ بھی ہے کہ جو کوئی گنگا میں اشنان کر لے اس کے گناہ دُھل جاتے ہیں۔ یہ بھی عقیدہ ہے کہ جب تک مرنے والے کی ہڈیاں جن کو پھول بھی کہا جاتا ہے گنگا میں نہ بہائی جائیں اس کا کریا کرم پورا نہیں ہوتا۔ افسانے کا اسلوب مکالماتی ہے۔ غیر متوقع انجام دیکھنے کے لیے ان مکالموں سے گزریئے:

''تمہارا کوئی بیٹا نہیں کہ تمہارے پھول گنگا کے سپرد کرے؟''

''تمہارا کوئی پوتا نہیں کہ تمہارے پھول۔۔۔۔''

''جب بیٹا نہیں تو پوتا کیسے ہو؟''

''ارے تم تو آ بھی گئے ہو''

''ہاں! آ' تو گیا ہوں لیکن پھر شاید جانا نہ ہو۔''

''کیوں۔۔۔؟ گنگا نے تم سے کیا کہا۔۔؟ تم نے اس سے اپنے لیے بیٹا مانگا؟''

''ہاں۔''

''تو پھر گنگا نے تم سے کیا کہا؟''

''گنگا نے میری ساری بات سن کر صرف یہ کہا۔ اپنی ہڈیاں آپ ہی لے کر آ گئے ہو تو اب آپ ہی انہیں یہاں ڈال دو!''

جوگندر پال کے افسانوں میں انڈر کرنٹ کے طور پر جو فکری قدر ملتی ہے وہ اس کے افسانوں کو اٹھا کر کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے وہ اپنی ذات میں ایک چھوٹا موٹا فلسفی ہے اور اپنے قاری کو ایسی سوچوں میں الجھا لیتا ہے جو انجام کار اس کی ماہئیت قلبی پر منتج ہوتی ہیں۔

☆☆☆☆

میرے یہاں آنے سے پہلے میری ضعیف ماں میرے چھوٹے بھائی کے پاس رہا کرتی تھی۔ وہاں گوردوارہ گھر کے ساتھ ہی لگا ہوا تھا، سو وہ نہا دھو کر ناشتہ کرنے سے پہلے بلا ناغہ متھا ٹیکنے گردوارے چلی جاتی، مگر میری رہائش دہلی کے ایک مسلمان علاقے میں تھی جہاں آس پاس کوئی گردوارہ واقع نہ تھا۔ چند روز تو میں دفتر جانے سے پہلے ماں کو اپنی گاڑی میں دور پار کے ایک گردوارے لے گیا، پھر وہ میرا دفتر میں اُن دنوں لیٹ پہنچنے کا سن کر مجھ سے کہنے لگی: ''پتر! تم یہ تکلیف مت اُٹھایا کرو''

''پھر تم اپنے واہگورو کے پاس کیسے جاؤ گی ماں؟''

میری سیدھی سادی بوڑھی ماں نے ذرا سوچ کر یہ اُپائے سجھایا ''میں پڑوس کی مسجد میں ہی واہگورو کو متھا ٹیک آیا کروں گی''

(**جوگندر پال** کا افسانچہ **خانۂ خدا**)

عبدالرب اُستاد (گلبرگہ)

انتظار حسین کا افسانہ

’’زرد کتا‘‘....ایک تجزیہ

تخلیقی ادب میں اُردو افسانہ بہت ہی کم عمر صنف ہے۔اس نے اس کم سنی میں ہی کئی دور دیکھے ہیں ۔مختلف تجربوں اور تبدیلیوں سے آشنا ہوا ہے۔افہام و تفہیم اور ترسیل کے میدان میں بھی بڑے اہم کام انجام دیے ہیں۔افسانہ، جسے داستان اور ناول کی ارتقائی شکل گردانا گیا ہے،اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ پڑھنے کی چیز ہے، کہ کم سے کم وقت اور الفاظ میں دل نشین انداز اختیار کرتے ہوئے پیش کیا جائے تا کہ کسی وقوع کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

فن کی پیش کشی میں فن کاروں نے مختلف طریقوں کو اپنایا اور فن کو نکھار اور سنوار کر بہتر انداز میں قاری کے سامنے پیش کیا۔ ہر فن کار کی یہ خوبی رہی ہے کہ اس نے جس طریقۂ کار کو مناسب سمجھا اور جو گرد و پیش کے حالات سے مطابقت رکھ سکتے ہوں ان کو افسانہ کے ذریعہ پیش کیا۔کسی نے داستانوی انداز اختیار کیا تو کسی نے حکایتی طرز کو اپنایا، کسی نے قصہ گوئی کو ترجیح دی تو کسی نے بیانیہ میں لکھا، کسی نے علامتی افسانہ تحریر کیا تو کسی نے تجریدی نمونے پیش کیے۔

انتظار حسین ،فن افسانہ نگاری میں اپنی ایک شناخت،الگ سی پہچان اور انفرادیت رکھتے ہیں۔اور اس عہد کے ممتاز افسانہ نگار ہیں۔افسانہ کے لیے انھوں نے زیادہ تر داستانی طرز ،قصص قرآنی ، حکایات اور Myth کے طریقہ کار کو اپنایا اور اس میں وہ کایاب افسانے اُردو ادب کو دیئے جن میں بیسویں صدی کا بہترین افسانہ ’زرد کتا‘ بھی شامل ہے۔ یہ افسانہ خالص علامتی افسانہ ہے۔اس میں بھی انھوں نے قصص اور حکایات کے ذریعہ معاشرہ کی چیرہ دستیوں ،سماج میں ہونے والی تبدیلیوں اور سوسائٹی کے انحطاط کو پراثر انداز میں پیش کیا۔

افسانہ کے آغاز میں افسانہ نگار نے لومڑی کے بچہ کا ذکر کیا ہے اور حضرت شیخ سے اس کی تفسیر چاہی اور اس بھید میں پوشیدہ راز کو جاننا چاہا تو حضرت شیخ نے جواباً کہا کہ اس کو نفس امارہ کہتے ہیں۔

نفس امارہ دراصل یہ وہ نفس ہے جو بدی کی ترغیب دلاتا ہے اور ہمشیہ برائی کی جانب کھینچتا رہتا ہے ۔جھوٹ ،دغا ،دجل ،فریب ،دھوکہ ،قتل وخون ،غرض جتنے اور جس قدر غیر انسانی بلکہ شیطانی وساوس ہیں ان کی طرف لے جانے والا یہ نفس ہوتا ہے۔اس لیے تلقین کی گئی ہے کہ اس نفس کا مقابلہ کرو اور اس کو ختم کردو۔ذوقؔ

دہلوی نے کہا تھا۔

نہنگ و اژدھا و شیر گر مارا تو کیا مارا
بڑے موذی کو مارا نفس امارہ کو گر مارا

چنانچہ لومڑی کے بچہ کا ذکر افسانہ کی ابتدا میں ہی ہوا ہے۔یہ لومڑی کا بچہ دراصل علامت ہے مکاری ،چالاکی اور دھوکہ بازی کی ،یہی لومڑی کا بچہ جو راوی کے حلق سے نکل کر نیچے گرتا ہے اور اسے کچل کر مار دینا چاہتا ہے گر کر جس قدر وہ کچلتا ہے اسی قدر اور اتنا ہی وہ پھول کر موٹا ہوتا جاتا ہے اور بالآخر ایک زرد کتا بن جاتا ہے۔

زرد کتا بھی ایک علامت ہے،زرد + کتا= زرد کتا۔

زردی دلالت کرتی ہے، یرقان زدگی پر، مدقوق زدگی پر اور بیماری پر،اسی طرح کتا بھی دال کرتا ہے ،گرسنگی پر، بے حیائی پر اور مردار خوری پر۔اس زرد کتا کے حوالے سے انتظار حسین نے آج کے معاشرے کی عکاسی کی ہے۔جس سے حقیقی انسان کو یہ تلقین ملتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس معاشرے یا معاشرے کی بے حیائیوں اور برائیوں سے بچاتے ہوئے زندگی گذارے۔

راوی نے حضرت شیخ سے مختلف انداز میں کئی تفاسیر اور حکایتوں کے ذریعہ اس افسانہ کو رقم کیا ہے۔

افسانہ کے آغاز میں کلام اور قلم کے متعلق یہ جملہ ملتا ہے

’’اے ابو قاسم خضری ،لفظ ،کلمہ اور لکھنا عبادت ہے‘‘

یہاں بڑا لطیف پیرایہ افسانہ نگار نے استعمال کیا ہے، کہ لفظ ،کلام کے ذریعہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے اور تحریر کے ذریعہ بھی۔ یہ میڈیم بنتا ہے زبان اور ہاتھ کا۔کہ اس کو مطہر ہو کر استعمال کرنے کی تلقین حضرت شیخ نے فرمائی۔حضور اکرم ﷺ نے مسلمان کی تعریف ان الفاظ میں بیان فرمائی

المسلم من سلم المسلمون باید یہ و لسانہ

مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ سے اور زبان سے دوسرے مسلمان کو سلامتی ملے۔یعنی وہ امن میں رہے۔ یہاں مسلمان دراصل انسانی معنوں میں لیں تو یہ کل بنی نوع پر صادق آتا ہے۔اس کے بعد افسانہ میں قرآن پاک کی یہ آیت (ترجمہ) ملتی ہے

’’پس افسوس ہے ان کے لیے بوجہ اس کے جو انھوں نے اپنے ہاتھوں سے
لکھا اور افسوس ہے ان کے لیے بوجہ اس کے جو کچھ وہ اس سے کماتے ہیں‘‘

کہ ہاتھ جس سے لکھا جاتا ہے اور کمایا جاتا ہے،یعنی کام کرنے کے لیے ہاتھ ہی معاون ہوتے ہیں ،یہی وہ ہاتھ ہیں جن سے خیر کا کام بھی لیا جا سکتا ہے اور شر کا بھی۔یہی ہیں جو دوسروں کی مدد بھی کرتے ہیں اور موجب آزار بھی بنتے ہیں، کہ شیخ اس ہاتھ سے پناہ مانگتے ہیں کیونکہ انجانے میں وہ دشمن سے مل گیا تھا۔

اب کہاں وہ خود احتسابی ہے جب کہ عامت علیم یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنا محاسبہ کرنا چاہیے۔حلال اور حرام میں تمیز کرنی چاہیے اور حرام کو حرام قرار دے کر حلال کو اپنانا چاہیے۔اتنی جراءت ہر شخص میں ہونی چاہیے۔

چنانچہ معاشرے کا معاشرہ اس دلدل میں دھنسا ہوا ہے اور وہ سچ اور جھوٹ کی تمیز سے عاری ہو گیا ہے اور اگر جانتا بھی ہے تو اقرار کرنے کی ہمت اور جراءت نہیں رہی۔مشرق جسے روحانیت سے تعبیر کیا جاتا ہے، بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کلام پاک میں جتنے انبیا کا ذکر آیا ہے وہ تمام کے تمام ایشیا میں یعنی مشرق میں نازل ہوئے ہیں۔اس طرح یہ روحانیت کا منبع ٹھہرتا ہے۔برخلاف اس کے مغرب مادیت سے تعبیر ہے، یہاں مشرق ومغرب کی جنگ نہیں بلکہ انسانی ضمیر میں جو مشرق ومغرب آباد ہیں اس کی جنگ ہے۔روحانیت اور مادیت جو ازل سے نبرد آزما رہے ہیں۔انسان مادیت کو کچل کر روحانیت کی طرف آئے تو ہی اس کی تطہیر ممکن ہے اور اس تطہیر کے لیے غیر معمولی مجاہدہ اور مشاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

معاشرے میں عالم، دانشور، درویش بزرگ اور شاعر کو ایک مقام حاصل ہے۔معاشرے میں کیا امیر اور کیا غریب، کیا حاکم اور کیا رعایا، سب ہی ان کے مرید اور معتقد ہوتے ہیں، ان کا احترام اور عزت کرتے ہیں اور جب یہ اپنے اپنے منصب سے روگردانی کرتے ہیں تو معاشرہ بے راہ روی کا شکار ہو جاتا ہے۔

چنانچہ زرد کتے کو علامت بناتے ہوئے انتظار حسین نے پورے معاشرے کی نبض پر ہاتھ رکھا اور حکایتی انداز میں پرتاثیر الفاظ میں بیان کیا مکالمہ دیکھیے

یا شیخ زرد کتا کیا ہے؟
فرمایا، زرد کتا تیرا نفس ہے
میں نے پوچھا، یا شیخ نفس کیا ہے؟
فرمایا، طمع دنیا، پستی ہے
میں نے استفسار کیا، یا شیخ پستی کیا ہے؟
فر پستی علم کا فقدان ہے
میں ملتجی ہوا، یا شیخ علم کا فقدان کیا ہے؟ فرمایا دانش مندوں کی بہتات ہے۔

یہاں سے ہر اس کیفیت کو سمجھانے کے لیے افسانہ نگار نے حکایتوں کا سہارا لیا اور بڑے جامع انداز میں ان چیزوں کو اور ان کیفیات کو پیش کر دیا جو آج ہمارے معاشرے کا گویا ناسور بنے ہیں۔بقول اسد اعجاز

جبکہ ہر فرد بشر کرنے لگے حکمت کی بات
اس میں کوئی شک نہیں اہل نظر خطرے میں ہے

تاریخ شاہد ہے کہ عالم دانش مند، درویش اور شاعر جو اپنے معاشرے کے رہنما ہوتے ہیں جن کے

علم اور دانش مندی، دعاؤں اور بصیرتوں سے اہل معاشرہ طمانیت وسکون محسوس کرتا ہے۔یہ کبھی بھی اہل زر کے دست نگر نہیں رہے، بلکہ بادشاہان اور امراء ان سے فیض حاصل کرتے رہے اور جب کبھی کبھی یہ ان امراء اور بادشاہان کے ٹکڑوں پر گرسنہ کتوں کی طرح ٹوٹ پڑنے لگے تو نہ صرف ان کی عزت جاتی رہی بلکہ معاشرہ بھی بے بس ہونے لگا کہ جب اتنی باعزت شخصیتیں ہی دولت وثروت، کرسی وعظمت اور شہرت وعزت کے پیچھے پڑ جائیں تو عام آدمی کیا کرے، کہ آج ہر بونا بھی خود کو نہ صرف قدآور سمجھ رہا ہے بلکہ باور کرانے میں کوشاں ہے۔چند سکوں کے عوض یہ عالم فتویٰ دینے پر، دانش مند غلط مشورہ دینے پر، درویش بے روح دعاؤں پر اور شاعر بلا وجہ قصیدہ خوانی پر مامور نظر آتے ہیں۔اب نہ عالم کا علم رہا اور نہ عمل، نہ دانشمند کی بصیرت رہی نہ دانشوری، نہ درویش میں قناعت رہی نہ شکرگذاری، اس طرح نہ شاعر کے کلام میں وہ گہرائی وگیرائی رہی نہ حکمت، بقول جگر

کاریگران شعر سے پوچھے کوئی جگر
سب کچھ تو ہے مگر یہ کمی کیوں اثر میں ہے

قرآن حکیم میں اللہ جل شانہ، فرماتے ہیں

''ہم نے زمین میں تمہارا ٹھکانہ بنایا اور اس میں سامان معیشت پیدا کیے
(مگر) تم کم ہی شکر ادا کرتے ہو''(۱۰:۷)

بقول مختار مسعود

''ناشکر گزاری کا نتیجہ بے ہنری کی صورت میں سامنے آتا ہے اور جہاں ناشکر گزاری اور بے ہنر جمع ہو جائیں وہاں منافقت کا دور دورہ رہتا ہے، جب اشراف کی حاجت ہی نہ رہے تو کوئی ان کی تلاش اور دل جوئی کیوں کرے۔ہنرور کی قدر ناشناسی سے بے ہنری کو فروغ ملتا ہے، کم ظرف کو سرآنکھوں پر بٹھایا جائے تو اشراف کی عزت میں کمی ہو جاتی ہے''

چنانچہ یہی زرد کتا یعنی نفس امارہ، انسان کی ہر راہ کے ہر موڑ پر سد راہ بنا کھڑا ہوتا ہے اور جب جب اس کی سرکوبی کرنا چاہے وہ اور قوی اور توانا بن کر سامنے آتا ہے اگر انسان عزم محکم اور مصمم ارادے سے اس کا مقابلہ کرے تو کوئی بعید نہیں کہ وہ پیچھا نہ چھوڑ دے۔مگر اس کے لیے شرط یہی ہے کہ بقول مختار مسعود

''دل تشکر کی طرف آئے، دماغ ہنر کی طرف اور زبان حق کی طرف مائل ہو''

غرض پورے افسانے میں گویا آج کا انسان، نفس امارہ میں غلطاں نظر آتا ہے اور اسی میں رُل رہا ہے اگر وہ کوشش کرے تو نفس امارہ سے نکل کر نفس لوامہ میں داخل ہو سکتا ہے اور پھر ترقی کرتا ہوا نفس مطمئنہ حاصل کر سکتا ہے جو انسانیت کی معراج ہے۔

یونس خان (سرگودھا)

قدیم چینی شاعری

قدیم دور سے ہی چین میں شاعری کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔روایتی طور پر اسے سِی، شِی اور کُو میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جب کہ نثری نظم کو فُو کہا جاتا ہے۔آج کے جدید دور میں مغربی انداز میں آزاد نظم بھی لکھی جا رہی ہے۔ روایتی طور پر تمام چینی شاعری مقفیٰ ہے،لیکن قدیم دور کے سارے ہم قافیہ متن کا شمار شاعری میں نہیں کیا جاتا۔مثال کے طور آئی چِنگ جس کے مصرعے ہم قافیہ تو ہیں لیکن انکا شمار شاعری میں نہیں کیا جاتا۔اس کا موازنہ قدیم یونان کے قبل از سقراط دور کے فلسفے سے کیا جا سکتا ہے جو کہ زیادہ تر شاعری کی صورت میں ہے۔(آئی چِنگ کا شمار دنیائے ادب کی چند اہم کتابوں میں ہوتا ہے۔آئی چنگ یا یِی جنگ کا مطلب ہے 'تبدیلیوں کی کتاب'۔ ہزاروں سالوں پر مشتمل چینی دانائی اس میں شامل ہے۔ یہ چینی فلسفے کے دونوں گروہوں کنفیوشس مت اور تاؤ مت کی مشترکہ اساس ہے۔)

شِی کا لفظی مطلب شاعری ہے جسے ہر طرح کی چینی شاعری کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اس میں سِی اور کُو بھی شامل ہیں لیکن عام طور پر اسکا اشارہ اس بہترین شاعری کی طرف ہوتا ہے جو تانگ دور میں اپنی انتہائی عروج پر تھی ۔ بعدازاں بیسویں صدی میں قدیم اور جدید شاعری میں امتیاز کے لئے قدیم شاعری کو جِی یو شِی اور نئی شاعری کو زِن شی کہا جانے لگا۔ابتدائی دور کی بہت ساری گمنام نظموں اور بعد میں آنے والے اُن شاعروں کی نظموں کو جنہیں شِی کے انداز میں لکھا گیا تھا کو گُو شی یعنی قدیم نظمیں کہا جاتا ہے۔ گُو شِی کے لکھاریوں پر مصرعے کے وزن اور قافیے کی پابندی کے علاوہ کوئی رسمی پابندی نہ تھی اس لئے اسے کہانی بیان کرنے کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔گُو شی بے شمار بڑے شاعروں نے لکھی ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ نمایاں نام لِی بائی یا لِی پُو کا ہے۔

پانچویں صدی عیسوی میں پابند نظم بھی کہی جانے لگی جسے تانگ دور میں انتہائی ترقی دی گئی اسے جِن تِی شِی یعنی شاعری کا جدید روپ کہا جانے لگا۔اس میں آٹھ مصرعوں کی نظم کو لُو شِی، رباعی کو جواِی جو اور اُن نظموں کو جن میں مصرعوں کی تعداد آٹھ سے بڑھ جائے کو پائی لُو کہا جانے لگا۔ وانگ وُوئی اور کُوئی ھاؤ اس نظم کے اولین معمار تھے جبکہ ڈُو فُو نے اسے انتہا پر پہنچا دیا۔جِن تِی شی کا ہر مصرع پانچ یا سات الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے جبکہ کبھی کبھی اسے چھ الفاظ میں بھی لکھا جاتا ہے۔

ھان دور (۲۰۶ ق م تا ۲۲۰ء) میں شی جِنگ نے ترقی کی اور شاعری فُو کی صورت متشکل ہوئی۔فُو ایک نظم ہے جو عام طور پر مقفیٰ ہوتی ہے لیکن اس میں نہ تو تعارفی کلمات ہوتے ہیں اور نہ ہی اختتامیہ جیسا کہ نثر میں ہوتا ہے۔فُو عام طور پر سوال اور جواب کی صورت میں ہوتی ہے۔ ہان دور میں چینی ماہر فلکیات، حساب داں اور موجد ژانگ ھنگ (۱۳۹ء تا ۷۸اء) کا شی کی ترقی میں بہت زیادہ ہاتھ تھا۔ ہان دور کے بعد لاوحدانیت کے دور میں رومانوی طرز کی شاعری جو کہ تاؤازم کے اثرات لئے ہوئے تھی نمودار ہوئی۔ فُو کے مصرعوں کی طوالت مختلف ہوتی ہے۔اسے عام طور پر پانچ یا پھر سات الفاظ میں لکھا جاتا ہے۔

تانگ دور (۶۱۸ء تا ۹۰۷ء) میں کلاسیکل شاعری اپنے نقطہ عروج پر تھی۔ابتدائی تانگ دور لُو شِی (پابند شعر)،آٹھ سطری نظم جس کی ہر سطر میں پانچ یا سات الفاظ ہوں، زِی (علم عروض کی سخت پابندی میں لکھا گیا شعر)،اور جُو اِی جو (تراشی ہوئی مقطوع نظم)، چہار سطری نظم جس کی ہر سطر میں پانچ یا سات الفاظ ہوں، کے حوالے سے جانا جاتا ہے۔اس دور کے دو ممتاز شاعر'لِی بائی' یا 'لِی پُو' (۷۰۱ء تا ۷۶۲ء) اور ڈُو فُو (۷۱۲ء تا ۷۷۰ء) ہیں۔لِی بائی اپنی شاعری کی تخیل پرستی (romanticism) کے حوالے سے ایک بڑا نام ہے جبکہ ڈُو فُو کی شاعری میں معاشرے کے لیے کنفیوشس کی اخلاقیات کا سخت قسم کے فرض کا احساس پایا جاتا ہے۔ بعد کے تانگ شاعروں نے بہت زیادہ حقیقت پسندی اور سماجی تنقید کو ترقی دی اور فنِ بیان کو شاندار بنا دیا۔بعد کے تانگ دور کا ایک مشہور شاعر بائی جووِی (۷۷۲ی تا ۸۴۶ء) ہے جس کی شاعری اپنے دور میں سانس ہی نہیں لیتی ہوئی محسوس ہوتی بلکہ معاشرے پر تنقیدی رائے زنی کرتی ہوئی بھی محسوس ہوتی ہے۔(یہی وہ دور ہے جب مشہور صحابی حضرت سعد ابنِ وقاص نے چین کا دورہ کیا اور سمجھا جاتا ہے کہ آپ کے دورے کے بعد یہاں اسلام کا آغاز ہوا)

بعدازاں کلاسیکل شاعری عظیم تانگ پیش رووٴں کے زیر سایہ خوب پروان چڑھی بعد کے دور میں بہت اچھے شاعر موجود تو رہے لیکن کوئی بھی شاعر بھی اس دور کی گرد تک بھی نہ پہنچ پایا اس طرح کلاسیکل شاعری کا طرز بیان بے معنی ہوتا چلا گیا۔اس دور میں شاعری کا ایک زیادہ لچک دار ذریعہ منظر عام پر آیا جسے سِی کہا جاتا ہے۔سِی ہر دل عزیز نغمات کی دھنوں پر لکھی گئی شاعری کی ایک شکل ہے۔جن میں کچھ کا آغاز وسطی ایشیا سے ہوتا ہے۔ جسے سونگ دور (۱۲۷۹ق م تا ۹۶۰ ق م) میں بھرپور طریقے سے ترقی دی گئی۔سونگ دور کا شاعر سُو شِی (۱۱۹۱ق م تا ۱۰۳۷ق م) نا صرف سی بلکہ شی اور فُو جیسی شاعری میں بھی خوب مہارت رکھتا تھا بلکہ نثر، خطاطی اور نقش کاری میں بھی خوب ماہر تھا۔سُونگ دور کے بعد سی زیادہ ادبی اور بناوٹی ہوتی چلی گئی اور آزاد نظم کی ایک نئی شکل کُو جس کی بنیاد ہر دل عزیز گیتوں پر رکھی گئی تھی ترقی پاتی چلی گئی۔ کُو سونگ دور میں خوب پروان چڑھی اور اپنی مقبولیت کی انتہاؤں کو چھونے لگی۔ کیونکہ اس نے یو آن دور میں ترقی پائی تھی اس لئے اسے یو آن کو بھی کہا جاتا ہے۔کُو کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ایک حصے کو سان کُو کہا جاتا ہے اس کا تعلق شاعری سے ہے

جبکہ دوسرے حصے کو ذَا کُو کہا جاتا ہے جس کا تعلق چینی غنائیہ یعنی اُوپیرا سے ہے۔ سان کُو اور سی کا شمار غنائیہ شاعری میں ہوتا ہے جسے کسی مخصوص دھن کو موزوں کرنے کے لئے لکھا جاتا ہے لیکن سان کُو سی سے اس حوالے سے مختلف ہے کہ یہ عام بول چال کے زیادہ قریب ہے۔ دھن کو مکمل کرنے کے لئے اس میں بہت سارے مہمل الفاظ بھی شامل کردئے جاتے ہیں۔ سی کے ہر مصرعے میں الفاظ کی تعداد مختلف ہوتی ہے۔

شِی جِنگ

چینی شاعری کا قدیم ترین دستیاب مجموعہ شِی جِنگ ہے۔ شِی کا مطلب ہے شاعری یا گیت اور جِنگ کا مطلب ہے تحریر یا کلاسک۔ اس طرح شی جِنگ کا مطلب ہے 'شاعری کی کتاب' اسے گیتوں، غزلوں، نظموں یا حمدوں کی بیاض بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس میں ۳۰۵ نظمیں ہیں جن میں کچھ ۱۰۰۰ ق م سے پہلے کی بھی ہیں۔ چینی متن میں ہر نظم کے لئے اس کے شارح ماؤ نے ہر نظم کے لئے ایک نمبر مقرر کیا جسے آج بھی بنیادی حوالے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس میں شامل بہت ساری نظموں کو شاید صدیوں میں اکٹھا کیا گیا لیکن زیادہ تر کام چُو کے دور تقریباً ۶۰۰ ق م میں ہوا۔ بعد کے ادوار میں شی چنگ کی بہت ساری تفسیریں اور توضیحات کی گئیں لیکن چینی ادب میں اسکا بہت زیادہ اور ناقابل تردید اثر رہا۔ شی جنگ نے کلاسیکل شاعری کے لئے اصول وضوابط اور طرزِ بیان کی حدیں مقرر کیں۔ اس بیاض کی تمام نظمیں چینی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں۔ کچھ نظمیں تو معاشرے کے مختلف طبقوں کے لوگوں کے جذبات اور احساسات کو بیان کرتی ہیں جبکہ کچھ ریاست کے معاملات اور واقعات کو بیان کرتی ہیں جبکہ کچھ نظمیں قدرت کے اصولوں کی تشریح کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس میں ایک سو کے قریب درختوں اور پودوں، نوے قسم کے جانوروں اور حشرات الارض، مختلف طرح کے آلات موسیقی، اسلحہ اور بارود عمارتوں، پوشاکوں اور خوراک وغیرہ کا ذکر موجود ہے۔

شِی چنگ کی ہر نظم کے مصرعے چار الفاظ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ عام طور پر انکا اختتامیہ ہم قافیہ ہوتا ہے۔ اکثر یہ چار الفاظ چار تصویری خاکے ہوتے ہیں۔ محبت اور شادی کے نغمے عام طور پر تین مصرعوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔

عام طور پر یہ نظمیں زرعی معاشرے کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں، محبت، شادی اور شاہی سلسلوں کے متعلق امور پر بحث کرتی ہیں۔ چُو دور چونکہ بنیادی طور پر زراعتی تھا اس لئے ان لوگوں کی خوبصورتی کا تصور زرعی پیداوار کے اضافے سے متعلق تھا۔ اس لئے نظمیں محبت کے غموں اور خوشیوں کے گرد گھومتی ہیں یا پھر بادشاہوں کی بہادری کے کارناموں کی داستان بیان کرتی ہیں۔ جبکہ باقی نظمیں جن کی ابتدا شاید لوک گیتوں سے ہوتی ہے روزمرہ کی آزمائشوں اور محبت، زندگی اور خاندان کے دکھوں اور تکلیفوں کے متعلق ہیں۔

بالعموم چینی شاعری سطحی طور پر بڑی سادہ ہے۔ مغربی تمدن پر شیکسپئر، ملٹن اور دیگر رومانوی شاعروں کی مرصع، مفصل اور مسجع شاعری کا اثر ہے۔ یہ تمدن بیانیہ طور پر اس سوچ کی طرف رغبت رکھتا

ہے کہ ان کی شاعری کو چند غیر معمولی طور پر ذہین لوگوں نے تخلیق کیا ہے جبکہ چینی تمدن شی چِنگ کی گمنامی کے زیر اثر ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ نظمیں عام انسانوں نے دوسرے عام انسانوں کے لئے لکھیں۔ روایتی شاعری کے اس مجموعے کا شمار دنیائے ادب کے قدیم ترین خزانے میں ہوتا ہے۔ شی چنگ کنفیوشس کے پیروکاروں کی مرتب کردہ پانچ کلاسیکل کتابوں میں سے ایک ہے۔ اسے بہت سارے نامور مصنفین نے اٹھارویں صدی سے اب تک انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے جن میں سے ایک ایزرا پاؤنڈ بھی ہے جس نے اسے 'دی کلاسک انتھالوجی ڈیفائنڈ بائی کنفیو شس' کے نام سے مرتب کیا۔

چُوسِی

چینی شاعری کا دوسرا قدیم ترین مجموعہ 'چُو سِی' یا 'چُو کے نغمے' ہے۔ یہ شاعری کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کا شمار قدیم دور کی پُر اثر شاعری میں ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر اس میں نظمیں ہیں جن کو نیم افسانوی کردار کُو یو آن (۲۷۸ ق م تا ۳۴۰ء) اور اس کے جانشین سُونگ یُو (۴۰۰ ق م) کے نام منسوب کیا گیا ہے۔ اس مجموعے میں نغمے قدیم دور کے شی جِنگ سے مختلف روایت کو ظاہر کرتے ہیں یہ زیادہ رومانوی اور غنائیت سے بھرپور ہیں۔ چُو سی اٹھاون مختصر اور چھ طویل نظموں پر مشتمل ہے۔ شی کے ہر مصرعے میں الفاظ کی تعداد چار ہوتی ہے جبکہ سی کے ہر مصرعے میں الفاظ کی تعداد مختلف ہوتی ہے۔

قدیم چینی شاعری سے انتخاب

لِی پور (نامعلوم شاعر) **مترجم: یونس خان**

(۱)

میرے بیٹے نے میرے لئے علیحدہ اِک کمرہ بنوادیا ہے
بھاپ دیتے ہوئے اِک پیالے میں، میرے بیٹے کی بیوی، میرے لئے
یخنی لائی ہے۔
ہائے اَفسوس! اس مہربانی سے میں ناخوش ہوں۔
کھردرے تختوں کا کمرہ۔۔۔۔۔۔ دوفُٹ چوڑا چھ فُٹ لمبا۔

(۲)

باجرے اور چاول کے درمیان
میرا راستہ سمندر کو جاتا ہے
میرے فرض اور میرے دل کے درمیان

کوئی سمجھوتا ہو نہیں سکتا۔
وہ کہتے ہیں، میرا دل میری بائیں طرف ہے
اور میرا فرض میری دائیں طرف:
میرا راستہ ہمیشہ سمندر کی طرف جاتا ہے
فرض اور خوشی کے درمیان۔

(۳)

شام سے میں نے گھاس میں بانسری کی آواز سُنی ؛
ایک کھوکھلی شاخ کاٹ کر، میں نے جواب میں، اُسے بجایا
اب کوئلوں کی تعداد دو سے زیادہ ہے ؛
وہ سمجھتے ہیں اپنے نامعلوم گانے والوں کے گانے کو۔

(۴)

کیا تم واقعی میرے گاؤں سے آئے ہو؟
تب تم تمام گاؤں کی خبروں سے آگاہ ہو گے!
کیا اب بھی سورج میری ریشمی کھڑکی سے تلواروں پر جھکتا ہے!
اور کیا اب بھی شام میں چیری حیا سے کھلتے ہیں؟

(۵)

کنول کے پھول جنوب کی طرف جھکتے ہیں
کہاں گیا میرا جیا
چاولوں کا اک پیالہ میرا منہ بھر سکتا ہے۔
لیکن کیا بھر سکتا ہے میرا بستر؟
میں ماسوا رونے کے کیا کر سکتا ہوں۔
کنول کے پھول شمال کی طرف جھکتے ہیں
نسیم سحر کے چلنے سے پہلے
کونسا مفتوح ایک بیوہ کا مول ہے
کون ایک حکمران کی اجرت ادا کرتا ہے
خراج کی صورت، جس طرح کی یہ ہے۔

کوائف اکبر حمیدی

مرتب: محمد زبیر ٹیپو

۱۔اصلی نام محمد اکبر

۲۔والد صاحب کا نام چوہدری منظور احمد

۳۔آبائی مقام معہ سالِ پیدائش فیروز والہ ضلع گوجرانوالہ۔اپریل1936ء

۴۔قبیلہ جٹ زمیندار

۵۔تعلیم ایم اے اردو، ایم اے پنجابی، فاضل اردو

۶۔شعبہ درس وتدریس، ریٹائر صدر شعبہ اردو1996ء

۷۔قیامات 1979ء تک گوجرانوالہ میں، 1980ء سے اسلام آباد

۸۔ایوارڈز بیسٹ ٹیچر، آؤٹ سٹینڈنگ ٹیچر

۹۔الف) **ادبی ایوارڈ** پرائیڈ آف پرفارمنس کی دو مرتبہ پیش کش ہوئی مگر دونوں مرتبہ ایک خاص حیثیت میں ڈال کر پیش کش ہوئی اس لیے دونوں مرتبہ پیش کش کو مسترد کر دیا۔

ب) بھارت سے ڈاکٹر کیول دھیر نے ساحر ایوارڈ کی پیش کش کی۔آپ موسم گرما کی شدت کے باعث نہ جا سکے، معذرت کر لی۔

ج) نارووال کی ایک تنظیم نے ان کی پنجابی کتاب ''لکّھی غزل پنجاب'' پر ایوارڈ کی پیش کش کی مگر موسم بہت گرم تھا، معذرت کر لی۔

۱۰۔ادبی کام شاعری۔انشائیہ۔خاکہ۔خودنوشت اور بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں سب کتابوں کی تعداد25 ہے۔

۱۱۔ دو کتابیں ''سنگت'' اور ''جدید اردو انشائیہ'' مرتب کیں۔پہلی گوجرانوالہ سے شائع ہوئی دوسری اکادمی ادبیات پاکستان نے 1991ء میں شائع کی۔

۱۲۔رفیق سندیلوی نے ''اکبر حمیدی کا فن'' کتاب مرتب کی جس میں مشاہیر کے ان کے لیے لکھے ہوئے تقریباً 40 مضامین ہیں۔لکھنے والوں میں ڈاکٹر وزیر آغا، سیّد ضمیر جعفری، جوگندر پال، پروفیسر نظیر صدیقی، ڈاکٹر سیّد عبداللہ، شہزاد احمد، منشا یاد، ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر نوازش علی، ڈاکٹر رؤف امیر، اسلم سراج الدین، محمود احمد قاضی، حیدر قریشی، ڈاکٹر توصیف تبسم اور بہت سے شامل ہیں۔

اکبر حمیدی کی کتب

شاعری

۱۔لہو کی آگ 1970ء
۲۔آشوبِ صدا 1977ء
۳۔تلوار اُس کے ہاتھ 1986
۴۔شہر بدر 1991ء
۵۔دشتِ بام ودر 1996ء
۶۔ہر اِک طرف سے 2001ء
۷۔لکّھی غزل پنجاب 1997ء
۸۔شورِ بادباں 2007ء

انشائیے

۹۔جزیرے کا سفر 1985ء
۱۰۔تتلی کے تعاقب میں 1990ء
۱۱۔جھاڑیاں اور جگنو 1998ء
۱۲۔پہاڑ مجھے بلاتا ہے 2003ء
۱۳۔اشتہاروں بھری دیواریں2007ء

خاکے

۱۴۔قدِ آدم 1993ء
۱۵۔چھوٹی دنیا بڑے لوگ 1999ء

تنقید

۱۶۔مضامین غیب 1993ء
۱۷۔اس کتاب میں 1995ء

خودنوشت

۱۸۔جست بھر زندگی 1999ء

کالم

۱۹۔ریڈیو کالم 1987ء

بچوں کا ادب

۲۰۔عقلمند بچوں کی کہانیاں 1999ء (ایوارڈ یافتہ NBF)
۲۱۔عمل سے زندگی بنتی ہے 2002ء

۲۲۔بہت شور سنتے تھے 2002ء (مطبوعہ یونیسکو)

۲۳۔ارسطو اور نوجوان سکندرِ اعظم 2003ء ۲۴۔وطن دوستوں کی کہانیاں 2003ء

۲۵۔نئے خیالوں کی نئی کہانیاں 2003ء (ایوارڈ یافتہ NBF)

متعلقات: **اکبر حمیدی کا فن**

مرتب: **رفیق سندیلوی**

اکبر حمیدی کی کتب پر مشاہیر کے چالیس مضامین کا مجموعہ۔

☆☆☆☆

اکبر حمیدی صاحب اُن ادبا میں شامل ہیں جو اپنی زندگی تخلیق کاری کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔تخلیق کاری کا یہ وظیفہ شہرت یا دولت کے حصول کے لیے نہیں ہوتا' اپنی ذات کے اظہار کے لیے ہوتا ہے۔اظہار کے ہزار پیرائے ہیں مگر ادب کے حوالے سے اظہار ایک مشکل کارکردگی کا اعلامیہ ہے۔اکبر حمیدی نے اس معاملے میں جس ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا ہے اس کی اہمیت کا احساس اُن کے بیشتر معاصرین کو ہے۔مثلاً انشائیہ نگاری کے میدان میں انہوں نے ایک منجھے ہوئے کھلاڑی کی طرح خود کو اپنی منزل پر مرتکز کیے رکھا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک اچھی اننگز کھیلنے میں کامیاب ہوئے ہیں انہوں نے سو سے زیادہ انشائیے تخلیق کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔گویا انہوں نے انشائیوں کی سینچری بنانے کا اعزاز حاصل کیا ہے جو معمولی بات نہیں ہے۔اُن کے متعدد انشائیے ایسے ہیں جو اردو انشائیہ کے کڑے سے کڑے انتخاب میں یقینی طور پر شامل ہوں گے۔۔۔۔شاعری میں بھی اُن کی لگن قابل تعریف ہے۔انہوں نے غزل میں سہل ممتنع کا انداز اختیار کر کے نہ صرف سادہ زبان کی بے پناہ قوت کا احساس دلایا ہے بلکہ سامنے کے معاملات اور سانحات کو اپنے لہو میں شامل کر کے دردمندی کی ایک رو کو بھی جنم دیا ہے جو قارئین نے بہت پسند کی ہے۔اُن کی نظر عصر کی جملہ کروٹوں پر محیط ہے اور وہ ایک ایسے وژن کی نمود کے لیے سرگرم نظر آتے ہیں جو اعلیٰ شاعری کا امتیازی نشان ہے۔اکبر حمیدی نے ایک دلچسپ سوانح عمری بھی لکھی ہے جو اُن کے تخلیقی عمل کے محرکات کو نظروں کے سامنے لانے میں کامیاب ہے۔اس خود نوشت سوانح عمری کے مطالعہ سے غالب تاثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ اکبر حمیدی ایک محبت کرنے والے انسان ہیں۔میری دعا ہے کہ وہ اپنے ادبی مشن کو آخری دم تک جاری رکھنے میں کامیاب ہوں۔

(**ڈاکٹر وزیر آغا** کے تاثرات)

ڈاکٹر رشید امجد (راولپنڈی)

اکبر حمیدی کا مجموعہ شہر بدر......ایک جائزہ

''تلوار اُس کے ہاتھ'' اور ''شہر بدر'' کو اگر اکبر حمیدی کی شاعری کے دو بنیادی استعارے تصور کر لیا جائے تو احتجاج اور ردّعمل سے شہر بدری تک کی کہانی مکمل ہو جاتی ہے۔اکبر حمیدی کے ردّعمل، احتجاج، بغاوت اور پھر شہر بدری کو کئی سطحوں پر دیکھا جا سکتا ہے کیونکہ اس کی شاعری پورے سیاسی، سماجی رویوں کے ساتھ اپنی پہچان کراتی ہے۔

ایک فرد اور ذات کے حوالے سے یہ بغاوت اور احتجاج دوسروں کی ذہنی بالادستی سے انکار ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اپنے طور پر جینے کا حق مانگنا اور اس حق کا تحفظ کرنا ہے۔اکبر حمیدی کے یہاں فرد کی تکمیل اس کی ذات اور حقوق کے حوالے سے ہوتی ہے یعنی اس کا فرد اپنی ایک انا رکھتا ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ اس کا ایک نظریۂ حیات ہے جس کے ساتھ اس کی وابستگی خالصتاً جذباتی ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ کوئی دوسرا اسے اس سے دستبرداری پر مجبور کرے۔ایسی صورت میں اس کے یہاں ایک شدید مخالفانہ ردّعمل پیدا ہوتا ہے اور سمجھوتے یا مصلحت کی بجائے وہ مقابلے کی راہ اختیار کرتا ہے۔یہ راہ اُس کے یہاں احتجاج کی لہر کو جنم دیتی ہے جو دفاعی بھی ہے اور اپنا تحفظ کرنے کا حق بھی۔اس کے ساتھ ہی غلط کی نشاندہی اور اس پر وار کرنے کا رویہ بھی ہے جس کی وجہ سے اس کا ردّعمل مثبت ہو جاتا ہے یعنی اس کی تلوار اور وار صرف شخصی دفاع یا تحفظ کے لیے مخصوص نہیں رہ جاتا بلکہ فرد سے آگے نکل کر اجتماع کے دفاع اور تحفظ کا ذمہ لے لیتا ہے۔اس سے اس کے لہجہ میں ایک تیقن اور حق گوئی پیدا ہو جاتی ہے:۔

خامشی جرم ہے جب منہ میں زباں ہو اکبر ۔۔۔ کچھ نہ کہنا بھی ہے ظالم کی حمایت کرنا

عجب سی صورتِ حالات میں ہوں ۔۔۔ میں جیسے غیر کی بارات میں ہوں

راستہ مل جائے گا ہمت اگر کرتے رہیں ۔۔۔ ٹھہر جانے سے تو بہتر ہے سفر کرتے رہیں

بہت مشکل ہے ان حالوں میں جینا ۔۔۔ مگر میں زندگی پر تُل گیا ہوں

وفاداری بشرطِ استواری میرا مسلک ہے ۔۔۔ ہدف ہوں بے وفائی کا وفا کے گیت گاتا ہوں

شبوں کے حبس میں خود سانس بھی لیتا ہوں مشکل سے ۔۔۔ صبا بن کر دلوں کے آنگنوں میں مسکراتا ہوں

کافر ہوں تو کافر سا ہے کردار بھی میرا — مومن ہے تو مومن سا وہ کردار دکھائے

اور اس طرح کے دوسرے شعروں میں جدوجہد کے ساتھ زندگی کرنے کا رویہ صرف فرد کی حد تک نہیں بلکہ یہ جہاد مجموعی معاشرتی برائیوں کے خلاف ہے، یوں اس کے یہاں احتجاج کی دوسری سطح سماجی ہو جاتی ہے۔ مجموعی معاشرتی صورتِ حال اور طبقاتی اونچ نیچ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بداعمالیوں کی نشاندہی اور برائیوں کے خلاف یہ آواز ایک قومی شعور کی علامت ہے۔ معاشرے کا عمومی زوال وہ پس منظر ہے جس سے اکبر حمیدی کا احتجاج پیدا ہوتا ہے۔ وہ معاشرتی تشدد اور طبقاتی جبر کے خلاف آواز اٹھاتا ہے اور ایک مثالی معاشرے کا خواب بھی دیکھتا ہے۔ اپنے اس خواب کی وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتا ہے:۔

''جہاں انسان سچ بول سکے۔ امن سے زندگی بسر کر سکے، اپنے نظریات کے ساتھ باعزت زندگی گزارنے کی آزادی ہو، جہاں اسے معاشرتی انصاف حاصل ہو۔ میرا خواب ظلم، نفرت اور ہر قسم کے استحصال سے پاک ایک ایسا ہی معاشرہ ہے **(شہر بدر)**

اس خواب کے حوالے سے وہ ایک کومٹڈ نظریاتی شاعر بنتا ہے لیکن اس نے سیاست کو براہِ راست اپنا موضوع نہیں بنایا اور نہ ہی نظریے کے نام پر وضاحتی یا پروپیگنڈہ شاعری کی ہے۔ اس کے سارے کلام میں واضح طور پر نچلے طبقوں سے ہمدردی کا جذبہ موجود ہے لیکن اُس نے اس جذبے کو ایک فکری احتجاج کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اس احتجاج کی چند لہریں ملاحظہ کیجیے:۔

شہر اب صالحیں کی نذر ہوا — سب وطن دوست ہیں کٹہروں میں
اونچی آواز میں جو بولتا ہوں — زندگی کر رہا ہوں بہروں میں
وہ کیسا خواب دیکھا جا رہا تھا — یہ کیا تعبیر ہوتی جا رہی ہے
ہمالیہ پہ بھی گزریں تو ریزہ ریزہ ہو — وہ جبر و صبر کے عالم جو ہم پہ گزرے ہیں
بیٹھ رہنے سے کچھ نہیں ہوگا — ظلم سہنے سے کچھ نہیں ہوگا
خون بہنے سے کچھ بنے تو بنے — اشک بہنے سے کچھ نہیں ہوگا
ناچ اٹھو لہو پہن کر بھی — خاک پہنے سے کچھ نہیں ہوگا

ان اشعار میں جبر کے خلاف کچھ کر گزرنے کی جو خواہش ہے وہ اکبر حمیدی کی زندگی سے عملی وابستگی کا اظہار کرتی ہے کہ وہ صرف خواب دیکھنے والا شاعر نہیں بلکہ اس خواب کی تعبیر کے حصول کے لیے عمل کی دعوت بھی دیتا ہے۔ عمل کی یہ دعوت جس مجموعی معاشرتی زوال کے پس منظر میں ابھری ہے۔ اس کا پھیلاؤ صرف ایک معاشرے تک محدود نہیں بلکہ تیسری دنیا کے اکثر ممالک اسی سماجی معاشرتی بلکہ اقتصادی بدحالی کا شکار ہیں۔ اس حوالے سے اکبر حمیدی کا فکری دائرہ خاصا وسیع ہے۔

اکبر حمیدی کے احتجاج کی تیسری لہر سیاسی تشدد سے جنم لیتی ہے، آج کے دَور میں کسی بھی سماجی زوال کو سیاست سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ایک بُرا سیاسی نظام اکثر معاشرتی خرابیوں کا سبب ہوتا ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک جن میں پاکستان بھی شامل ہے اپنی آزادی کے بعد جس زوال پذیر سیاسی نظام کی جکڑ میں آئے ہیں اُس نے اقتصادی بدحالی ہی کو جنم نہیں دیا بلکہ ایک فکری کم مائیگی کا احساس بھی پیدا کیا ہے۔ اس کے علاوہ سیاسی تشدد نے ایک مجموعی بدلحاظی کو بھی جنم دیا ہے جس میں بالادست کی طرف سے کمزور کے حقوق غصب کرنے کے ساتھ ساتھ اُسے ایک ذہنی غلامی میں مقید کرنا ہے۔ گویا نو آبادی نظام نے آزادی کے بعد ایک نئی طرح کے نو آبادی نظام کو پیدا کیا ہے جس کا تشدد اور جبر پہلے سے بھی زیادہ ہے۔ فرق یہ ہے کہ پہلے یہ تشدد دکھائی دیتا تھا اب بظاہر آزادی ہے لیکن درونِ خانہ وہی حیلے ہیں پرویزی۔ اکبر حمیدی نے بڑے واضح انداز میں اس جبر و تشدد کے خلاف آواز اٹھائی ہے اور جا بجا اپنے ردّ عمل کا اظہار کیا ہے:۔

خامشی جرم ہے جب منہ میں زباں ہو اکبر — کچھ نہ کہنا بھی ہے ظالم کی حمایت کرنا

حالات کڑے ہیں تو اتارو لہو صدقہ — جینا ہے تو جاں نذر گزارو مرے پیارو
باقی ہے ابھی رات عدو گھات میں اکبر — جاگو مرے پیارو مرے پیارو مرے پیارو

پکڑے گا نہیں کیا کوئی ظالم کی کلائی — دروازے سے کیا لونگ نہ لشکائے گا کوئی
کیا اب یہاں لوگوں کی زبانیں نہ کھلیں گی — الفاظ سے ہونٹوں کو نہ مہکائے گا کوئی

پہلے تو گلستاں کو ہی تقسیم کیا تھا — اب وہ گل و بلبل کو بھی تقسیم کریں گے
اکبر مجھے لگتا ہے کہ اس موسم گل میں — آئینِ گلستاں میں وہ ترمیم کریں گے

کیسے اُس شہر میں لوگوں کا بسیرا ہووے — اس تسلسل سے جہاں دیو کا پھیرا ہووے

مجھے لکھو وہاں کیا ہو رہا ہے — یہاں تو پھر تماشا ہو رہا ہے
وہ اپنے ہاتھ سیدھے کر رہے ہیں — ہمارا شہر الٹا ہو رہا ہے
وہ مہربان ہے گاؤں کے سادہ لوحوں پر — قلیل رزق میں عمریں طویل دیتا ہے
دلیل دینے سے مطلب، اپیل سے حاصل — یہاں تو فیصلے اس کا وکیل دیتا ہے

آخری دو شعروں میں جس خوبصورتی سے سیاسی فکر اور نظام عدل پر طنز کیا گیا ہے وہ اکبر حمیدی کے باشعور ہونے کی دلیل ہے۔ اسے اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ اس کے وطن عزیز میں لوٹ کھسوٹ کا ایک بازار گرم ہے اور ایک مخصوص طبقہ اس کی دھرتی کی رعنائیوں کو بے رونق کرنے پر تلا ہوا ہے۔ وہ اس طبقہ کو طنز کا نشانہ بھی بناتا ہے اور اس کی سرگرمیوں سے پردہ بھی اٹھاتا ہے لیکن تمام تر سماجی بے انصافیوں اور ظلم و ستم کی فضا کے باوجود اپنی زمین کے ساتھ اس کی محبت اور وفا دیدنی ہے:

میں شاعر ہوں وطن کا اور وطن کے گیت گاتا ہوں وطن کے ذرے ذرے کو میں آنکھوں سے لگاتا ہوں
مقدس ہے مجھے ماں کی طرح یہ سرزمیں اکبر سرِ مغرور اپنا اس کے قدموں میں جھکاتا ہوں

سرمئی مرگلہ ہے نظروں میں میری نظروں میں کوہِ طور نہیں

وہ اعتماد جو اپنی زمیں سے پاتا ہوں نہ کوہِ طور نہ دریائے نیل دیتا ہے

کعبۂ جاں ہے مجھے اکبر وطن غیر کے محلوں سے اپنا گھر بھلا

وطن اس کے لیے ماں کا درجہ رکھتا ہے اور وطن کے دُکھ اور درد اس کے لیے ماں کے دکھ ہیں چنانچہ وطن سے اس کی وابستگی ایک سچے جذبے کی دین ہے:۔

شکائت اہل خانہ سے ہے ماں کو چھوڑ دوں کیسے میں دروازے تلک جاتا ہوں جا کر لوٹ آتا ہوں

ایسے میں تجھے چھوڑ کے جاؤں گا نہیں ماں جو گزرے گی جھیلوں گا مگر گھر میں رہوں گا

یہ دونوں شعر اس کی حب الوطنی ہی کی دلیل نہیں اس کے منشور کا اعلان بھی ہیں کہ اس کی جدوجہد وطن کے اندر ان عوامل کے خلاف ہے جنہوں نے اس لیلائے وطن کے چہرے کو داغدار بنا دیا ہے۔ یہ جذبہ اس کے اندر پیدا ہونے والی مایوسی کو بھی دور کرتا ہے اور اسے ایک حوصلہ بھی عطا کرتا ہے:۔

بہت مشکل ہے ان حالوں میں جینا مگر میں زندگی پر تُل گیا ہوں

اور یہی حوصلہ ایک خوش آئند مستقبل کی نوید بھی ہے:۔

چمکیں گے مرے دیس پہ خوشیوں بھرے سورج دھرتی کے لیے امن کی سوغات بھی ہوگی
جب شہر ہے تو شہر کا قانون بھی ہوگا انساں ہیں تو پھر ان میں مساوات بھی ہوگی
موسم ہی نہیں بدلیں گے اس سال میں اکبر تبدیل یہاں صورتِ حالات بھی ہوگی

اکبر حمیدی کی غزل کے یہ وہ رخ تھے جنہیں خارجی عوامل سے تعلق ہے اور اسی سے اس کے یہاں احتجاج کی ایک مؤثر آواز پیدا ہوئی ہے لیکن اس کی شعری کائنات صرف اسی رخ تک محدود نہیں۔ اس میں محبوب اور زلفِ محبوب کے قصے بھی ہیں اور دل گدازی کے سامان بھی۔ چند شعر دیکھیے:

میں پیار کی مالا تو پرو لایا ہوں اکبر اُس بت کے ہیں معیار مگر اور طرح کے

یہ سوچ کر کبھی ترکِ وفا نہیں کرتا کہ بے وفا کو بہت اعتبار ہے مجھ پر

کس سے ہم حالِ دل کہیں اکبر اور ہی رنگ بزمِ یار کے ہیں

تجھے اے رونقِ محفل خبر کیا رہا ہے کوئی تنہا اس برس بھی

تمہاری مانگ سے روشن ہوا ہے سب جنگل تو راستہ بھی کہیں درمیاں سے نکلے گا

اُس گلبدن کو دیکھتے رہنے کا شوق ہے جس نے مری نگاہ کو گل رنگ کر دیا

اکبر حمیدی کی شعری دنیا ایک مکمل انسان کی دنیا ہے جس میں خارج اور باطن دونوں پہلو شامل ہیں اور احتجاج کے ساتھ ساتھ جذبوں کی کوملتا بھی موجود ہے جو اس کی فکر کو خارجی سطح سے بلند کر کے باطنی گہرائیوں میں لے جاتی ہے اور ایک نئی دنیا کے اسرار جاننے کی تمنا اسے نئے رنگوں سے آشنا کر دیتی ہے۔ یوں اس کے یہاں جدت اور ترقی کا ایک سنگم ہوتا ہے۔ جمیل ملک نے درست کہا ہے کہ:۔

''اکبر حمیدی کی غزل ادب کی ترقی پسند اور جدید تحریکوں کے زیر اثر پروان چڑھتی ہے۔ شاعر نے ان دونوں تحریکوں کے بہترین عناصر کو سمیٹ کر اپنا غزلیہ پیکر تراشا ہے اور پھر اس میں اپنے مخصوص رنگ و آہنگ سے ایک پل بنا کر ان دونوں تحریکوں کے درمیانی فاصلوں کو کم کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔''

یہ توازن اکبر حمیدی کی فنی گرفت کا غماز بھی ہے۔ اس کی غزل کے فنی پیکر میں سانس لیتے امیجز بھی ہیں اور خیال کی گہرائی بھی۔ اسے لفظوں کے دروبست کا سلیقہ ہے۔ ''تلوار اُس کے ہاتھ'' سے ''شہر بدر'' تک اس کا فنی اور فکری سفر نئی کروٹوں سے آشنا ہوا ہے اور شہرِ غزل میں اس نے اپنے نام کا اعتبار قائم رکھا ہے۔ وزیر آغا کے لفظوں میں:

''اکبر حمیدی نے مضامین کی ندرت اور اسلوب کی تازہ کاری سے غزل کی مسلسل آبیاری کی ہے۔''

یہ مسلسل سفر اور اس کی عطا اکبر حمیدی کی انفرادیت بھی ہے اور اس کی شاعرانہ عظمت بھی۔

شہزاد احمد (لاہور)

اکبر حمیدی اور جدید غزل

نئی غزل کی ابتدا تو پاکستان بننے کے چند برس بعد ہی ہو گئی تھی، مگر اس نئے رجحان کا مطالعہ کرنے کے لیے کوئی باقاعدہ تنقیدی روایت موجود نہیں تھی، نظم کی تنقید کی ابتدا حلقہ اربابِ ذوق میں ہو چکی تھی، مگر غزل کے سلسلے میں تنقیدی معیارات وہی تھے جو کلاسیکل غزل کے حوالے سے مقرر کیے جا چکے تھے۔ ان میں البتہ داخلیت اور خارجیت کی اصطلاحوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ خارجیت کو اکثر اوقات معروضیت بھی کہا جاتا تھا اور کبھی کبھی خارجیت اور حقیقت پسندی کی اصطلاحات کو ایک دوسرے کی جگہ بھی استعمال کرنے سے دریغ نہیں کیا جاتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ شاعر کا اپنی ذات کے بارے میں گفتگو کرنا اگر جرم نہیں ہے تو ایسا رویہ بھی نہیں ہے جس پر شاعر فخر کر سکے، اس نئے رویے کے پیچھے ایک پوری تحریک کام کر رہی تھی۔ جو کرداریت کے مکتبِ فکر کی طرح باطن اور فرد دونوں کی نفی کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھی۔ لہٰذا کہا گیا کہ جو لکھنے والے اس اصول سے متفق نہیں ہیں ان کی تحریروں کو تحریک کے رسالوں میں جگہ نہ دی جائے۔ بس وہ دن اور آج کا دن دریا نے الٹے رُخ بہنا شروع کر دیا اور پھر ایسی داخلیت کو شاعری کی بنیاد بنایا گیا جو کسی فلسفے یا مابعد الطبیعیات کی پابند نہیں تھی۔ چنانچہ جدید غزل اپنے مزاج کے لحاظ سے ایک ایسا رویہ ہے جو فرد کی شکست و ریخت کو اہمیت دیتا ہے اور کسی قسم کے مربوط نظامِ فکر کی پابندی قبول نہیں کرتا۔ مگر جس طرح وجودی فلسفے کی بہت سی صورتیں ہیں۔ اسی طرح جدید غزل کو ہم کسی خاص انسانی تعصب تک محدود نہیں رکھ سکتے۔

دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ جس فرد کو موضوعِ گفتگو بنایا گیا ہے۔ وہ معاشرے کا فرد ہے اور ان کے دکھ سکھ کا تعلق بیرونی دنیا سے بہت گہرا ہے۔ لہٰذا ہم خارجیت یا حقیقت پسندی کو جدید غزل سے الگ نہیں کر سکتے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ جدید غزل نے خارجی حوالے کو محض دنیا نہیں سمجھا فرد کا ذاتی مسئلہ قرار دیا ہے۔ اب فرد محض باطن نہیں ہے بلکہ ایک ایسا مرکزی نقطہ ہے جس کا تعلق بیک وقت ظاہر اور باطن کے ساتھ ہے۔ اس رویے کو ہم جینس (Janns) کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ جینس ایک رومن دیوتا ہے جس کے دو منہ ہیں ایک منہ سے وہ باہر کی طرف دیکھتا ہے اور دوسرے سے اندر کی طرف:

زندگی جاگ کے ہی سب نے گزاری اکبرؔ فرق یہ ہے کوئی اندر کوئی باہر جاگے

چنانچہ المیہ تو یہی ہے کہ زندگی کو عام طور محض ایک چہرے سے دیکھا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ محض آدھی سچائی ہے اور آدھی سچائی جھوٹ سے کہیں زیادہ خطرناک شے ہے۔ اب تک میں نے جتنی بات کی ہے وہ مجموعی طور پر نئی غزل کے حوالے سے کی ہے۔ مگر اکبر حمیدی کے مجموعہ کلام ''تلوار اُس کے ہاتھ'' کو پڑھتے ہوئے مجھے بار بار اس کا خیال آیا ہے۔ میں کوئی نقاد تو ہوں نہیں کہ مجھے گفتگو کا آغاز کرنے کے لیے کسی باقاعدہ thesis کی ضرورت ہو جس طرح ہم راہ چلتے کوئی نئی بات سوچ لیتے ہیں یا غزل کا کوئی شعر لکھ لیتے ہیں۔ اسی طرح شعر کی تنقید کو بھی خود پر وارد ہونے کا انتظار کیا جا سکتا ہے۔

داخلیت اور خارجیت کی جس بحث کا ذکر میں نے آغاز میں کیا تھا۔ اس کا ایک پرتو اکبر حمیدی کی شاعری میں موجود ہے، اگرچہ وہ خارجیت کے بہت دلدادہ نظر آتے ہیں مگر باطن سے انکار کہیں نہیں کرتے بلکہ ان کی شاعری میں خارج کو بھی باطن کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش بار بار نظر آتی ہے۔ یہ عرض کر دوں کہ جدید شاعری میں بھی بہت سے لوگ باطن کو خارج کے حوالے سے دیکھتے ہیں ان کے ''مَیں'' کا بنیادی طور پر معاشرتی حوالہ ہے باطنی نہیں۔ اکبر حمیدی کے ہاں جینس کے دونوں رویے موجود ہیں۔ خارج ان کے لیے بہت اہم سہی، آخر گھر، بیوی بچے نوکری اور دوستانے کس کو عزیز نہیں ہوتے۔ مگر یہ زندگی کا وہ رُخ ہے جو شاعری کا موضوع تو بنتا ہے شاعری کی بنیاد نہیں بنتا۔ بنیادی حقیقت تو شاید وہی باطن ہے جسے ہم ''مَیں'' کا نام بھی نہیں دے سکتے۔ کیونکہ ''میں'' دنیاوی تشخص ہی کا ایک reference ہے۔

دو دماغی نظریے کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ ''میں'' بائیں دماغ کا حصہ ہے اور شاعری کی آماجگاہ داہنا دماغ ہے۔ یہ دو الگ الگ منطقے ہیں۔ مگر ان کو ایک اکائی میں پرونے ہی کا نام شاعری ہے۔ مگر اس لمحۂ گریزاں کا حصول کیا کیا ہوتا ہے۔ بقول اکبر حمیدی:

میں ہوں کہ ابھی نشست بدلنے نہیں پاتا اور شاخ بدل جاتا ہے منظر کا پرندہ

معاشرتی اور انفرادی، دونوں سطحوں پر انسان کے لیے ذات (Self) کا مسئلہ ہمیشہ اہم رہا ہے، آخر یہ 'میں' کون ہے جس کے حوالے سے ہر شخص گفتگو کرتا ہے۔ ہم اسے 'انا' یا 'انانیت' کے مسئلہ کا بھی نام دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کوئی شخص کئی برس کے بعد اپنے فلسفی دوست کو ملنے گیا، مگر فلسفی اسے پہچان نہ پایا۔ دوست نے کہا کہ میں وہی تمہارا پرانا دوست ہوں جو ایک زمانے میں دن رات تمہارے ساتھ رہا کرتا تھا۔ فلسفی بولا، ''تم وہ شخص کیسے ہو سکتے ہو جبکہ سات برس کے دوران انسانی جسم کا ہر خلیہ تبدیل ہو جاتا ہے۔''

میں کہتا ہوں، 'یہ میرا ہاتھ، میرے پاؤں ہیں، میرا سر ہے' لیکن اگر مرے جسم کے یہ حصے نہ ہوں تو میرا کوئی وجود نہیں، یعنی وہ آواز باقی ہی نہیں رہتی جو اپنے آپ کو 'مَیں' کہتی ہے۔ اس مسئلے کا کوئی ایک جواب تو

ممکن نہیں مگر اتنا کہا جا سکتا ہے کہ نفسیات اس مقام سے آغاز کرتی ہے جہاں 'میں' کو بطور حقیقت تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ یہ نفسیات کے دائرۂ کار ہی میں نہیں ہے کہ وہ 'میں' کے بارے میں سوال اٹھائے، اگر ایسا کوئی سوال اٹھایا جائے تو یہ مابعد النفسیات یا مابعد الطبیعات کے زمرے میں آتا ہے۔

فرائیڈ اور اس کے مکتبِ فکر نے اس 'مَیں' کے لیے ایغو (Ego) کی اصطلاح کو استعمال کیا تھا، پھر اس اصطلاح کو استعمال کرنے کے بعد فرائیڈ نے کہا تھا کہ ایغو تین سفاک آقاؤں کے نرغے میں ہے، ایک طرف تو اس کی جبلی خواہشات ہیں جو ہر قیمت پر اپنی تسکین چاہتی ہیں، دوسری طرف اس کا سوپر ایغو یا ضمیر ہے، جو انسان کے اندر معاشرے کی نمائندگی کرتا ہے اور ایغو کو بات بات پر لعن طعن کرتا رہتا ہے۔ تیسری سمت میں بیرونی دنیا ہے جو فرد کو اپنی مرضی پر چلانا چاہتی ہے، لہٰذا بیچارہ ایغو ہر وقت ان تینوں آقاؤں کو خوش کرنے کی الجھن میں پڑا رہتا ہے۔ اس صورتِ حال کو بدل دینا تو اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا مگر وہ اس صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے یا اپنے آپ کو مطمئن رکھنے کے لیے اپنے لیے کچھ واہمے (illusion) تشکیل دے لیتا ہے اور پھر کوشش کرتا ہے کہ وہ ان تینوں سے جان چھڑا کر اپنی بنائی ہوئی 'واہماتی' دنیا میں زندگی بسر کر سکے۔

یہ تینوں آقا اس قدر بے رحم ہیں کہ واہمہ بنائے بغیر گزارا ہی نہیں ہے۔ آپ سردیوں میں گرم کپڑے پہنتے ہیں تاکہ اس سردی کا احساس نہ ہو جو باہر موجود ہے۔ گرمیوں میں جب دھوپ بہت تیز ہو تو سیاہ عینک لگا لی جاتی ہے تاکہ گرمی کی شدت کم محسوس ہو۔ واہمے بھی لباس اور عینک کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کے وجود سے بیرونی دنیا میں کوئی تبدیلی نہیں آتی مگر ان کو استعمال کرنے والا انسان خود کو محفوظ اور مطمئن محسوس کرتا ہے۔

اسی حوالے سے معاشرتی سطح پر دوسرا اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ انسان اپنے لیے کس کردار کا انتخاب کرتا ہے، ایک مکالمہ نویس کا فلم پروڈیوسر سے جھگڑا ہو گیا تو اس نے کہا ''بادشاہ سے لے کر فقیر تک اور غنڈے سے لے کر شریف تک سب کے مکالمے لکھ سکتا ہوں مگر میں نے اپنے لیے شریف آدمی کے مکالموں کا انتخاب کیا ہے۔'' شکسپیر نے بھی زندگی کو ایک سٹیج کہا تھا جس میں تمام انسان اپنے کردار ادا کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاعر بھی اپنے لیے کسی سماجی کردار کا انتخاب کرتا ہے اور اس کی ساری شاعری اس کے حوالے سے ہوتی ہے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس کردار کے اندر دو چیزیں ضرور موجود ہوتی ہیں۔ ایک تو اس مثالی شخصیت کا عکس جو شاعر کا مقصود ہوتی ہے اور دوسرے تینوں آقاؤں کے بارے میں بہت حد تک آرزومندانہ (Wishful) رویہ۔

کہتے ہیں کہ حلقہ اربابِ ذوق کے جلسوں میں میراجی ہر نظم سننے کے بعد اس کے پس منظر میں چھپی ہوئی کہانی کو تلاش کیا کرتے تھے، اگر یہ کہانی دریافت ہو جائے تو یہی نظم کی کلید ہے، یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس کے بغیر نظم کو سمجھنا میراجی کے نزدیک ممکن نہیں تھا۔ اب اگر اس حوالے سے اکبر حمیدی کی شاعری کو دیکھا جائے تو ایک دلچسپ صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے جس کردار کے حوالے سے شاعری کی گئی ہے وہ جیتے جاگتے اکبر حمیدی سے

بالکل مختلف تو نہیں ہو سکتا مگر قدرے مختلف ضرور ہو سکتا ہے۔ دوسرے ہمعصر شعرا کی طرح اکبر حمیدی کے مسائل بھی موجود صورتِ حال سے متعلق ہیں۔ ترقی پسند اسے معاشی صورتِ حال کے حوالے سے بیان کرنا پسند کریں گے۔ حال ہی میں جو مدافعتی ادب کی لہر چلی ہے اس سے متعلق لوگ ممکن ہے اسے جبر کے خلاف مدافعت کہنا پسند کریں، مگر اس کہانی کا مرکزی کردار میرے خیال میں ایک ایسا بے گناہ شخص ہے جسے خواہ مخواہ معتوب کیا جا رہا ہے۔ اس بات سے ہمارا کوئی تعلق نہیں کہ اصل واقعہ کیا ہے۔ ادب کے طالب علم کی حیثیت سے ہم صرف اس رویے تک ہی محدود رہ سکتے ہیں جو شاعر نے شعر لکھتے وقت اختیار کیا ہے اور شاعری ویسے بھی حقیقت کے محض ظاہری رخ کا اظہار نہیں ہوتی۔ اسے کچھ نہ کچھ اپنے باطن میں بھی اترنا ہوتا ہے۔

اکبر حمیدی نے جب مجھ سے 'شہر بدر' کا دیباچہ لکھنے کے لیے کہا تھا تو میں نے عرض کیا تھا کہ آپ جیسے خودشعوری کے حامل شاعر کو خود ہی لکھنا چاہیے۔ جب آدمی کے دونوں پاؤں سلامت ہوں تو اسے دوسرے کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر چلنے کی کیا ضرورت ہے لیکن شاید یہ بھی انسانی جبلت ہے کہ وہ محض اس لیے دوسرے کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر چلتا ہے کہ اسے اپنی تنہائی کا احساس نہ ہو۔ جب میں نے ان کی کتاب کا مطالعہ کیا تو مجھ پر کھلا کہ ان کے مجموعے میں کچھ باتیں ناگفتنی بھی ہیں، وہ معاشرتی سطح پر ایک گھٹن اور دباؤ کا احساس رکھتے ہیں، اور اس کو محض ایک واہمہ بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ واہمہ تو بار بار ٹوٹتا ہے مگر گھٹن کی یہ فضا ایک تسلسل کے ساتھ سارے مجموعے میں موجود ہے۔ اس کا حل کسی ایک فرد کے پاس نہیں ہے۔ ہم سب کو مل کر ہی معاشرے میں تازہ ہوا کے لیے کھڑکیوں کو کھولنا ہو گا، یاد رکھیے جب ہم دوسرے کے لیے کھڑکیاں بند کرتے ہیں تو خود ہمارے لیے بھی آکسیجن کم ہو جاتی ہے۔

اکبر حمیدی صاحب کا خیال ہے کہ ان کی حالیہ شاعری زیادہ وسعت کی حامل ہے۔ شاید اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ ان کے تخلیقی مسائل میں اضافہ ہوا ہے۔ شاعری کی سطح تک تو یہ اچھی بات ہی کہی جا سکتی ہے، جیسے کوئی ندی زیادہ بڑی ندی کی صورت اختیار کر لے۔ مجھے یہ بھی لگتا ہے کہ اس ندی کی روانی میں کچھ شدت بھی آ گئی ہے مگر میری یہ بھی خواہش ہے کہ یہ ندی کناروں ہی کے اندر بہے، انسان کو حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے بنیادی رویے کو ضرور پیشِ نظر رکھنا چاہیے کیونکہ یہی اس کی پہچان ہے۔

جس فضا کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے، وہ ایک ایسا تناظر ہے جو دوسروں سے کہیں زیادہ اکبر حمیدی میں موجود ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انہوں نے دوسرے تمام معاملات زندگی کو نظر انداز کیا ہے۔ ان کے ہاں محبت، دوستی، رفاقت، رقابت غرض ہر طرح کے مضامین جا بجا نظر آتے ہیں اور غزل کے حوالے سے یہ کوئی ضروری بھی نہیں ہے کہ ہر چیز کے بارے میں الگ انفرادی رویہ رکھا جائے۔ آخر ہم ایک اجتماع کا حصہ بھی تو ہیں جس میں کبھی کبھی ہم اپنی پہچان کو خود ہی گم کر دینا چاہتے ہیں۔ مثلاً قومی شاعری میں یہ رویہ خاص طور پر ابھر کر

سامنے آجاتا ہے۔اکبر حمیدی نے ماں کے متعلق جو شعر کہے ہیں وہ بھی ذات کی نفی ہی کا اظہار ہیں۔

مجھے لگتا ہے کہ گفتگو قدرے طویل ہوگئی ہے۔لہٰذا اب میں آپ کے اور شہر بدر کے درمیان حائل نہیں رہنا چاہتا۔جاتے جاتے اس کتاب کے چند اشعار سنانا چاہتا ہوں۔یہ میری اپنی پسند ہے، آپ کی پسند مجھ سے مختلف بھی ہوسکتی ہے۔

عجب ہنستی ہوئی آنکھیں ہیں اس کی — مجھے وہ خوش نظر اچھا لگا ہے

رات پر رات یہاں آئے چلی جاتی ہے — اب کے تو آپ ہی آئیں تو سویرا ہووے

نظر میں پھرتا ہے اک ایک دوست کا چہرہ — کہ رات آئی مجھے دشمنوں کی بستی میں

کوئی نادیدہ انگلی اُٹھ رہی ہے — مری جانب اشارہ ہو رہا ہے

یہ سوچ کر کبھی ترکِ وفا نہیں کرتا — کہ بے وفا کو بہت اعتبار ہے مجھ پر

ستارے جاگتے تھے ساتھ جس کے — وہ اب راتوں کو تنہا جاگتا ہے

وہ تو سورج کا استعارہ ہے — بجھتا جائے دیے جلاتا جائے

خامشی جرم ہے جب منہ میں زباں ہو اکبرؔ — کچھ نہ کہنا بھی ہے ظالم کی حمایت کرنا

☆☆☆

اُردو شاعری میں محبت کی محرومی ایک محبوب موضوع کی حیثیت سے روایت کا درجہ رکھتی ہے۔محبت دراصل خواہش کے مُشتعل ہونے کا نام ہے۔اگر یہ خواہش محض جسم کی دنیا زیر و زبر کرنے پر مستعد رہے تو ایسی شاعری وجود میں آتی ہے جو معاملہ بندی کے مضامین سے اُوپر نہیں اُٹھتی۔مگر جب خواہش جسم کے ''آگ کے دریا'' میں ڈوبے بغیر خیریت کے ساتھ روح کے ساحل پر پہنچنے میں کامیاب ہو جائے اور ایک روحانی تڑپ کی صورت میں ڈھل جائے تو نتیجۃً تخلیق ہونے والی شاعری نئے نئے مضامین کے تنوع سے لبریز ہوتی ہے، اگرچہ اس شاعری میں ہجر ایک مرکزی حوالے کی صورت موجود ہوتا ہے۔خواہش کی مقدم الذکر صورت نواب کے آوارہ، بگڑے بیٹے کی طرح ہے کہ جلد ہی پامال ہو جاتی ہے، جبکہ مؤخر الذکر صورت میں خواہش وہ درویش ہے، جو متعدد دنیوی چیزوں سے بے نیاز ہے اور جو سیماب پا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس درویشانہ شاعری میں جذبہ یا خواہش زندہ تو رہتے ہیں (یعنی محبوب کے وصل کی تمنا جواں رہتی ہے) مگر Lust کی طرح کسی ایک کھونٹ سے نہیں جُڑے ہوتے۔بلکہ زندہ اور توانا ہستی entity کی طرح دیگر اشیا سے اپنے روابط دریافت کرتے ہیں، اور اس عمل میں شاعر کا جمالیاتی احساس اُس کا راہنما ہوتا ہے۔چنانچہ شاعر جمالِ یار کے حوالے سے کائنات میں حُسن کے کتنے ہی زاویے دریافت کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔اردو شاعری میں محبت کی محرومی یا ہجر کے موضوع کو اِس زاویۂ نظر سے بھی دیکھنا چاہیے۔ (**اکبر حمیدی کی غزل** مضمون از **ناصر عباس نیر** سے اقتباس)

حیدر قریشی

اکبر حمیدی کے دو نئے مجموعے

ہر اک طرف سے اور شورِ بادباں

اکبر حمیدی اس عہد کے ایک اہم تخلیق کار ہیں۔مجموعی طور پر مختلف اصناف ادب میں ان کی بیس کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ان کی خاکہ نگاری، انشائیہ نگاری، تنقید نگاری اور خودنوشت، ہر صنف اپنی اپنی جگہ اکبر حمیدی کی تخلیقی صلاحیتوں کی گواہی دیتی ہے۔شاعری ان کے اظہار کا سب سے پہلا پیمانہ تھا، اسی لئے ان کی سب سے پہلی پہچان بھی شاعری ہے۔زیرِ تبصرہ مجموعہ اکبر حمیدی کا چھٹا شعری مجموعہ ہے۔اس سے پہلے ان کے پانچ شعری مجموعے ''لہو کی آگ''، ''آشوب صدا''، ''تلوار اس کے ہاتھ''، ''شہر بدر'' اور ''دشتِ بام و در'' شائع ہو چکے ہیں۔یہ شعری مجموعہ اکبر حمیدی کے شعری ارتقا کو بہت عمدگی سے ظاہر کرتا ہے۔بنیادی طور پر اکبر حمیدی غزل کے شاعر ہیں مگر اس مجموعہ میں ۶۵ غزلوں کے ساتھ ان کی سترہ نظمیں بھی شامل ہیں اور چند ہائیکو بھی۔ہائیکو چونکہ تین مساوی الوزن مصرعوں مشتمل ہیں، اس لیے میں انہیں ثلاثی کے زمرہ میں شمار کرتا ہوں۔اکبر حمیدی کی خوبصورت غزلوں اور نظموں کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی بجائے اس مجموعہ سے چند اچھے اشعار کا ایک انتخاب اور ایک نظم پیش کر دینا بہتر سمجھتا ہوں۔آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

چلتا ہے غیر برہنہ تلوار کی طرح — اس کی گلی ہے کوفے کے بازار کی طرح

پیچیدہ بھی، حسیں بھی، طرح دار بھی بہت — دنیا ہے اس کی زلفِ گرہ دار کی طرح

اگر کسی بڑی مسند پہ جاگزیں ہوتا — تو پورا عہد مِرا حاشیہ نشیں ہوتا

یہ خود شناسیاں اور ناشناسیاں اکبرؔ — مِری نظر میں ہیں دونوں عذاب اندر کا

رکھنا قدم جما کے ہوا تیز ہے بہت
منہ آنا مت ہوا کے، ہوا تیز ہے بہت

جس کے بھی دوست ہوئے باعثِ تکریم ہوئے
ہم کھرے سکے ہیں جیبوں میں کھنکتے جاویں

ڈرائنگ روم میں کچا گھڑا رکھا ہوا ہے
کہ ہم نے سوہنی سے رابطہ رکھا ہے
بڑے شہروں میں چھوٹے لوگ آ کر بس گئے ہیں
اسی خاطر تو ہم نے دل بڑا رکھا ہوا ہے

کب تلک ملتا رہے گا اسے قسمت کا لکھا
خلقتِ شہر تو محنت کا ثمر چاہتی ہے
زندگی خواب کے گھر میں نہ کٹے گی اکبر
اب یہ لڑکی درودیوار کا گھر چاہتی ہے

عنایت اور ہی جانب ہے اس کی
ہمیں تو بس گزارے دے رہا ہے
جنوبی ایشیا کو جیسے اکبر
یہ دن کوئی ادھارے دے رہا ہے

مجھ کو نظر کی وسعت میرے شہر نے دی
میں تو گوجرانوالہ میں لاہور ہوا
اکبر سادہ سا دیہاتی لڑکا تھا
اک شہرن کے عشق میں اور سے اور ہوا

یہ کیا ضرور تھا مجھ سے بھی وہ وفا کرتے
نہیں تھی مجھ سے محبت انہیں تو کیا کرتے
ستم گروں سے تو کچھ بھی کہا نہ لوگوں نے
سبھی نے مجھ سے کہا آپ حوصلہ کرتے

جانے کب کیا، کیسی صورت پیش آئے
کچھ دانائی، کچھ نادانی ساتھ چلے

ترے بدن کو کبھی جو ہمارے ہاتھ لگے
کہیں سے پھول کہیں سے ستارے ہاتھ لگے

دعائے زیست کی تکرار بات بات میں ہے
کہ خوفِ مرگ کہیں اس کی نفسیات میں ہے
کبھی لبوں، کبھی آنکھوں سے گفتگو کرنا
وہ تن بدن سے شریک اپنی لفظیات میں ہے

غزلوں کے یہ چند اشعار اکبر حمیدی کی غزل اتنا عمدہ تعارف ہیں کہ اس کے بعد کسی تنقیدی رائے کی

ضرورت ہی نہیں رہتی۔نظمیں اکبر حمیدی نے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے کہی ہیں۔اسی لیے ان نظموں میں بھی غزل کا مزاج ملتا ہے۔بطور نمونہ ایک نظم ''مبارکیں ہوں'' ملاحظہ کیجئے۔

مبارکیں ہوں، مبارکیں ہوں، مبارکیں ہوں
کہ پچھلی آدھی صدی کی مانند اس برس بھی
تمام منصب، تمام اعزاز، سارے اکرام
حضورِ والا تبار ہی کے لیے ہیں مخصوص
میں اس برس بھی ہوا ہوں حاضر
سلامِ اخلاص عرض کرنے
دعائیں دینے، نیازمندی کے سارے جذبے
حضورِ عالی میں نذر کرنے

خدا کرے ایسے سارے موسم
جو پچھلی آدھی صدی سے یونہی رُکے کھڑے ہیں
اسی طرح سے رُکے رہیں سب
تمام منصب، تمام اعزاز، سارے اکرام
حضورِ والا تبار ہی کے لیے ہوں مخصوص
حضور کے آہنی شکنجے سے وقت باہر نکل نہ پائے
نکل نہ پائے، سنبھل نہ پائے، بدل نہ پائے

اسی طرح سے ہر اک برس مَیں
مبارکیں عرض کرنے آؤں
مبارکیں ہوں، مبارکیں ہوں، مبارکیں ہوں،

اکبر حمیدی پختہ غزل گو ہیں۔ان کے ہاں فکر و خیال اور جذبات کی آمیزش سے ایسی دلآویز کیفیت پیدا ہوتی ہے جو قاری کو دیر تک اپنے اثر میں رکھتی ہے۔ان کے اظہار میں سادگی اور بے ساختگی سے کھلی کھلی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔اس مجموعہ کے فلیپ پر ڈاکٹر وزیر آغا، سیّد ضمیر جعفری، ڈاکٹر وحید قریشی، فخر زماں، شہزاد احمد، ظفر اقبال، آفتاب اقبال شمیم اور اسلم سراج الدین کی آراء درج ہیں۔ان آراء سے اکبر حمیدی کی شاعری کے کئی

خوبصورت پہلو مزید روشن ہوتے ہیں۔ سید ضمیر جعفری اکبر حمیدی کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''وہ ایک ایسا فنکار ہے جس کو حال کا قانون قید اور مستقبل کا مؤرخ بری کرتا ہے۔'' ظفر اقبال کی یہ رائے بھی صائب ہے۔ ''اکبر حمیدی نے جو خاص کام کیا ہے، وہ روزمرہ کے بعض ایسے الفاظ جو جدید اردو غزل میں بالعموم استعمال نہیں کیے جاتے، اس نے بڑی مہارت سے برت کر غزل کی فضا کو بھی کسی حد تک تبدیل کرنے کی سعی کی ہے۔ یہ اجتہادی رویہ جدید غزل کا منفرد ذائقہ بھی متعین کرتا ہے۔''

(تبصرہ مطبوعہ **جدید ادب** جرمنی جولائی تا دسمبر ٢٠٠٣ء)

اردو شاعری میں اکبر حمیدی کا تازہ اور ساتواں شعری مجموعہ ''شورِ بادباں'' پیشِ نظر ہے۔ یہ مجموعہ اکبر حمیدی کی غزل گوئی کے سفر کی اب تک کی کہانی سناتا ہے۔ پہلے والی روانی کے ساتھ انہوں نے اس بار کچھ ایسے اوزان میں بھی غزلیں کہی ہیں جن میں انہوں نے پہلے غزل نہیں کہی۔ اس سے قادرالکلامی تو ظاہر ہوتی ہے لیکن اکبر حمیدی کی غزل کا جو ایک مخصوص بہاؤ تھا وہ غائب ہو جاتا ہے۔ تاہم ایسی غزلیں کم تعداد میں ہیں۔ عمومی طور پر اکبر حمیدی اپنے مخصوص انداز میں اپنی غزل کا سفر طے کر رہے ہیں۔ اس سفر میں ان کے مزاج کی خوش خیالی اور خیالات کی پرواز دونوں کا ارتقا دیکھا جا سکتا ہے۔ چند اشعار سے میری بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

کس روز یہ اصرار ہمارا نہیں ہوتا — کچھ اور بھی، اتنے میں گزارا نہیں ہوتا

غزل گلی سے کئی آسماں گزرتے ہیں — زباں سنبھال کے اہلِ زباں گزرتے ہیں

کچھ اتنی تیز ہے رفتارِ عالم — زمانے بے نشاں ہونے پہ آئے

کہاں تک ذکرِ قیس و کوہکن کا — بہت ہم نے بھی ٹکریں ماریاں ہیں

جان پیاری ہے تو بس چلتے چلے جاؤ میاں — کیوں کھڑے ہو یہ درِ یار نہیں ہے بھائی۔ اکبر حمیدی

زور و زر کا ہی سلسلہ ہے میاں — لفظ کو کون پوچھتا ہے میاں

یہاں تلک بھی ہمیں پائمال ہونا تھا — ہمیں مثال، انہیں بے مثال ہونا تھا

عجیب زاویے اس کی جیومیٹری میں ہیں — کہیں خطوط، کہیں دائرے نکلتے ہیں

عقل بھی، جذبہ بھی، دونوں مرے ساتھی ہیں مگر
بعض اوقات میں دونوں کو اٹھا دیتا ہوں

سابقہ شعری مجموعوں کے حوالے سے ابھی تک اکبر حمیدی کے ہاں پیش آمدہ صورتحال پر صبر و تحمل، دعا، اور ایمان کی مضبوطی کا تاثر ملتا تھا لیکن اس مجموعہ میں وہ اپنے ان رویوں سے کچھ آگے بڑھے ہیں اور برملا کہنے لگے ہیں:

کب تلک وقت ٹالنا ہوگا — راستہ تو نکالنا ہوگا

عقل بھی عشق کرنا جانتی ہے — خود کو بس اعتدالنا ہوگا

اگلی نسلوں کو کفر سازی کے
چکروں سے نکالنا ہوگا

''شورِ بادباں'' میں اکبر حمیدی نے کسی بڑے شاعر، ادیب یا نقاد سے کوئی پیش لفظ یا دیباچہ نہیں لکھوایا اور اس سلسلے میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دیباچے کتاب کے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں کیونکہ پھر قارئین دیباچے کے افکار کی روشنی میں ہی کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اکبر حمیدی کا موقف وزن رکھتا ہے۔ انہوں نے اپنی وضاحت میں جس نکتے کو ابھارا ہے یقیناً غور طلب ہے۔ یوں بھی ایک طویل عرصہ تک شاعری کرنے کے بعد اکبر حمیدی اب اپنی شعری عمر کے اس حصہ میں ہیں جہاں ان کا نام ہی ان کی شاعری کا دیباچہ، پیش لفظ، معتبر حوالہ اور سب کچھ ہے۔ ادب کے سنجیدہ قاری کے لیے اتنا حوالہ ہی بڑا حوالہ ہے کہ وہ اکبر حمیدی کی شاعری کو پڑھ رہا ہے۔

''شورِ بادباں'' سے مزید چند اشعار پیش کر کے کتاب کا یہ تعارف مکمل کرتا ہوں۔

اس شہر میں اب گھر سے نکلنا ہوا مشکل — ملنا نہیں، رستہ بھی بدلنا ہوا مشکل

اب جان لیا ہے تو بہلنا ہوا مشکل — جن وقتوں میں انجان تھا، آساں تھا بہلنا

اب آگ دکھاؤ بھی تو جلنا ہوا مشکل — جل اُٹھتے تھے ہم آتشیں نظروں سے بھی اکبر

ضد نہ کر آج پہ اتنی اکبر — ورنہ وہ کل سے مکر جائے گا

کچھ سال تو آئین بنانے میں لگے ہیں — باقی کے ترامیم کرانے میں لگے ہیں

ان حربوں سے وہ اونچا اڑا سکتا تھا خود کو — جو حربے اسے مجھ کو گرانے میں لگے ہیں

''شورِ بادباں'' اکبر حمیدی کی مجموعی شعری شخصیت کے تاثر کو مزید گہرا کرتا ہے!

(تبصرہ مطبوعہ **جدید ادب** جرمنی جنوری تا جون ٢٠٠٦ء)

سیّد ضمیر جعفری

چند قدم......قدِ آدم کے ساتھ

''قدِ آدم'' قد آور شاعر اور ممتاز انشائیہ نگار پروفیسر اکبر حمیدی کے خاکوں کا مجموعہ ہے۔

میرا بیٹا احتشام پاکستان آرمی میں خدمت کر رہا ہے۔ وہ جب کمیشن کے انٹرویو بورڈ کے سامنے گیا تو چیئرمین نے اُس سے سب سے پہلے وہی گھِسا پٹا سوال کیا کہ ''اے نوجوان تُو فوج میں کیوں شامل ہونا چاہتا ہے''۔ احتشام نے جواب دیا ''سر میں پیدا ہی ایک فوجی بیرک میں ہوا تھا۔'' اور اسی سوال کے جواب پر اس کا انٹرویو ختم کر دیا گیا۔

مجھے بھی اپنی بات شروع کرنے کے لیے فوجی پس منظر کے باعث انگریزی کی ایک عسکری کہاوت ہی یاد آ رہی ہے کہ: "Well begun half the battle is won"

یعنی جنگ کا اچھا آغاز...... جنگ کی نصف کامیابی کی ضمانت ہوتا ہے۔ سو ہم اس کتاب کے نام ''قدِ آدم'' کے صوری حُسن اور صوتی نغمگی اور معنوی بلاغت پر ہی پھڑک اٹھے کہ یہ نام مصنف کی تخلیقی توانائی کا آئینہ دار ہے۔

پچھلے کچھ عرصہ سے اردو ادب کی جتنی نئی کتابیں ہماری نظر سے گزریں ان میں سے اکثریت شاعری، سفرناموں اور خاکہ نگاری پر مشتمل ہیں۔ اس پر یوں لگا کہ جس طرح جدید جنگ ''میزائیلوں'' کی بارش ہو کر رہ گئی ہے اسی طرح اردو ادب میں ان دنوں غزلوں، سفرناموں اور خاکوں کی بارش برس رہی ہے۔

''قدِ آدم'' میں چند خاکے مصنف کے اپنے بزرگانِ خاندان کے ہیں اور چند خاکے اس عہد کی چند نامور شخصیتوں کے۔ اکبر حمیدی نے اپنے بعض غیر معروف احباب کو بھی اس قافلۂ محبت میں فراموش نہیں کیا۔

صاحبو...... تکنیکی بحث مجھے نہیں آتی۔ فالتو عقل ہم میں تھی ہی نہیں۔ یوں بھی تنقید کو میں الا ماشا اللہ دوسروں کی ٹانگوں پر دوڑنے کی ڈرل (Drill) سمجھتا ہوں۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس کتاب کو بیحد دلچسپ اور تخلیقی ادب کا ایک اعلیٰ نمونہ پایا۔ اس کے مطالعے کی فرصت مجھے سفر میں ملی اور اس کی چھاؤں میں سارا سفر سوارت ہو گیا۔ کتاب میں ہمارے وزرا کی ''گونا گوں مصروفیات'' کی طرح واقعی اتنے بوقلموں مناظر تھے کہ مجھے کھڑکی سے باہر جھانکنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔

میں اکبر حمیدی کو جانتا تو ہوں مگر اتنا نہیں کہ ان کا اپنا خاکہ اتار لاتا۔ ان سے ہماری ملاقاتیں رواروی میں گوشت پوست کی گرمی سے محروم............ کاغذی سوشل کانٹریکٹ بلکہ محض کانٹیکٹ (Contact) تھے۔ میری محرومی کہ جب ان سے ملنے کا وقت آیا تو ہمارا اپنا ہی وقت ختم ہو رہا تھا۔ بہرحال جب بھی ان سے ملاقات ہوئی دنیا سمٹتی ہوئی محسوس ہوتی۔ اس شخص کو از سرتا پا اخلاص و محبت کا ''سورج مکھی'' پایا۔ اس جیسے لوگوں سے مل کر اس صداقت پر بھی یقین تازہ ہو جاتا ہے کہ محبت کے لیے خوبصورت چہرے کی شرط لازمی نہیں۔ اس کا سب سے بڑا سرمایہ اس کی شاعری کی جاگرتی سندرتا اور شکتی کی طرح......اس کی وسیع انسانیت اور عالی ظرفی کا حُسن ہے۔ مجھے اس سے اپنی ایک جھڑپ یاد آ رہی ہے۔ ہمارے رسالہ...... ''چہار سو'' میں ان کی ایک تحریر جس کی چند سطور پر مجھے اس سے تبادلۂ خیال کرنا تھا دفتری ہڑبونگ میں چھاپے خانے میں چلی گئی۔ اس پر مجھے اپنے ادارتی اور اخلاقی فرض کی تکمیل میں ایک معذرت نامہ شائع کرنا پڑا جوان کو ناگوار گذر سکتا تھا اور یقیناً ناگوار گذرا بھی ہوگا مگر میں نے اس شخص کی پیشانی پر کبھی ہلکا سا بل بھی نہ دیکھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس جھڑپ میں فتح اس کی ہوئی کہ درگزر اور معاف کر دینے کا ظرف انسانی عظمتوں کی بنیادی فضیلتوں میں سے ہے۔

مجھے یہ خاکے نہ نفسیاتی لگے نہ تجزیاتی، محاکاتی، وارداتی وغیرہ۔ میرے نزدیک ان کی نوعیت تذکراتی، تبصراتی اور واقعاتی ہے مگر مصنف کے کمال فن نے ان کو جو افسانوی ''تڑکا'' لگایا ہے اس سے یہ تحریر رسمی سوانحی یا دستاویزی نہیں رہی بلکہ ایک تخلیقی ادب پارے میں ڈھل گئی ہے اور ذاتی اور واقعاتی کینوس کے ان خاکوں میں............ اس شخص کی نگاہ کی براقی اور اظہار کی بلاغت نے خصوصیت کے حصار میں عمومیت کی ایک عجیب وسعت اور کشادگی پیدا کر دی ہے۔ اس نے پیڑ گنوانے سے نہیں بیر کھلانے سے سروکار رکھا مگر بیر کچھ اس طرح سینت سینت کر کھلائے کہ قاری کی نظر پیڑ کی جڑ تک جا پہنچتی ہے۔ مجھے اکبر حمیدی کے خاکے کچھ اپنے محترم حکیم محمد سعید صاحب کی طرح لگے کہ وہ گورنر تھے مگر گورنر معلوم نہیں ہوتے تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر وحید قریشی، جناب مظفر علی سید، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، عذرا اصغر، جناب منشا یاد، ڈاکٹر رشید امجد اور انہی کی طرح کی دوسری نامور شخصیتوں کے خاکوں کو پڑھوا لینا کچھ مشکل نہیں کہ کم لوگ ان کو خود ان کی ''بھاپ'' پر پڑھ جاتے ہیں لیکن اکبر حمیدی نے جس گرفت کے ساتھ اپنے قارئین کو اپنے بزرگانِ خاندان کے ساتھ پڑھوا لیا ہے اس کمال کی جتنی داد دی جائے کم ہوگی۔ اس حصے کو انہوں نے اس قدر جاذبِ توجہ بنا دیا ہے کہ اب نہ صرف اکبر حمیدی پر خاکہ لکھنا آسان ہو گیا ہے بلکہ ان کے خاندان میں رشتے ناطے کی بات طے کرنی بھی سہل معلوم ہوتی ہے۔ تفنن برطرف کتاب کے اس حصے میں اکبر حمیدی نے پنجاب کے دیہات کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر کشی کی ہے۔ میرے اہل وطن کی موجودہ نسل اس کو غور سے پڑھ لے کہ کچھ عرصہ بعد یہ زمین شاید اس زندگی سے محروم ہو جائے۔

ان خاکوں نے اس حقیقت کی صداقت کو بھی آشکارا کر دیا کہ طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں اور معمولی لوگ ہی دراصل غیر معمولی لوگ ہوتے ہیں۔ تحریر کی یہ طاقت اور تاثیر اس غیر معمولی تخلیقی صلاحیت کا ثمرہ ہے جس نے اس کی غزل کو ایک منفرد لہجہ اور ایک انوکھا پیرہن بخشا ہے۔ وہ شاعری جو چناروں کو چاندنی اور روز دیکھی چیزوں کو اجنبی پاتی ہے۔

خاکہ نگاری میں اکثر لوگ جارحیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ دوسروں کی خامیوں کو دیکھ کر ''عقلمند'' ہونا آسان ہوتا ہے۔ اکبر حمیدی بڑی حد تک اس سے دامن بچا کر گزر رہا ہے۔ تاہم وہ خدوخال بیان کرتے کرتے قاری کو تحریر کے قدرتی بہاؤ میں............کردار کے اندر بھی گھما پھرا لاتا ہے۔ ایسے خاکے کوئی ایسا خوش سرشت ہی لکھ سکتا تھا جو سائے میں بھی روشنی کو دیکھ لے اور جو مرحوم افراد اور زندہ لوگوں......اور آئندہ پیدا ہونے والے انسانوں کے درمیان ایک حیاتیاتی تسلسل اور ہمدردانہ ہم آہنگی کا یقین کے ساتھ ادراک رکھتا ہو۔ اس نے اپنے کرداروں کی خامیوں کو ''ٹیلی ویژن'' کے خبرناموں کی طرح نشر نہیں کیا مگر یقین کیجیے کہ بعض مقامات پر دوسرے اصحاب کی خوبیاں پڑھتے پڑھتے میری اپنی کئی خامیاں میرے اندر سے اٹھ اٹھ کر آوازیں دیتی رہیں کہ ''قبلۂ عالم آداب عرض ہے!'' بلکہ مجھے اپنی بعض ایسی غلطیوں کی نشاندہی بھی ہو گئی جو میں آئندہ کرنے والا ہوں!!

صاحبو! اس زمانے میں کہ لوگ اپنے آپ سے محبت کرنا بھول گئے ہیں۔ ان خاکوں میں محبت کی ایسی خوشبو رچی بسی نظر آئی جو انسانوں کو ہلاک کیے بغیر دنیا کو تبدیل کر سکتی ہے!

یہ عام تنقیدی مضامین نہیں۔ یہ تو اُن افراد کے خاکے ہیں جن سے مصنف کے گہرے ذاتی روابط تھے یا جن کو یہ اپنا محسن سمجھتے ہیں۔ بحث کے لیے کسی مسئلے کو سمجھنا ضروری نہیں لیکن کسی شخص کا خاکہ لکھنے کے لیے اس شخص کو سمجھنا ضروری ہے۔

جوش صاحب کے قصے میں ضمناً ایک بات ہمیں بھی یاد آ گئی۔ اکبر حمیدی کو جوش صاحب نے بتایا کہ ورزش وہ شام کے وقت کرتے تھے۔ صبح کو نہیں۔ جبکہ ہمیں ایک ملاقات میں بتایا کہ ورزش وہ صبح کے وقت کرتے تھے شام کو نہیں۔ ورزش کا موسم کے ساتھ گہرا تعلق ٹھہرا اور جوش صاحب تو ہر موسم جینے والے آدمی تھے!!

اس تصنیف کی تخلیق پر مجھے اکبر حمیدی کے لیے اپنی تحسین کا جذبہ حیرت کی حدوں کو چھوتا محسوس ہوتا ہے۔ حیرت اپنی بے خبری پر ہے کہ میں آج تک اکبر حمیدی کے شعر پر ہی فریفتہ رہا ہوں۔ ان کے انشائیے بھی دل پر دستک دیتے رہے۔ مگر خاکہ نگاری کے ضمن میں اور بالخصوص اس کی نثر کی دلکش اور عظیم الشان گرفت کا......اس سے پہلے......مجھے صحیح اندازہ نہ تھا۔

ابھی اور بہت باتیں گفتنی تھیں اور ناگفتنی کو تو ہاتھ ہی نہ لگا سکے مگر وہ جو امام غزالی نے کہا کہ زیادہ بولنے میں زیادہ غلطیوں کا احتمال ہوتا ہے لہٰذا اجازت!!

☆☆☆

پروفیسر ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

حرفِ چند

چھوٹی دنیا بڑے لوگ

''قدِ آدم'' کے نام سے ان کے خاکوں کا ایک مجموعہ مقبول ہو چکا ہے، اب ''چھوٹی دُنیا بڑے لوگ'' کے زیرِ عنوان ان کے لکھے ہوئے خاکوں کا دوسرا مجموعہ صورت پذیر ہو رہا ہے جو اردو خاکہ نگاری کی پوری تاریخ میں اپنے مزاج کا پہلا اور منفرد مجموعہ ہے۔

''ماں جی'' قدرت اللہ شہاب کا ایک معروف خاکہ ہے۔ سلسلہ شہابیہ کے بعض نامورانِ قلم کے ہاں بھی گھریلو خواتین کا جہاں تہاں ایسا تذکرہ ملتا ہے جس پر خاکے کا گمان کیا جا سکتا ہے۔ آغا بابر بٹالوی نے بھی افرادِ خانہ کے بڑے سجیلے خاکے تحریر کیے ہیں لیکن یہ کتابی صورت میں نہیں چھپے یا چھپے ہیں تو میرے علم اور دسترس میں نہیں۔

اکبر حمیدی کے زیرِ نظر مجموعے کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں تمام تر اور یکسر گھریلو افراد کو مرکزِ نظر بنایا گیا ہے۔ میری نظر اور خبر کی حد تک اس نوع اور نہج کا یہ واحد اور اولین مجموعہ ہے۔ اس میں انہوں نے اپنی دادی، دادا جی کے سوتیلے بھائی، اپنی دوسری والدہ، تایا جی، بڑی تائی، اپنے والد اور اسی طرح خاندان یا اپنے قصبے کے دوسرے افراد کے بڑے متحرک اور یادگار خاکے تراشے ہیں۔

متعارف اور معروف شخصیات کا خاکہ لکھنے اور بالکل غیر معروف افراد کا جان دار اور قابلِ مطالعہ خاکہ پیش کرنے میں آسانی اور دشواری کا جو تناسب ہو سکتا ہے اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ اکبر حمیدی اس مشکل راہ سے آسان اور کامران گزرے ہیں۔

خاکہ نگاری کو بجا طور پر ایک مشکل فن اور شغل کہا گیا ہے۔ دربارہ خاص رشید احمد صدیقی کا یہ قول کتنا بلیغ اور فصیل ہے کہ:

''ہمارا کسی کے لیے خوش یا ناخوش ہونا ہمارے لیے جتنا آسان ہے، اتنا ہی یہ مشکل ہے کہ ہم اس شخص کو دوسروں کی پسند یا ناپسند کا موجب بنا دیں۔''

اکبر حمیدی نے بالکل غیر معروف افراد کو پڑھنے والوں کے لیے مانوس اور محبوب بنا دینے میں غیر معمولی کامیابی پائی ہے۔ یہاں پھر رشید صاحب کی بات کا سہارا لینا پڑتا ہے کہ:۔

’’جب تک مرقع نگار اپنے معمول کو دوسروں سے واضح طور پر منفرد نہ کر سکے گا، اس وقت تک نہ کوئی شخصیت نگار کا قائل ہوگا، نہ زیرِ مشق شخصیت کا! یعنی مرقع نگاری کو لازماً ہاتھ کا کام ہونا چاہیے ’’مشین‘‘ کا نہیں۔‘‘

اکبر حمیدی کا کام بیک وقت تخلیقی وفور، شخصی ارتکاز اور دیدہ ریزی اور سوزن کاری سے عبارت ہے۔ نتیجتاً ان کے ہاں ’’فرد‘‘ ’’فردِ فرید‘‘ بن کر ابھرتا ہے، محض شخص نہیں رہتا، ایک شخصیت بن کر پڑھنے والوں کو اپنے حصار میں لیتا ہے۔ خاکہ نگار کی تراشیدہ ان شخصیات سے دوچار ہو کر زندگی، خوشبو، چاندنی، روشنی اور اچھی قدروں پر ہمارا یقین بڑھتا اور پختہ ہوتا ہے، اور یہ شخصیات پڑھنے والوں کے لیے بھی کم و بیش اتنی ہی عزیز، محبوب اور مضبوط ہو جاتی ہیں، جیسی وہ خود، شخصیت یا خاکہ نگار کا اثاثہ اور سہارا رہی ہیں............ یہ صورت حال بطور خاکہ نگار اکبر حمیدی کی بڑائی اور ان کے کمالِ فن کی مظہر ہے۔

اکبر حمیدی............ تخلیقی اور تجزیاتی ذہن اور رویے کے آدمی ہیں۔ دھیمے، ’’نکھے اور تکھے‘‘............ زندگی کے ان کے تجربات، خالصتاً ان کے ’’اپنے‘‘ ہیں۔ ان منفرد تجربوں کو نرم لفظی پیراہن عطا کرنے کا سلیقہ بھی ان کی متاع ہے۔ ان کی خیال افروز باتوں سے پڑھنے والوں کو روشنی ملتی ہے۔ ان کا انہماک اور اخلاص، ان کی خوش نفسی اور دردمندی ہمیں روکتی اور متوجہ کرتی ہے۔

خاکوں کا یہ مجموعہ، اردو خاکہ نگاری کے ارتقا اور تاریخ میں ایک منفرد اور ممتاز موڑ اور مقام کا حامل ہے جس سے خاکہ نگاری کا کوئی مبصّر یا مورّخ صرفِ نظر نہیں کر سکے گا لیکن اپنے مزاج و منہاج کا پہلا مجموعہ ہونا ہی اس کا واحد امتیاز نہیں، اکبر حمیدی جس تخلیقی اور فطری اسلوب میں دیہات کے سوندھے پن اور رویوں کی خوبصورتی کو کشید کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں، اس ہنروری کے حوالے سے بھی ’’چھوٹی دنیا بڑے لوگ‘‘ اردو خاکہ نگاری کی ذیل میں ہمیشہ قابلِ لحاظ رہے گی اور مستقل جگہ پائے گی۔

اکبر حمیدی نے اپنے اعزہ و اقربا کے خاکوں میں زندگی کے خلوتی و عائلی خانے پر جتنی توجہ دی ہے، اہلِ قلم کے خاکوں میں اس سے اتنی ہی بے توجہی اختیار کی ہے۔ اکبر حمیدی شخصیت کا تجزیہ کرنے اور بعد ازاں اس کی مدد سے نتیجے تک پہنچنے کی صلاحیت کو بھی بروئے کار لائے ہیں، خواہ ان کے تجزیے کو نامناسب اور نتیجے کو غلط ہی کیوں نہ سمجھا جائے۔ بات خاکوں پر ہو رہی ہے تو یہ بتا تا چلوں کہ اکبر حمیدی نے اپنے خاکوں میں حلیہ نگاری یا شخصیت کی ظاہری وضع و قطع کو زیادہ اہمیت نہیں دی مگر جن دو ایک مقامات پر دی ہے وہاں کمال کر دیا ہے۔

(اقتباس از مضمون **قدِ آدم ایک مطالعہ** از **رفیق سندیلوی**)

جاوید حیدر جوئیہ (بورے والا)

اکبر حمیدی کی خاکہ نگاری

(’’قدِ آدم‘‘ اور ’’چھوٹی دُنیا، بڑے لوگ‘‘ کے حوالے سے)

یونگؔ کے نفسیاتی ماڈل میں Persona قدیم رُومیوں کے ڈراموں میں اَداکار کے پہننے کا وہ ماسک (Mask) ہوتا تھا، جسے وہ اپنے چہرے پر چڑھا لیتا، اَور یوں ناظرین و سامعین سے اپنی ’اصل‘ کو چھپاتا (اور دِکھاتا بھی)۔ اس نفسیات میں پرسنیلیٹی (Personality) کا لفظ بھی Persona ہی سے مشتق ہے۔ اس زاویے سے دیکھیں تو ہر شخص ’شخصیت‘ کا حامل نہیں ہوتا۔ شخصیت ہونے کے لیے اُس کا ’کردار‘ ہونا اوّلین شرط ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ کردار کسی اعلیٰ سماجی حیثیت ہی کا حامِل ہو، بلکہ یہ اس تمثیل کا کوئی ’معمولی‘‘ مگر اہم کردار بھی ہو سکتا ہے، جو اَنبوہِ آدم کے اس جمگھٹے میں نہ جانے کب سے جاری ہے، اور خبر نہیں کب تک جاری رہے گا۔ دیکھا جائے تو ’شخصیت‘ بھی محض باہر کا ’چھلکا‘ ہے۔ ’مغز‘ تو اِس کے اندر چھپا ہُوا ہے۔

یونگؔ کا یہ بھی کہنا تھا کہ جو لوگ شعوری طور پر بہت ’مضبوط‘ ہوتے ہیں، اصلاً وہ لاشعوری اور وجدانی سطح پر بے حد کمزور واقع ہوتے ہیں، جبکہ اس کے برعکس لاشعوری سطح کے مضبوط لوگ شعوری سطح پر نہایت کوتاہ طاقت ہوتے ہیں۔ اس لیے ’اصل‘ کی پہچان کے لیے ضروری ہے کہ اس ’پرسَونا‘ کی نقاب کُشائی کی جائے۔ گویا شخصی کردار میں ذات (self) کی پہچان کی جائے۔ دوسرے لفظوں میں انسان کی پہچان دراصل خود شناسی (Self recognition) کا عمل ہے، جو ’ٹھہر کر دیکھنے‘ کا متقاضی ہوتا ہے۔ جو پہچان عُجلت میں کی جاتی ہے، وہ پہچان ہوتی ہی نہیں بلکہ محض ’سرسری نظر‘ ہوتی ہے ___ بالکل ایک اُچٹتی سی جھلک، جسے بس ایک عارضی سی یادداشت کا حصہ بننے کی توفیق مِلتی ہے __ جیسے کوئی ٹرین کی ٹکٹ کا نمبر یاد نہیں رکھتا۔ جب کہ ’رُک کر‘ اور ’ٹھہر کر‘ کی گئی پہچان نہ صرف سچّی، سُچّی اور متاثر کُن ہوتی ہے، بلکہ ایک طویل المدّت یادداشت بن کر خود پہچاننے والے کی ذات کا حصہ بھی بنتی ہے، اُس کی اپنی ذات پر اِس کا براہِ راست اَثر ہوتا ہے اور یوں ’ذات‘ (Self) ’ایک‘ کی تنہائی سے ’دو‘ کی یکتائی میں بدل جاتی ہے۔

زِندگی کی ہمہ ہمی، شور اور جلد بازی نے اِنسان کو تاریخی طور پر بہ تدریج اَپنی رَفتار بڑھا لینے پر مجبور کیا

ہے۔ رَفتار بڑھ جانے کا مطلب یہ بھی ہے کہ مہارت کی ضرورت کے ساتھ ساتھ حادثے کا اندیشہ بھی بڑھ جائے۔ ایسے میں اوّل تو کردار نظر ہی نہیں آتے، اور اگر نظر آ جائیں تو اُن کی 'اصل' پہچان نہیں ہو پاتی۔ صرف جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اَب 'آدمی' زیادہ اور شناخت کردہ شخصیتیں کم ہیں اَور جو ہیں وہ 'منظورِ نظر شخصیتیں' ہیں۔ یہ وہ 'حادثہ' ہے جو بعض لکھنے والوں کی تیز رفتاری کے سبب آئے دِن کا واقعہ بن گیا ہے۔ یہ حادثہ ہر حادثے کی طرح 'مہارت' کی کمی کے باعث پیش آتا ہے۔ اکبر حمیدی اس حادثے سے اسی لیے بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ اُنھوں نے رُکنے اور ٹھہرنے کا انداز اپنایا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ سُرعت مشاہدے کی دُشمن ہے۔ تیزی خوف زدہ بھی کرتی ہے، اور خوف انسان کو قید کر دیتا ہے۔ آزادی کا پُر مسرّت لمحہ صرف اُس وقت نازل ہوتا ہے، جب خوف کی جگہ محبّت لے لیتی ہے۔

محبّت اصل میں مبالغے ہی کی ایک حالت ہے، حتیٰ کہ ایک شخصیت کی محبت ''تعلّی'' بھی ہو سکتی ہے۔ خاکہ لکھنے کا عمل بغیر محبت کے اَنجام نہیں پا سکتا۔ محبت کا یہ سفر خاکہ نگار کی اَپنی ذات کے zero point سے آغاز ہوتا ہے۔ آغاز کے بعد خاکہ نگار دھیرے دھیرے، ایک سیّاح کی طرح، شاہدِ ذات کے اَن دیکھے اور اَن چھوئے لمس کو پہلی بار محسوس کرنے کی مسرّتِ جاوداں سے ہم کنار ہوتا ہے۔ اس ایک ٹَچ (Touch) کی بدولت وہ شناخت کے ماورائی عمل سے گزرنے لگتے ہیں ___ اور خاکہ مکمل کر لیتے ہیں۔

اَصلاً معرفتِ ذات میں یہ عمل صوفی کا بھی ہے، لیکن صوفی کے برعکس خاکہ نگار کی تخلیقی وابستگی اَور 'رُک کر دیکھنے' کی صلاحیت کا اِنعام یہ ہے کہ وہ اپنے سفرِ محبت کی رفتار کو ضبطِ نفس کا حصہ بنا لینے اور یوں محبت کے 'جسم' کو لباسِ تخلیقیت پہنانے پر قادر ہوتا ہے۔ وہ جمال کا ناظرِ محض نہیں بلکہ اس کا نَو تخلیق کار بھی ہوتا ہے۔ اسی لیے ایک اعلیٰ درجے کا خاکہ نگار قصیدے کی تشبیب اور سراپا نگاری سے خود کو بچا لے جاتا ہے۔ وہ ممدوح کے بجائے محبوب کی جمالیاتی تشکیل کرتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کر پائے تو اس کی یہ کاوش 'منثور قصیدے' کے زمرے میں تو شاید آئے، خاکہ نہیں بن پائے گی۔ زیادہ آسانی سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک کامیاب خاکہ نگار دُوسرے کے نام سے خود اپنی آپ بیتی اور ذاتی سفر نامہ لکھتا ہے۔

اکبؔر حمیدی نے پنجاب کے گاؤں میں اپنا بچپن، لڑکپن اَور جوانی کا بڑا حصہ گزارا ہے۔ یہاں اُن کی شخصیت نے تہ ہو کر سمٹنا اور پھر پھیلنا سیکھا۔ اسی لیے اُن کی تحریر میں ایک تہ دار پھیلاؤ والا انسان ہر جگہ مِلتا ہے۔ اُنھوں نے غزَل کی شاعری سے اپنی اَدبی زندگی کا آغاز کیا، پھر نثر کی طرَف آئے۔ شاعری کی تہ داری کو نثر کے پھیلاؤ میں انھوں نے کس طرح واسع کیا، یہ معمہ اُن کے قاری کو شاید ہمیشہ ورطۂ حیرت میں رکھے! مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ اُنھوں نے شاعری اور نثر کو ایک دوسرے کا مثنیٰ بننے سے ہمیشہ روکے رکھا ہے۔ خاکوں کے علاوہ دیگر نثری اصناف کی سمت اس مضمون کا رُوئے سخن نہیں ہے، ورنہ مَیں ضرور تجویز کرتا کہ اکبؔر حمیدی کے خاکے اُن کی خود

نوشت ''جَست بھر زندگی'' کو پڑھنے کے بعد پڑھے جائیں، تا کہ خاکہ نگاری اور آپ بیتی میں متذکرہ بالا رشتہ ہمیں صاف نظر آئے۔

اُن کے لکھے ہوئے خاکے شگفتنِ گُل کی آپ بیتی ہیں۔ یہ قدرتی اور آرائشی پھول اُن کے اَندر چلتی رہنے والی دیہی اور شہری ہواؤں میں کھِلے ہیں، ہوائیں جو کبھی بادِ صبا تھیں تو کبھی بادِ صرصر۔ لیکن حیرت ہے کہ اِن میں قنوطیت کہیں نہیں۔ کردار کی شخصیت اُن کی ذات کا the other بن کر محفوظ رہی ہے، اور یوں ترفع آشنا بھی ہوئی ہے۔ غالباً اسی لیے اکبر حمیدی کے خاکوں کے کرداروں کی خوبیاں اور خامیاں خود اکبر حمیدی کی ذات کا عکس نظر آتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ منٹؔو کے ''گنجے فرشتے'' خاکہ کی ''تعریف'' ہیں، کہ خاکے میں کردار کے اوصافِ حمیدہ کے ساتھ ساتھ (اُن کے گنجے پن) کی ''خامیاں'' بھی بیان ہوتی ہیں۔ اکبؔر حمیدی کے خاکوں میں آپ کو 'فرشتے' نہیں دِکھائی دیں گے۔ بس خاکی انسان نظر آئیں گے ___ جن کا 'فرشتہ پن' اور 'گنجا پن' نیچرل ہو گا۔ مطلب یہ کہ وہ کردار کا مضحک نقشہ پیش نہیں کریں گے۔ وہ خامی کی خوبی اور خوبی کی کجی کا امتزاج پیدا کر کے اپنے خاکے کی بُنت کرتے دکھائی دیں گے۔ وہ جزو نہیں بتائیں گے، بلکہ انسان کو ایک گیسٹالٹ کی طرح بُنیں گے ___ اُن کے خاکوں کے اِنسان اپنے حاصلِ کُل سے بڑھ کر ہوں گے۔ یہ اضافہ اُنھوں نے کردار میں اپنی طرف سے نہیں کیا ہو گا، بلکہ یہ کردار کے دوسری طرف موجود کسی چیزے دیگر پر دال ہو گا۔ وہ ڈرامائی انداز اختیار نہیں کریں گے، لیکن کردار کا خاموش رول آپ کو صاف دکھائی دے گا۔ وہ واقعات کی Narration سے کہانی نہیں لکھیں گے، مگر دِلچسپی اُن کے خاکوں میں قاری کو آگے بڑھتے رہنے پر اُکساتی رہے گی۔ وہ معمولی کو معمولی ہی رہنے دیں گے ___ لیکن معمول سے ہٹ کر۔ وہ خاص کو بھی خاص ہی رکھیں گے لیکن اپنے خاص انداز میں۔ اُن کے ہاں ''جُملہ بازی'' بھی کہیں کہیں دکھائی دے گی۔ مگر ''جملہ'' حملے کی طرح نہیں بلکہ حکمتِ عملی کی طرح استعمال کریں گے۔ آپ کو لگے گا کہ اس خاکے میں اسی ایک جملے، (یا ایک سے زیادہ جُملوں) کی رُوح خاکے کے تنِ خاکی میں دھڑک رہی ہے ___ رُوح، جو اس کی اصل ہے لیکن در باطن ہوتے ہوئے بھی جو ظاہر کی دُنیا کو 'زندہ اور 'قائم' رکھے ہوئے ہے۔ بعض جملے تو ایسے ہوں گے کہ آپ چاہیں گے اِنھیں بدل دیا جائے، یا اِن کی ساخت کو تبدیل کر دیا جائے ۔ لیکن کوئی ایسا کر کے دیکھ لے، یہ کوشش بالکل بے سود ہو گی۔ خاکہ ''بے رُوح'' ہو جائے گا۔

اچھی نثر کی ایک خصوصیت اس میں طویل و مختصر جملوں کا امتزاج بھی ہے۔ اکبؔر حمیدی کے خاکوں میں یہ وصف بڑی فنّی مہارت سے کردار کی چھوٹی بڑی خصوصیات کی صورت استعمال ہوتا ہُوا آپ کو نظر آئے گا۔ چھوٹی بات کو بڑا بنا کر اور بڑی بات کو چھوٹا کر کے لکھنا اُن کے مزاج اور وضعِ اُسلوب کے خلاف ہے۔ وہ اپنے کردار کو کوئی ایسی وردی نہیں پہنائیں گے جس پر اعزازاتی فیتے لگے ہوں ___ بلکہ وہ سرے سے وَردی پہنائیں گے ہی نہیں۔ تاہم، اگر کردار کی یونیفارم اُن کے لیے اہم ہو گی بھی تو وہ اُسے جسم سے چپکی ہُوئی نہیں، بلکہ کھونٹی سے لٹکتی

ہوئی دِکھائیں گے۔ وہ انسان کی دانش پر توجّہ مرکوز کریں گے، اُس کی بہادری کے گیت گائیں گے، اُس کی اُولوالعزمی کا ذکر کریں گے، جہدِ مسلسل کی اور فتح مندی کی بات کریں گے۔ محسن کی احسان کاری کے معترف ہوں گے۔ (محسن کے تو دشمنوں تک کا ذکر کرنا مناسب سمجھیں گے) خاکے کا کردار اُن سے خوش ہو نہ ہو، وہ خود ہمیشہ اس سے خوش دِکھائی دیں گے۔ اُن کے خاکوں میں تو عقیدت جیسی غیر مشروط اور یک معنی شئے بھی جوش کے بجائے ہوش کے ساتھ پیش ہوئی ہے۔ وہ شہد کے چھتے کی ملکہ مکھی پر خاکہ لکھتے ہیں۔ بہ حیثیت خاکہ نگار وہ کار کے سوار نہیں۔ اس لیے اُن کا View تیز رفتاری اور وِنڈسکرین سے چھَن کر جزوِ نگاہ نہیں بنتا۔ وہ تو تانگے کی گاہے پچھلی گدّی پر بیٹھ کر کرداروں کا تجزیہ اور مشاہدہ کرتے ہیں، اور گاہے اگلی گدّی پر بیٹھ کر۔ اسی لیے خود اُن کے اُسلوب کی طرح اُن کے خاکوں کے کردار بھی کھلی ہوا کے باسی ہیں۔

اکبر حمیدی کے خاکوں میں بڑی وضعِ احتیاط ہے۔ وہ ڈھنگ اور رنگ کو ساتھ ساتھ رَکھتے ہیں۔ رنگ کردار کا، اور ڈھنگ اُن کا اپنا ہوتا ہے۔ اسی لیے 'تصویر' واضح اور حسین ہوتی ہے۔ اُن کا کوئی بھی خاکہ کسی ضائع ہو جانے والی ذات پر نہیں ہے۔ اِن خاکوں کے کرداروں کے کوائفِ حیات کا ریکارڈ تو شاید دیمک چاٹ جائے، لیکن اُن کی اصل زندگی اکبر حمیدی کے خاکوں میں رزقِ خاک کبھی نہیں بنے گی۔

اکبر حمیدی کے تحریر شدہ خاکوں کے تازہ مجموعے ''چھوٹی دنیا بڑے لوگ'' پر نگاہ ڈالیں تو ہم بلا مبالغہ اسے ایک متوازن اور پُر خلوص کوشش سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ دیہی فضا سے منسلک ایک جیسے ماحول کے پروردہ و پرداختہ لوگوں کے درمیان حدِ فاصل قائم کرنا اور ان کے شخصی اوصاف کو اس طرح اجاگر کرنا کہ ان میں سے ہر ایک شخصیت کا خاکہ نویس سے رشتہ ناطہ پوری طرح سے سامنے آ جائے ایک مشکل مرحلہ تھا جسے اکبر حمیدی نے خوبصورتی سے طے کیا ہے۔ ''چھوٹی دنیا بڑے لوگ'' کے خاکوں کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اکبر حمیدی انسانی نفسیات کے ایک زیرک نباض ہیں۔ ان خاکوں میں اکبر حمیدی کی اپنی ذات بھی جلوہ گر ہوئی ہے اور یوں ہمیں پتہ چل جاتا ہے کہ خاکوں میں پیش کردہ شخصیتوں نے اکبر حمیدی کی شخصیت کی تعمیر و تربیت میں کیا کردار ادا کیا تھا۔ ایسے لوگ جن کی زندگیاں دنیاوی آلائشوں سے غیر آلودہ ہوں ان پر قلم اٹھانا آسان نہیں ہوتا۔ مگر اکبر حمیدی نے کمال ہنرمندی سے یہ نہایت مشکل فریضہ بھی انجام دے ڈالا۔ ان کے تحریر کردہ خاکوں میں دلچسپی کا عنصر بدرجۂ اتم موجود ہے اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اکبر حمیدی کی ذات ایک ڈوری کی طرح ان شخصیات سے بندھی ہوئی ہے۔

(اقتباس از مضمون **چھوٹی دنیا بڑے لوگ** تحریر کردہ **ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش**)

منشا یاد (اسلام آباد)

جست بھر زندگی

کہا جاتا ہے کہ ہر شخص کی زندگی میں کم از کم ایک ناول ضرور ہوتا ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص اپنے سوانحی حالات قلمبند کرے تو ایک ناول وجود میں آ سکتا ہے بشرطیکہ اس کا ایسا ارادہ ہو اور اس نے کرداروں' مقامات اور واقعات کی طنابوں کو حقائق (Facts) کی مضبوط کھونٹیوں سے نہ باندھ رکھا ہو۔ ممتاز مفتی نے علی پور کا ایلی تھرڈ پرسن یا واحد غائب کے پوائنٹ آف ویو سے لکھا مگر نام و مقام کی طنابوں کو حقائق (Facts) کی کھونٹیوں سے باندھنا ضروری نہ سمجھا۔ اس کے بعد وہ زندگی بھر اصرار کرتے رہے کہ یہ ان کی اپنی سرگذشت ہے مگر اہل نقد و نظر نے اسے ناول ہی قرار دیا۔ مگر ''الکھ نگری'' میں وہ واقعات کی طنابوں کو کھونٹیوں سے باندھنا نہیں بھولے' اس لئے کسی کو اس میں شک نہیں کہ یہ سوانح ہے' ناول نہیں۔

سوانحی ناول اور سوانح کے اسلوب میں دوسرا فرق یہ ہے کہ اول الذکر میں فکشن کی آمیزش یا اس کی گنجائش موجود ہوتی ہے اور لکھنے والے کو زبان و بیان کی آرائش و زیبائش' تشبیہہ' استعارے اور تخیل آفرینی کے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ جب کہ سوانح میں اس کی گنجائش ہوتی ہے نہ ضرورت۔ اس میں سادگی اور سادہ نگاری تک محدود رہنا پڑتا ہے۔ اس لئے سوانح نگار کا کام اور مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ محفلِ ادب میں بن سنور کر نہیں سادہ لباس میں آتا ہے اور اسے اپنی باتوں اور رویے سے دوسروں کو متاثر کرنا اور خود کو منوانا پڑتا ہے۔ سوانحی ناول کی ایک بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی ایک شخص کی داستان حیات ہوتے ہوئے بھی ہر زمانے میں کئی دوسرے لوگوں کی سرگزشت بھی بن جاتا ہے۔ جبکہ سوانح پر مصنف کے نام کی مہر لگی ہوتی ہے اور اس کے جملہ حقوق محفوظ ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے سوانح کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ لکھنے والا اگر اچھا جملہ لکھنے پر قادر ہے اور سادہ الفاظ میں اثر آفرینی پیدا کرنے کا گر جانتا ہے تو اچھے طریقے سے لکھی ہوئی سوانح کمزور ناول پر بھاری ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ سوانح کے مواد اور مندرجات پر منحصر ہے کہ وہ ایک شخص کی ذاتی زندگی تک محدود ہو کر رہ گئی ہے یا اس کا کینوس زندگی اور فن کی طرح وسیع ہے۔

اکبر حمیدی کی ''جست بھر زندگی'' ایسی ہی خودنوشت سوانح ہے جو ان کی ذاتی اور شخصی زندگی کی حدود پھلانگ کر دوسروں کی دلچسپی اور غور و فکر کے مطالعے کی چیز بن گئی ہے۔ ان کے تجربات' مشاہدات اور حاصلِ

زیست نتائج ہر شخص کے لئے دعوتِ فکر رکھتے اور زندگی کرنے کا حوصلہ پیدا کرتے ہیں۔ زیادہ دُور جانے کی ضرورت نہیں، ان کی سوانح پڑھ کر خود مجھے لگا جیسے انہوں نے اپنی نہیں میری سوانح لکھی ہے۔ وہی ''میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے'' والی بات۔ انہوں نے وہی سارے سوال اٹھائے جو اکثر میرے ذہن میں بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں اور ان سوالوں کے جوابات بھی ویسے ہی دیئے جیسے میں دینا مناسب سمجھتا۔ میری اور ان کی سوچ ہی میں نہیں سوانح حیات میں بھی حیرت انگیز مماثلت ہے اور مجھے یقین ہے میرے اور اکبر حمیدی جیسے اور بہت سے ایسے ہوں گے جن کو اس میں اپنا چہرہ نظر آئے گا۔

اس کتاب کی دوسری خوبی یہ ہے کہ ایک پورے دور کی معاشرت کو جو آنکھوں سے اوجھل ہو رہی ہے پوری جزئیات اور سچائی کے ساتھ بیان کرتی اور اسے تاریخ میں محفوظ کرتی ہے۔ اپنے عزیز و اقارب کے رویوں اور ماحول کو بیان کرتے ہوئے وہ اپنے پورے گاؤں، شہر اور اردگرد کی زندگی کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ مارکیٹ کمیٹی کی ملازمت کے لئے گوجرانوالہ آتے ہیں تو اکیلے نہیں۔ لگتا ہے پورا فیروز والا ساتھ آ گیا ہے۔ اسلام آباد منتقل ہوتے ہیں تو اپنے ساتھ گاؤں ہی نہیں اسلم سراج، انصر علی انصر اور محمود احمد قاضی سمیت پورا گوجرانوالہ اٹھا لاتے ہیں اور کئی برس گزر جانے کے بعد بھی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتے ہیں میں چھوٹے شہر کے بڑے لوگوں میں سے بڑے شہر کے چھوٹے لوگوں میں آ گیا ہوں۔ وہ الگ بات ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد اکبر حمیدی نے مستقل رہائش کے لئے اسلام آباد ہی کا انتخاب کیا ہے۔

اکبر حمیدی نے اس کتاب کو ادبی کتاب بنانے کا ارادہ کیا اور یہ ہر اعتبار سے ایک ادبی کتاب بن گئی ہے۔ اس میں نہ صرف شعر و ادب سے متعلق شخصیات کا بھرپور ذکر ہے۔ بلکہ اس میں کردار نگاری، خاکہ نویسی، ماحول کی عکاسی، انسانی جذبوں اور جذبات کا اظہار اور ایک خاص ادبی شان و شوکت ملتی ہے۔ ایسی باتوں سے احتراز کیا گیا ہے جو ذوقِ سلیم پر گراں گزر سکتی ہیں یا جن پر اختلاف رائے پایا جاتا ہو۔ عقائد و نظریات کے اعتبار سے بھی کسی کی دلآزاری نہیں کی گئی۔ اگر والد اہلِ حدیث کی مسجد میں نماز پڑھنے جاتے ہیں یا والدہ کو امام بارگاہ میں مجلس سننا اچھا لگتا ہے تو اس میں کوئی ہرج نہیں سمجھتے۔ ہر کسی کی خواہش کا احترام پایا جاتا ہے۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے اور معمولی واقعات کو ایک بڑے ادیب کی طرح انہوں نے اہم تر بنا دیا ہے اور ان سے بڑے بڑے نتائج اخذ کئے یا پڑھنے والے کو سجھائے ہیں۔ اپنے والد کی گرم مزاجی کی وجہ سے ان کی ملازمت سے برطرفی اور مقدمات کا سامنا کرنے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''یہ دو سال کا عرصہ بڑی مصیبت کا عرصہ تھا۔ مجھے یاد ہے اتنے بڑے واقعہ سے ابا جی نے کوئی سبق نہ سیکھا تھا۔ کچھ لوگ دنیا میں سبق سیکھنے کے لئے نہیں، سبق سکھانے کے لئے آتے ہیں۔ ابا جی انہی لوگوں میں سے تھے''

کیا اتنے کم الفاظ میں کسی شخص کی پوری شخصیت اور مزاج کا احاطہ کیا جا سکتا ہے؟ ایسے ہی چھوٹے چھوٹے کومنٹس اور خود کلامیوں سے وہ کرداروں اور صورت حال کی سچی تصویریں پیش کرتے چلے جاتے اور ساتھ ہی اپنی تحریر کو اعتبار بخشتے جاتے ہیں کہ وہ جس سچائی کے دعویدار ہیں وہ ان کی پوری کتاب میں موجود ہے۔ وہ محض واقعات بیان نہیں کرتے بلکہ زندگی اور انسانی رویوں پر جگہ جگہ اپنے دانشورانہ کومنٹس دیتے چلے جاتے ہیں۔ اور یہی چیز اس کتاب کو ادبی بناتی اور اس کے لکھے جانے کا جواز مہیا کرتی ہے۔ ایک اقتباس دیکھئے:

''شاندار کردار حسن و رعنائی کا ایسا درخت ہے جس کے سائے میں آئندہ نسلیں حسن و خیر اور تہذیب کا درس لیتی ہیں۔ یہ صدقہءِ جاریہ ہے جس سے پوری انسانیت فیض یاب ہوتی ہے جسے دیکھ کر لوگ گھٹیا پن سے احتراز کرنے لگتے ہیں۔ لوگوں میں شاندار زندگی بسر کرنے کی امنگ پیدا ہوتی اور وہ شرافت سیکھتے ہیں۔''

اسی طرح پہلے باب (صفحہ 50) کے ابتدائیے میں وہ جنگل کے استعارے کو جس خوبصورتی سے استعمال کرتے ہیں وہ اعلیٰ درجے کی فکشن کی خوبصورت مثال ہے۔

بعض لوگوں کے نزدیک ایک اچھی خودنوشت کی خوبی یہ ہونی چاہئے کہ اس میں اپنی خوبیوں کے ساتھ خرابیوں کا بھی ذکر ہو، تاکہ ایک طرح کا توازن قائم رہے۔ جہاں تک انسانی کمزوریوں، کم مائیگیوں اور بد قسمتیوں کا تعلق ہے اکبر حمیدی نے ان کے ذکر سے کہیں اجتناب نہیں کیا۔ بچپن میں جب وہ بگڑا ہوا بچہ تھے اکثر رشتہ داروں اور پڑوسیوں سے مار کھا کر آتے اور اس کا انتقام اپنی سادہ لوح اور محبت کرنے والی دادی کو زچ کر کے لیتے تھے۔ انہوں نے اپنی اس غیر مناسب عادت کا کھل کر ذکر کیا ہے کہ وہ دادی کو کوئی خاص چیز پکانے کی فرمائش کرتے مگر کھاتے وقت بگڑ جاتے کہ یہ کیوں پکائی ہے اور دادی بے چاری کو منت سماجت کرنا پڑ جاتی۔ ویسے بچپن کی یہ ٹیڑھ ان میں اب تک موجود ہے۔ اکبر حمیدی میں 101 خوبیاں ہیں۔ اور خرابی صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ جس بات یا موقف پر ایک بار ڈٹ جائیں لاکھ سر کھپاتے رہو۔ دنیا بھر کی تاویلات لاتے اور دلائل دیتے رہو سرِ مُو ادھر ادھر نہ ہوں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اپنی خودنوشت میں اپنی ذات سے متعلق کوئی بھی اہم اور قابل ذکر بات چھپائی ہے نہ اپنے کسی رویے کی غیر منطقی توجیح اور وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اگر اکبر حمیدی جیسے سادہ مزاج دیہاتی اور فطرتاً شریف آدمی کی زندگی میں جو صراط مستقیم پر چلتا ہو، سرے سے کوئی بڑی کمزوری یا سیکنڈل موجود ہی نہ ہو تو داستان رنگین کیسے بنے؟۔ میں جانتا ہوں خاندانی آدمی کو اپنی ذات سے زیادہ اولاد اور خاندان کی عزت اور وقار عزیز ہوتا ہے۔ وہ چاہے بھی تو غلط راستے پر نہیں چل سکتا۔ پھر بھی ان کی کتاب سیکنڈلز سے یکسر تہی دامن نہیں۔ ضروری تو نہیں ہوتا کہ سیکنڈل جنسی ہی ہو۔ اس کتاب میں حلقہ ارباب ذوق میں پھڈا کے عنوان سے ایک سیکنڈل تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ سیکنڈل کا پنجابی ترجمہ پھڈا ہی تو ہے۔ اس میں اکبر

حمیدی نے 99 فیصدی سچ لکھا ہے۔ باقی کا ایک پرسنٹ بھی سچ ہی ہے مگر یہ ان کا اپنا سچ ہے۔

اکبر حمیدی کی سوانح حیات میں اور بھی بہت سی خوبیاں ہیں۔ مثلاً انہوں نے عزیز و اقارب ہی کو نہیں اپنے ادبی دوستوں، استادوں، محبت کرنے والوں اور مہربانوں کی نیکیوں اور حسنِ سلوک کا کھل کر اعتراف کیا اور انہیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اس طرح کتاب میں اور بہت سے لوگوں کے چھوٹے چھوٹے خاکے شامل ہو گئے ہیں جن سے ان کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اس کتاب میں ایک اہم شاعر ایک بڑے انشائیہ نگار اور ادیب اور ایک سیلف میڈ انسان کی زندگی کا سفر اور کامیابی کے لئے جدوجہد کا احوال قارئین کو زندگی کے ایک بڑے تجربے سے آشنا کرتا ہے۔ ناول اور افسانہ بھی یہی فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ ہم ان کے ذریعے دوسروں کے تجربات اور مشاہدات میں شریک ہوتے ہیں اور کچھ دیر کے لئے ان کی زندگی جیتے ہیں۔ جس سے ہمارا ویژن وسیع ہوتا ہے۔ اکبر حمیدی کی یہ کتاب نیکی، خیر، شرافت اور محبتوں کے فروغ کا پیغام دیتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا شمار اردو میں لکھی جانے والی چند بہترین ادبی سوانح عمریوں میں ہوگا۔

☆☆☆

اکبر حمیدی نے اگرچہ اپنی خودنوشت کا نام ''جست بھر زندگی'' رکھا ہے، تاہم اِسے پورا کر کے میرے ذہن میں پہلا یہی خیال جاگزیں ہوا ہے کہ حمیدی پاؤں پاؤں چلنے والا آدمی ہے، اتنا محتاط، کہ آپ کو بھی کبھی جست بھرنے کی سوجھ جائے تو آپ کی خواہش کی بھنک پا کر وہ آپ کو تھام لے کہ کہیں آپ اپنی خواہش سے مغلوب ہو کر واقعی اَن دیکھے کو دنہ پڑیں۔ اکبر حمیدی نے اپنی پوری زندگی سوچ سوچ کر بتائی ہے اور یہ لوگ کبھی وارفتہ ہونے میں بھی آئیں تو فوراً اپنے آپ کو روک کر ذرا سا سوچ لیتے ہیں کہ وارفتہ ہو لیے اور بس۔ اپنی سوا تین سو صفحات کی روئداد سے دراصل جو اکبر حمیدی چپ چاپ آپ کے سامنے آ بیٹھتا ہے وہ اپنی عمر بھر کی تھکن کو بھول کر صرف اِس لیے آپ کے چہرے کے اتار چڑھاؤ پر ٹکٹکی باندھے ہوتا ہے کہ آپ کہیں اُس کے بارے میں کچھ الٹا سیدھا تو نہیں سوچ رہے ہیں، حالانکہ اتنا راست اور محتاط آدمی اپنا کوئی الٹا پوز بنانے کی بھی ٹھان لے تو الٹا پن ہی سیدھے پن کی پہچان قرار پائے۔ دفتر مارکیٹ کمیٹی گوجرانوالہ میں اپنے خلاف عدالتی کارروائی میں مثبت نتائج کی خاطر دفتر کے چپڑاسی سے منفی دوستی یا اسلام آباد کے اتھلے ڈسپیچ کلرک سے گاڑھا لین دین اُس کے یہاں بجا طور پر تقدیر کے گڑ بڑ جھالے کی بہ نسبت تدبیر کی عینی صحت پر دال ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی اپنی زندگی کے ناقابلِ فراموش واقعات سے تعبیر کر کے مصنف دراصل اپنے قارئین کے روزمرہ کے تجربات میں بھی شامل ہو جاتا ہے اور یوں وہ گویا اپنے آپ کو بھی پڑھ رہے ہوتے ہیں۔

(**جست بھر زندگی** مضمون از **جوگندر پال** سے اقتباس)

ڈاکٹر نذر خلیق (خانپور)

اکبر حمیدی کی خودنوشت

''جست بھر زندگی''

اکبری حمیدی ایک ادیب ہی نہیں بلکہ ایک مخلص اور بے ضرر انسان بھی ہیں۔ میں انہیں آدمی کے ساتھ ساتھ انسان بھی سمجھتا ہوں۔ غالبؔ نے کیا خوب کہا تھا۔

بسکہ دشوار ہے ہر اک کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

آج اگر غالبؔ زندہ ہوتے تو میں اکبر حمیدی کو ان کے حضور پیش کرتا اور کہتا کہ جناب دیکھئے یہ آدمی بھی ہے اور انسان بھی۔ آدمی تو یہ آدمیت کے تقاضے پورے کرنے کی وجہ سے ہیں اور انسان اس لیے ہیں کہ یہ دوستوں کے دوست ہیں اور دشمنوں کے بھی دوست ہیں۔ ان کے ہاں شر والی کوئی بات نہیں، خوبی ہی خوبی ان کی فطرت میں شامل ہے۔ اکبر حمیدی سے میری ملاقات صرف ایک مرتبہ ہوئی ہے لیکن وہی ایک ملاقات میرے لیے ان کو سمجھنے کے لیے کافی بلکہ شافی ثابت ہوئی کیونکہ اکبر حمیدی جیسے دھیمے مزاج اور شگفتہ طبیعت سے مل کر شخصیت کے سارے گوشے وا ہو جاتے ہیں۔ اکبر حمیدی سے میری دوسری ملاقات ان کی خودنوشت ''جست بھر زندگی'' کے حوالے سے ہوئی یعنی ''جست بھر زندگی'' پڑھ کر مجھے اکبر حمیدی کی شخصیت کے کئی گوشوں سے آگاہی ہوئی۔ میں نے اپنی طالب علمانہ زندگی میں اور تدریسی امور کے تقاضوں کے سبب بیشتر خودنوشتیں پڑھی ہیں۔ مثلاً جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی بارات''، قدرت اللہ شہاب کی ''شہاب نامہ''، رضا علی کی ''اعمال نامہ''، اختر حسین رائے پوری کی ''گردِ راہ''، ڈاکٹر رشید امجد کی ''تمنا بے تاب'' اور حیدر قریشی کی ''کھٹی میٹھی یادیں'' کو پڑھا ہے۔ ہر خود نوشت نے اپنے اپنے انداز اور اپنے اپنے تخلیقی دباؤ کے زیرِ اثر اپنے زندگی کے واقعات میں تخیل آمیزی اور شعریت کے رنگ بھرے ہیں۔ کہیں افسانویت آ گئی ہے تو کہیں شعریت نے بے ساختگی کو ختم کر دیا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں نے جن خودنوشتوں کا ذکر کیا ہے وہ تخلیق کے معیار پر پورا نہیں اترتیں۔ درحقیقت خودنوشت لکھنے والا جس انداز کا تخلیق کار ہوتا ہے وہ انداز اس کی خودنوشت میں بھی آ جاتا ہے مثلاً میں یہاں صرف ایک خودنوشت

کا ذکر کروں گا اور یہ خودنوشت ڈاکٹر رشید امجد کی خودنوشت ''تمنا بے تاب'' ہے جس کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔

''مارچ میں سری نگر کے پھرنوں میں گرماہٹ بکھیرتی کانگڑیاں ٹھنڈی پڑنے لگتی ہیں۔شہر برف کی کینچلی اتار کر نیم گرم سانسیں لیتا ہے۔بادام کے درختوں پر سفید بُور آجاتا ہے اور شہر کا شہر بادام وری کے سفید سفید منظر سے لطف اٹھانے کے لیے طرح طرح کے پکوانوں کے ساتھ باغوں میں اُمڈ آتا ہے۔دو دریاؤں کے درمیاں نواں بازار کے شاہ محلّہ میں گلی کے آخر میں بائیں طرف ایک دو منزلہ مکان ہے جس کا لکڑی کا چھجا روائتی وسط ایشیائی طرز کے بیل بوٹوں سے سجا ہوا ہے۔سب سے نیچے تہہ خانہ ہے جس میں سردیوں کے لیے لکڑیاں جمع کی جاتی ہیں۔سارا گھر دائیں طرف ہے، سامنے ایک چھوٹی سی گلی نما کھلی جگہ ہے جس کا ایک دروازہ جسے مرکزی دروازہ کہنا چاہیے بڑی گلی میں اور دوسرا پچھواڑے میں کھلتا ہے۔چار پانچ سیڑھیاں چڑھ کر گھر میں داخل ہوتے ہیں۔نچلی منزل میں دو کمرے ہیں اور ان کے درمیانی منزل کی راہداری نیم تاریکی میں ڈوبی رہتی ہے۔یہاں بھی نیچے کی ترتیب سے دو کمرے ہیں اور درمیان سے سیڑی اوپر جاتی ہے۔اوپر والا حصہ ہوادار اور روشن ہے، سیڑھیوں سے نکلتے ہی دائیں طرف والے حصے میں باورچی خانہ، سٹور اور کھلا سا برآمدہ ہے۔بائیں طرف ایک بڑا کمرا ہے جو سونے کے کام آتا ہے۔اس سے اوپر پڑچھتی ہے جو تقریباً سارے حصے کا احاطہ کرتی ہے اور اس کے اوپر ٹین کی چھت، ڈھلوان کی صورت۔اسی اوپر والے بڑے کمرے میں جو روشن، کشادہ اور ہوادار ہے اور جس کی گیلری کی ساری کھڑکیاں گلی کی طرف کھلتی ہیں۔میں نے ۵ مارچ ۱۹۴۰ء کو زندگی کے دشت میں پہلا قدم رکھا۔'' (۱)

میں یہ نہیں کہتا کہ ڈاکٹر رشید امجد کا یہ انداز خودنوشت کے اندازِ تحریر سے مختلف ہے یا مناسب نہیں ہے میں صرف کہنا یہ چاہتا ہوں کہ تخلیق کار ہمیشہ اپنی خودنوشت اسی انداز میں لکھتا ہے جس انداز میں وہ اپنی مرکزی تخلیق لکھتا ہے۔مثلاً ڈاکٹر رشید امجد عصرِ حاضر کے رجحان ساز اور ایک صاحبِ طرز افسانہ نگار ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی خودنوشت میں بھی افسانویت کا انداز آ گیا ہے۔اکبر حمیدی چونکہ شاعر، انشائیہ نگار، خاکہ نگار اور نقاد ہیں۔بچوں کی ہلکی پھلکی کہانیاں بھی انہوں نے لکھی ہیں جس کی وجہ سے ان کی خودنوشت میں شاعرانہ، انشاء پردازانہ اور تنقیدی انداز آ گیا ہے۔اس سلسلے میں حیدر قریشی کی رائے بہت معتبر ہے۔آیئے ان کی رائے ملاحظہ کرتے ہیں۔

''اکبر حمیدی جیسے فعال اور زرخیز تخلیق کار کی یہ خودنوشت سوانح حیات ان کی زندگی کی روداد بھی ہے۔اور ان کے نظریۂ زندگی اور فن کے عقبی دیاروں کو سمجھنے کے لیے ایک معاون کتاب بھی ہے۔زندگی سے بھری ہوئی یہ کتاب موت کے بارے میں کچھ نہیں کہتی صرف زندگی کی بات کرتی ہے، مثبت طور پر جینے کی بات کرتی ہے۔'' (۲)

اکبر حمیدی کی خودنوشت پر بہت سے لوگوں نے لکھا ہے مثلاً ان کی خودنوشت پر لکھنے والوں میں

جوگندر پال، ڈاکٹر رشید امجد، جمیل یوسف، ڈاکٹر پرویز پروازی، ڈاکٹر عطش درانی، ڈاکٹر اعجاز راہی، پروفیسر ناصر عباس نیّر اور رفیق سندیلوی کے نام نمایاں ہیں۔جوگندر پال کا نام افسانے کی دنیا میں بڑا نام ہے لیکن میرے خیال کے مطابق تخلیق کار اگر اوریجنل ہے تو وہ تخلیق و تنقید دونوں میں لکھ سکتا ہے اور کامیابی کے ساتھ لکھ سکتا ہے بلکہ ایک تخلیق کار نقاد پہلے ہوتا ہے کیونکہ تنقیدی نظر ہی تخلیق کو جنم دیتی ہے۔آیئے جوگندر پال کی رائے سے بھی استفادہ کریں۔

''میں اپنے عزیز دوست کو اس آپ بیتی میں اپنے طویل معمول کے غیر معمولی پن کو اتنی پُرکار سادگی سے سمیٹ پانے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔پرانے یونانی کہا کرتے تھے کہ وسیع تر کتھائیں لکھنی ہوں تو صرف راجاؤں، مہاراجاؤں کی کتھائیں لکھو۔انہیں کیا علم تھا کہ ہمارے جمہوری ادوار میں جب ایک عام سے آدمی کی کتھا کروڑوں عوام کی نمائندگی کا دم بھرنا شروع کرے گی تو اس کی وسعت کا دبدبا مہاراجاؤں کی کتھاؤں سے بھی بڑھ چڑھ کر ہوگا۔'' (۳)

یہ ایک حقیقت ہے کہ اکبر حمیدی ایک عام آدمی ہیں کیونکہ ان کے پاس نہ سرمایہ ہے نہ اقتدار وہ ایک کلرک سے ترقی کرتے ہوئے پروفیسر ریٹائر ہوئے اور ہمارے اس عہد میں کلرک ہو یا کوئی پروفیسر وہ عام آدمی ہی ہوتا ہے کیونکہ ان دو حضرات کے پاس نا پیسہ ہوتا ہے نہ اقتدار لیکن کلرک ہو یا پروفیسر ان کے پاس حالات کی کڑواہٹ اور زندگی کی تلخیاں ضرور ہوتی ہیں۔یہ زندگی کو قریب سے دیکھتے ہیں اور بڑے بڑے رازوں سے واقف ہوتے ہیں اس لیے ان کی زندگی میں جتنے واقعات ہوتے ہیں وہ شاید عصرِ حاضر کے خودساختہ بڑے لوگوں کے پاس نہیں ہوتے۔راجاؤں اور مہاراجاؤں کی زندگی تو عیش و عشرت اور چند گھسے پٹے واقعات تک محدود ہوتی ہے۔ان کے واقعاتِ زندگی یکسانیت کا شکار ہوتے ہیں بلکہ میں تو کہوں گا کہ تنوع نام کی کوئی چیز ان کی زندگی میں نہیں ہوتی۔یہی وجہ ہے کہ اکبر حمیدی کی خودنوشت (جست بھر زندگی) زندگی کے تنوع اور رنگارنگی سے بھری ہوئی ہے۔انہوں نے زندگی کو جس نظر سے اور جس زاویے سے دیکھا بے ساختہ انداز میں بیان کر دیا۔ساختگی اور شاعرانہ انداز کم ہے۔جیسا انداز ان کی شاعری کا ہے یعنی سادگی اور سہلِ ممتنع کا انداز وہی ان کی خودنوشت کا انداز ہے۔ان کی خودنوشت کو پڑھ کر ایک عام آدمی محسوس کرتا ہے کہ جیسے وہ کسی سادہ سے ماحول میں سانس لے رہا ہو۔ڈاکٹر رشید امجد کی اس رائے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

''مجموعی طور پر یہ آپ بیتی ایک طویل جدوجہد کی داستان ہے اکبر حمیدی جیسے بے شمار لوگ زندگی کرنے کے اس عمل سے گزرے اور گزر رہے ہیں جس کا اختتام ان فخریہ لمحات پر ہوتا ہے جو اس سارے سفر کی عطا ہیں۔زبان و بیان کی روانی تو انہیں ان کے اندر کے انشائیہ نگار نے عطا کی ہے اور تخیل کی چاشنی ان کے اندر کے شاعر سے ملی ہے یوں یہ آپ بیتی اپنے اندر شاعرانہ مزاج بھی رکھتی ہے اور اس میں نثری تدبیر اور گہرائی بھی ہے۔'' (۴)

اکبر حمیدی کی خودنوشت (جست بھر زندگی) کی ایک ایک سطر دل پر اثر کرنے والی ہے اور ان کی زندگی کے کئی گوشے وا کرنے والی ہے۔آج اکبر حمیدی اپنی خودنوشت میں سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔آیئے اکبر حمیدی کی خودنوشت سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

''میری زندگی کے تین حصے ہیں۔گاؤں کی زندگی، گوجرانوالہ شہر کی زندگی اور پاکستان کے دارالخلافہ اسلام آباد شہر کی زندگی مگر ہاں ایک اور زندگی جو ہم سب اندر ہی اندر بسر کرتے رہتے ہیں۔میری زندگی کئی طرح کے تجربوں سے بھری پڑی ہے۔میری زندگی میں گنوار سے لے بہت مہذب، جاہل سے لے کر بہت صاحبِ علم، لفنگے سے لے کر بہت شریف، مذہبی سے لے کر بہت سخت غیر مذہبی لوگ شامل ہوئے ہیں۔میں نے بہت آسودہ بھی اور بہت ناآسودہ حالات بھی بسر کیے ہیں۔میں نے کلرکی سے لے افسری تک بھگتی ہے۔دسویں گریڈ کی کلرکی اور پھر اٹھارویں گریڈ کی اسسٹنٹ پروفیسر پھر صدرِ شعبہ اردو''(۵)

''جست بھر زندگی'' کے اس اقتباس سے پتا چلتا ہے کہ وہ ایک ایسی زندگی گزارتے رہے ہیں جس میں واقعات کی تلخیاں ہوتی ہیں اور زندگی کو قریب سے دیکھا جا سکتا ہے۔یہ اور بات ہے کہ زندگی کا مشاہدہ ہر شخص اپنی تخلیقی اور تنقیدی صلاحیت سے ہی کرتا ہے جو جتنا بڑا تخلیق اور نقاد ہوتا ہے وہ زندگی کا اتنا ہی گہرا مشاہدہ کرتا ہے۔چونکہ اکبر حمیدی ایک تخلیق کار تھے اس لیے انہوں نے زندگی کے تلخ تجربات کو تخلیقی اور تنقیدی نظر سے دیکھا اور اپنی خودنوشت (جست بھر زندگی) میں پیش کر دیا۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر رشید امجد،'تمنا بے تاب' پورب اکادمی اسلام آباد، طبع دوم مئی ۲۰۰۷ء، ص ۷

۲۔ حیدر قریشی، جدید ادب شمارہ نمبر ۲، جرمنی، جنوری تا جون ۲۰۰۴ء، ص ۱۸۹

۳۔ رفیق سندیلوی (مرتب)'اکبر حمیدی کا فن' بُٹر پبلشرز اسلام آباد اشاعت اول، اپریل ۲۰۰۳ء، ص ۱۹۷

۴۔ رفیق سندیلوی (مرتب)'اکبر حمیدی کا فن' بُٹر پبلشرز اسلام آباد اشاعت اول، اپریل ۲۰۰۳ء، ص ۲۰۰

۵۔ اکبر حمیدی'جست بھر زندگی' بُٹر پبلشرز اسلام آباد اشاعت اول، مارچ ۱۹۹۹ء، ص ۵۱

جان پیاری ہے تو بس چلتے چلے جاؤ میاں   کیوں کھڑے ہو یہ درِ یار نہیں ہے بھائی
عشق کرنا ہے تو چھٹی نہیں کرنی کوئی   عشق، میں ایک بھی اتوار نہیں ہے بھائی

اکبر حمیدی

حیدر قریشی (جرمنی)

جست بھر زندگی

(خودنوشت)

اکبر حمیدی ہمہ جہت شاعر اور ادیب ہیں۔شاعری، انشائیہ نگاری، خاکہ نگاری، کالم نگاری، کے مختلف مقامات سے کامیابی سے گزرنے کے بعد انہوں نے حال ہی میں اپنی خودنوشت سوانح ''جست بھر زندگی'' شائع کی ہے۔اس کتاب کے گیارہ ابواب ہیں۔اکبر حمیدی نے گوجرانوالہ کے ایک گاؤں سے شروع ہونے والے اپنی زندگی کے مہ و سال کا ایک گوشوارہ سا اس کتاب میں پیش کر دیا ہے۔اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اکبر حمیدی نے کس ماحول میں آنکھ کھولی، کس طرح پلے بڑھے، تعلیم سے لے کر ملازمتوں تک کے احوال، عزیز و اقارب اور دوستوں، دشمنوں کے حالات۔ادبی زندگی آغاز سے اب تک کس طرح گزری۔غرض اس میں ہمارے ایک عہد کی کئی اہم جھلکیاں اس طرح دکھائی دیتی ہیں کہ ان کے ذریعے سے پورے عہد کے بارے میں واضح تاثر قائم کرنا آسان ہو جاتا ہے۔اکبر حمیدی چونکہ بنیادی طور پر شاعر اور ادیب ہیں اس لئے ان کی زندگی کا یہی رُخ اس کتاب کا سب سے اہم پہلو ہے۔اس زاویے سے اس کتاب کے توسط سے پتہ چلتا ہے کہ اکبر حمیدی کو بعض غزلیں مکمل طور پر نہ صرف خواب میں ہوئیں بلکہ جاگنے کے بعد وہ غزلیں انہیں پوری یاد بھی رہیں۔اسے یقینی طور پر ان کی وجدانی قوت کا کرشمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔بعض غزلیں بروقت نوٹ نہ کرنے کے باعث بھول بھی گئیں۔

وجدان کے حوالے سے اکبر حمیدی کی زندگی میں ایک درویش کا قصہ بھی دلچسپ ہے۔اسے اکبر حمیدی کے الفاظ میں دیکھتے ہیں:

''ایک اور درویش ہمارے گاؤں میں آیا۔راتوں کو گلیوں میں پھرتا۔علامہ اقبال کے اشعار بلند آواز میں گاتا پھرتا، اپنے آپ کو وقت کا قلندر کہتا۔گاؤں سے شمال کے قریبی قبرستان میں رہتا تھا بہت خوبصورت آدمی تھا۔پینتیس چالیس سال کا گورا چٹا بھرپور جوان۔کلین شیو، بہت چمکتا دمکتا۔ہم محلے کے نوجوان اس کے گرویدہ ہو گئے۔ایک روز اس نے سعید اختر کو جنوب کا اور مجھے شمال کا گورنر مقرر کیا۔اتفاق دیکھئے کہ سعید اختر سندھ میں جا بسا اور میں شمال میں اسلام آباد۔اس قلندر کے ساتھ ہم محلے کے لڑکے اکثر سردائی پیتے تھے۔''

اکبر حمیدی نے اپنی زندگی کی روداد لکھتے وقت جہاں زندگی کے بہت سے واقعات اور نشیب و فراز کو بیان کیا ہے وہیں اپنے تاثرات کو بھی خاصی تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔کسی واقعہ کی نسبت سے کوئی تاثر ایک حد تک مناسب رہتا ہے بعض اوقات اس تاثر یا تشریح کی کسی حد تک ضرورت بھی ہوتی ہے لیکن جب وہ تاثر تقریر یا خطبہ بننے لگے تو اس سے اسکی ادبی قدر و قیمت پر بہر حال فرق پڑتا ہے۔''جست بھر زندگی'' میں یہ مسئلہ بار بار سامنے آتا ہے کہ وہ کسی تاثر یا تصور پر خاصی تفصیلی اور تشریحی گفتگو کرنے لگتے ہیں۔ممکن ہے اس کا کوئی مثبت رُخ ہو جو سر دست میرے علم میں نہیں آ پایا۔اس خامی کے باوجود اس میں شک نہیں کہ بعض مقامات پر اکبر حمیدی کے تاثرات نے ''اقوالِ زرّیں'' کا مقام حاصل کر لیا ہے۔اس کی چند مثالیں کتاب سے پیش کرتا ہوں:

☆☆ زیادہ فرمانبرداری اور صورتحال سے مرعوبیت انسان کی شخصیت کو کمزور کر دیتی ہے۔انسان فرمانبرداری وہاں کرتا ہے جہاں اس کا چارہ نہیں چلتا۔۔۔فرمانبرداری اور چیز ہے، شکر گزاری اور بات۔فرمانبرداری میں اپنی ذات کی نفی ہے اور شکر گزاری میں اپنی ذات اور حیثیت کا اثبات'' (ص ۶۱)

☆☆ میرا خیال ہے خواب ہماری نیندوں کے خیال ہیں اور خیال ہماری بیداری کے خواب۔(ص ۵۴)

☆☆ اعتقاد کی پختگی اکثر عقل کی خامی بن جاتی ہے۔(ص ۳۲۸)

مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرنے والے ادیبوں کو عموماً دوستوں اور کرم فرماؤں سے اس قسم کی باتیں سننا پڑتی ہیں کہ اگر خود کو ایک دو اصناف تک محدود رکھتے تو زیادہ بہتر تھا۔اس سلسلے میں میرا موقف ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ اچھا ادیب اپنی میلانِ طبع کے باعث جن اصناف میں بھی کچھ تخلیق کرتا ہے اس کا ایک کم از کم معیار ضرور دکھائی دے گا۔اور وہ اپنے اس کم از کم معیار سے نیچے جاتا دکھائی نہیں دے گا۔اس کے برعکس بُرا ادیب ایک ہی صنف میں جان مارتا رہے اس میں بھی وہ بُرا ہی لکھتا رہے گا۔چونکہ اکبر حمیدی بھی کئی میدانوں میں طبع آزمائی کر چکے ہیں اس لئے انہیں بھی اس اعتراض کا سامنا رہا لیکن انہوں نے اس کا بالواسطہ طور پر بہت عمدہ جواب دیا ہے۔

''ایک تخلیق کار زمین کی مانند ہے۔بنجر زمین تھوراگلتی رہتی ہیں۔بعض زمینیں کسی ایک فصل کے لئے مخصوص ہو جاتی ہیں ان میں کچھ اور نہیں اگتا۔بعض زمینیں بہت سی فصلوں کے لئے موزوں ہوتی ہیں۔اب کسان کی ہمت ہے کہ وہ کیا کیا کاشت کرتا ہے اور کون کون سی فصلیں اٹھاتا ہے۔مجھے یاد ہے ہماری تحصیل گوجرانوالہ کی زمین چاول، گندم، گنا، کپاس، مکئی، باجرہ، برسیم غرض کئی فصلوں کے لئے موزوں ہے۔۔کچھ ایسا ہی حال زرخیز ذہن تخلیق کار کا ہے'' (ص ۲۴۱)

اکبر حمیدی جیسے فعال اور زرخیز تخلیق کار کی یہ خود نوشت سوانح حیات ان کی زندگی کی روداد بھی ہے اور ان کے نظریۂ زندگی اور فن کے عقبی دیاروں کو سمجھنے کے لئے ایک معاون کتاب بھی ہے۔زندگی سے بھری ہوئی یہ کتاب موت کے بارے میں کچھ نہیں کہتی صرف زندگی کی بات کرتی ہے۔مثبت طور پر جینے کی بات کرتی ہے۔

سلیم آغا قزلباش (سرگودھا)

اشتہاروں بھری دیواریں

اکبر حمیدی کا شمار ستر کی دَہائی میں اُبھرنے والے چند اہم انشائیہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ستر کی دہائی کو صنفِ انشائیہ کے دورِ ثانی سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔اکبر حمیدی کا نام اس حوالے سے بھی قابلِ ذکر ہے کہ انہوں نے ایک تسلسل سے صنفِ انشائیہ میں طبع آزمائی کی ہے جب کہ دوسرے بیشتر انشائیہ نگار اس معاملے میں تسلسل کو برقرار نہیں رکھ سکے۔مزید برآں یہ کہ اکبر حمیدی کو اردو انشائیہ پڑھنے والوں کے ایک بڑے حلقے میں کافی پذیرائی بھی ملی ہے۔تعداد کے اعتبار سے بھی انہوں نے سب سے زیادہ انشائیے قلم بند کیے ہیں۔مقدار کے ساتھ ساتھ معیار کو برقرار رکھنا ایک نہایت مشکل امر ہے۔تاہم اکبر حمیدی نے اس توازن کو ایک بڑی حد تک قائم رکھا ہے۔ان کے انشائیوں کے چار مجموعے پہلے ہی شائع ہو چکے ہیں۔حال ہی میں ان کے انشائیوں کا پانچواں مجموعہ بعنوان ''اشتہاروں بھری دیواریں'' منصۂ شہود پر آیا ہے۔

اکبر حمیدی کے اس تازہ مجموعے کے کم و بیش تمام انشائیوں میں رجائیت کا پہلو خاصا نمایاں ہے، یوں بھی ان کا فلسفۂ زندگی مثبت زاویۂ نظر پر استوار رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ طنزیہ لب و لہجے کی کاٹ ان کے انشائیوں میں نہ ہونے کے برابر ہے۔البتہ شگفتنِ ذات کا پہلوان کے انشائیوں میں تازگی کی خوشبو بھر دیتا ہے۔مثبت سوچ کا زاویۂ نظر اختیار کرنے کی بنا پر وہ ہمیشہ گلاس کو آدھا بھرا ہوا کہتے ہیں۔دوسری ایک خاص بات جو مجھے ان کے انشائیوں میں نظر آئی ہے وہ خود کلامی یا گفتگو کرنے کا انداز ہے۔صیغۂ واحد متکلم کے استعمال کی وجہ سے قاری اور لکھاری کے مابین فاصلہ کم ہو جاتا ہے۔اور قاری محسوس کرتا ہے کہ ہر بات بلا واسطہ اس پر آشکار ہو رہی ہے۔

انشائیے میں آغاز اور انجام بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ایک اچھے انشائیے کا پہلا جملہ ہی بڑا موثر ہوتا ہے جو قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لیتا ہے۔اسی طرح انشائیے کی اختتامی سطور بھی خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ایک منجھا ہوا انشائیہ نگار، اختتامی سطور کو اس فنی چابکدستی سے احاطہ تحریر میں لاتا ہے کہ وہ بلا شبہ Punh Line کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔اکبر حمیدی کے متعدد انشائیوں میں یہ دونوں خصوصیات دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔

فلسفیانہ موشگافی یا دانش کی باتیں سہل و سادہ پیرائے میں بیان کرنا قطعاً آسان نہیں ہوتا۔اس ضمن میں معمولی سی لغزش قلم انشائیے کو بوجھل پن سے ہمکنار کر سکتی ہے، جس سے انشائیے کی روانی میں تعطل نمودار ہو جاتا

ہے۔اکبر حمیدی کے انشائیوں میں دانائی اور حکمت کی باتوں کو اس خوبصورتی سے پیش کیا جاتا ہے کہ کہیں بھی بوجھل پن کا احساس تک نہیں ہوتا۔دوسری طرف شگفتگی کا پہلو اُن کے انشائیوں میں۔۔۔۔Read Ability یعنی قابلِ مطالعہ ہونے کے عنصر میں اضافہ کر دیتا ہے اور اسی خاصیت کے باعث ان کے انشائیے قارئین کے ایک بڑے حلقے میں ذوق وشوق سے پڑھے جاتے ہیں۔

اردو انشائیہ کے مخالفین، یہ الزام ہمیشہ سے عائد کرتے رہے ہیں کہ اردو انشائیہ عصری مسائل پر روشنی نہیں ڈالتا۔یہ الزام سراسر مخالفین کی کج فہمی کا غماز ہے۔میرے نزدیک انشائیہ نے عصری مسائل اور عصریت کے زاویوں کو کمالِ ہنرمندی سے اُجاگر کیا ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ انشائیہ بالواسطہ طریقے سے اُن مسائل کو چھوتا ہے، کیوں کہ انشائیہ کوئی تجزیاتی رپورٹ یا اخباری کالم نہیں جو مختلف النوع مسائل اور حالاتِ حاضرہ کو معروضی انداز میں پیش کرنے تک محدود رہے۔اکبر حمیدی کے تحریر کردہ انشائیوں کا مطالعہ کرتے ہوئے نہ صرف یہ کہ ہم عصری مسائل کو بآسانی نشان زد کر سکتے ہیں بلکہ انشائیہ نگار کے زاویۂ نظر سے مختلف النوع مسائل کی ایک نئی حقیقت اور ماہیئت سے بھی آگاہ ہو جاتے ہیں۔

اکبر حمیدی کے انشائیوں میں دروں بینی کا پہلو بھی توجہ طلب ہے وہ مظاہر اور انسانی روابط کے خارجی پہلوؤں کی نشاندہی کرنے تک محدود نہیں رہتے بلکہ ان کے مخفی مفاہیم کو گرفت میں لینے کی کاوش بھی کرتے ہیں۔اسی لیے ان کے انشائیے ہمیں غور وفکر پر مائل کرتے ہیں۔اس سلسلے میں اکبر حمیدی اپنے اکثر انشائیوں میں۔۔۔سوال اُٹھاتے ہیں اور قارئین کو سوچنے پر آمادہ کرتے ہیں۔وہ ان سوالات کے جوابات خود مہیا کرنے کی سعی نہیں کرتے، حالانکہ اُٹھائے گئے سوالات کے جوابات اُن کے انشائیوں کے غائر مطالعہ سے قاری از خود اخذ کر سکتا ہے۔بہر کیف دعوتِ فکر کا یہ پیرایہ ان کے انشائیوں کی معنی آفرینی میں اضافہ کر دیتا ہے۔

جس طرح تالاب میں کنکر پھینکنے سے دائرہ در دائرہ لہروں کا ایک سلسلہ نمودار ہوتا ہے جو کناروں تک پھیلتا چلا جاتا ہے۔بالکل اسی طرح اکبر حمیدی کے انشائیوں میں سوچ کی کنکری، دائرہ در دائرہ خیالات کو جنم دیتی ہے، جو ایک دوسرے کو کروٹ دیتے ہوئے پھیلتے چلے جاتے ہیں۔دوسرے یہ کہ ان کے انشائیوں کا مطالعہ کرتے ہوئے لخت لخت ہونے کا احساس پیدا نہیں ہوتا۔میری رائے میں وحدتِ خیال اور وحدتِ تاثر کے پہلوؤں کو انشائیہ کی کامیابی کی واضح دلیل قرار دیا جاسکتا ہے۔اور اکبر حمیدی کے انشائیے اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔

''اشتہاروں بھری دیواریں'' کے کل صفحات 106 ہیں، سالِ اشاعت 2007ء ہے۔مجموعے میں شامل انشائیوں کی تعداد 21 ہے۔کتاب کی کمپوزنگ معیاری ہے اور سرورق دیدہ زیب ہے۔اسے بزّ پبلشر اسلام آباد نے بڑے سلیقے سے شائع کیا ہے۔کتاب ملنے کا پتہ ہے:

''ہاؤس نمبر 2029، سٹریٹ 32، سیکٹر آئی 10/2، اسلام آباد۔''

خاور اعجاز (ملتان)

اکبر حمیدی کی ''اشتہاروں بھری دیواریں''

کسی بھی زبان میں در آنے والی نئی اصناف کے بارے میں ناقدین کے بہت سے تحفظات ہوتے ہیں جن میں سے بعض وقت کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں اور بعض اپنی شکل تبدیل کر لیتے ہیں۔انشائیہ اگرچہ کوئی نئی صنف نہیں کہ اس کے مآخذ سر سید احمد خان کی تحریروں تک میں موجود دکھائے گئے ہیں البتہ کچھ عرصہ پیشتر یہ صنف جس تحریک کے تحت ادبی منظر نامے پر اجاگر ہوئی ہے اس کی مثال اس سے پیشتر موجود نہیں۔کچھ معترضین نسبتاً کمزور انشائیوں کے حوالے سے اس صنف پر حرف زنی بھی کرتے رہے ہیں یہ دیکھے بغیر کہ ایسی ہی کمزوریاں دوسری اصناف میں بھی پائی جاتی ہیں اور خود اُن میں بھی! شعرا اور ادبا محض اپنی تحریروں کی وکالت میں زمین آسمان ملاتے رہتے ہیں اور کھُلے دل سے دوسروں کی خوبیوں کا اعتراف کرنے سے گریزاں رہتے ہیں اور اکثر یہ چاہتے ہیں کہ دنیا ان جیسی ہو جائے، انہی کی زبان بولے اور انہی کی وضع قطع اختیار کر لے۔لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی اپنی بولیوں پر اصرار کرنے والوں کا ایک جمگھٹا لگا رہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم تعصب کا شکار ہو کر بہت سے ایسے رجحانات کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے ہیں جن میں آگے چل کر کوئی بہتر رخ اختیار کر لینے کی صلاحیت ہوتی ہے۔انشائیہ اور انشائیہ کی تحریک اس کی ایک مثال کہی جاسکتی ہے جسے کئی ایک نے اپنے اپنے اکھاڑے میں کھینچنے کی کوشش کی لیکن اس نے سب کو پچھاڑ کر میدان میں اپنا جھنڈا گاڑ دیا۔

اکبر حمیدی اس صنف کے ان فدائین میں شامل ہے جنھوں نے اس کو وسیع پیمانے پر متعارف کرایا، اس کی شناخت بنائی اور اس کو اپنا جھنڈا گاڑنے میں بھرپور مدد کی۔وہ دوسروں کی طرح بم باندھ کر معترضین کی صفوں میں دہشت پھیلانے کی بجائے اپنے لفظوں کی طاقت اور اپنے ذہن کی زرخیزی سے اس صنف کو خوبصورت بنانے میں مصروف رہا اور اب یہ صنف واقعی اتنی خوبصورت ہو گئی ہے کہ مخالفین بھی اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے ہیں۔مَیں سمجھتا ہوں کہ اکبر حمیدی کی یہ چال اسے انشائیہ کی جنگ کا ایک اعلیٰ جرنیل بناتی ہے جو محض اسلحے پر ہی انحصار نہیں کرتا بلکہ دماغ سے بھی کام لیتا ہے۔وہ اپنے تجربے کی لو میں بات کرتا ہے۔اس کے ہاں زبان کا مزہ ہے۔وہ عام باتوں سے ہی اپنی بات بنا لیتا ہے اور یہی انشائیہ نگار کا بہترین ہتھیار رہے۔اپنے

انشائیے ’’رشتے ناطے‘‘ میں وہ کہتا ہے کہ ’’مَیں نے رشتے ناطے کا دفتر نہ کھولا ہے اور نہ ہی کھولنے کا ارادہ ہے البتہ جب سے مَیں سنِ بلوغت کو پہنچا ہوں، اس قسم کا ایک دفتر از خود میرے اندر کہیں کھل گیا ہے‘‘ اکبر حمیدی کی اس بات سے یہ اندازہ کرنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوتی کہ اس کی ذات میں رشتے ناطے بنانے کی صلاحیت قدرتی اور خدا داد ہے۔ یہی وہ صلاحیت ہے جو کسی بھی شخص کو اپنی ذات میں نئے معانی تلاش کرنے، اپنے اردگرد کو نئی نظر سے دیکھنے اور کائنات کے لامتناہی سلسلوں کو دفترِ دل سے جوڑنے میں معاون ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ’’ایک ہی جگہ پر، ایک ہی زمین پر بلکہ ایک ہی درخت پر دکھائی دینے والے پتوں کی کہانیاں کتنی مختلف ہیں! (انشائیہ: **دنیا کی کہانی**)

یہ وہ انشائی رویہ ہے جو دوسروں کو ایک ہی طرح دکھائی دینے والی چیزوں کے بطون میں چھپے اختلافات تک رسائی دیتا ہے، انہیں ایک دوسرے سے الگ کر کے دکھاتا ہے اور ان کی ایسی جزئیات سامنے لاتا ہے جو انشائیہ نگار کی خوردبین تلے ہی نظر آتی ہیں۔ یوں تو یہ کام ایک اچھا مضمون نگار بھی انجام دے سکتا ہے لیکن وہ دنیا جو انشائیہ نگار کو دکھائی دیتی ہے مضمون نگار کے بس کا روگ نہیں ہوتی سو مضمون نگار اکبر حمیدی کو جو مماثلتیں نظر آتی ہیں وہ انشائیہ نگار اکبر حمیدی کے لیے اختلافات بن جاتے ہیں ’’آپ اگر چاہیں تو بے شک اسے میری ایک خوبی سمجھ لیں یا میری ذہانت، آخر ایک بار ایسا سمجھ لینے میں حرج بھی کیا ہے! جب کہ مَیں نے کئی مرتبہ آپ کو ذہین سمجھ لینے کی ذہانت کا مظاہرہ کیا ہے‘‘ (انشائیہ: **خوشیوں کی تلاش میں**)

اب آپ ہی سچ بتائیں کہ دوسروں کو خوشی کی فراہمی کے لیے کوئی لکھاری ایسی ذہانت آمیز تحریر لکھنے کا ملکہ رکھ سکتا ہے سوائے ایک انشائیہ نگار کے۔ مَیں نے دیکھا ہے کہ انشائیہ نگار اکبر حمیدی۔۔۔ ناقد اکبر حمیدی، مضمون نگار اکبر حمیدی اور شاعر اکبر حمیدی سے نہ صرف مختلف ہے بلکہ چالاک بھی (آپ اسے ذہین بھی کہہ سکتے ہیں) وہ بات کو ایسی پرت دیتا ہے کہ وہ عام ہوتے ہوئے بھی اکبر حمیدی کا اختصاص بن جاتی ہے۔ اوپر دیئے گئے اکبر حمیدی کے فقروں میں آخری ’’ذہانت‘‘ پر غور کیجیے اور اسے لفظ ’’چالاکی‘‘ سے بدل کر پڑھیے۔ دیکھا! اکبر حمیدی نے کس چالاکی سے آپ کو اپنی ذہانت کے نرغے میں لے لیا تھا!! بس یہیں انشائیہ نگار اکبر حمیدی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ’’آپ کو بھی میں ایسا ہی، اپنے سے کچھ کم ہی سہی، مگر ذہین آدمی سمجھتا ہوں، جو تتلی کی طرح پھول سے دوستی بھی کرتی ہے اس کے رس رنگ بھی اڑاتی ہے مگر شام ہوتے اس کے ساتھ مرجھا نہیں جاتی‘‘ (انشائیہ: **دوستی کی مخالفت میں**)۔ یہاں وہ دوستی کی مخالفت میں اپنا اظہار کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ دوستی کا پھول مرجھا جانے کے باوجود آپ خود کو تر و تازہ رکھیں۔ وہ بجلی فیل ہو جانے کو مسئلہ نہیں سمجھتا بلکہ نہ فیل ہونا اس کے لیے مسئلہ بن جاتا ہے۔ دیارِ غیر میں بارش اور طوفان کے باوجود بجلی فیل نہ ہونے پر اسے غصہ آیا اور ’’یہ اندیشہ بھی لاحق ہوا کہ یہ لوگ (اس کی) عادتیں خراب کر دینے کے درپے تو نہیں ہیں۔۔۔ کافر کہیں کے!‘‘ (انشائیہ: **جب بجلی فیل ہو جائے**) یقین جانیں آخری تین لفظوں کا جو لطف یہاں آیا شاید آپ کو بھی پہلے کہیں اور نہ آیا ہو!!

اکبر حمیدی کا کہنا ہے کہ ایک سیدھ میں رہنے والوں کو بڑی آسانی سے شکار کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی ایک صنف کی سیدھ میں چلتے رہنے کی بجائے کئی اصناف میں آوارہ خرامی کرتا ہے۔ اس آوارہ خرامی کو انشائیہ کی فضا اس لیے بھی راس آئی ہے کہ اس صنف میں آوارہ خرامی کی جتنی گنجائش موجود ہے کسی اور میں نہیں اور ویسے بھی اکبر حمیدی شکار ہونا پسند نہیں کرتا، اسے شکار کرنا بھی اچھا نہیں لگتا، وہ دوست پروری کا قائل ہے اور مجھے لگتا ہے کہ انشائیہ نگاری اس کے اِسی دام میں آئی ہوئی ہے!!!

اکبر حمیدی کے انشائیے مجموعی طور پر مزاحیہ عنصر سے گریزاں نظر آتے ہیں۔ ’’جزیرے کا سفر‘‘ میں اُس نے کہیں کہیں مزاح کے فارمولے سے کام لیا ہے مگر جلد ہی اس کو اس امر کا احساس ہو گیا کہ یہ فارمولا اس کے وضع کردہ انشائی اسلوب کے لیے ناموزوں ہے۔ ادبِ عالیہ اور ہنسنے ہنسانے کے کام میں بہت فرق ہوتا ہے۔ مسخروں کی اچھل کود، جگت بازوں کے تند و تیز گرم جملوں اور بونوں کی مضحکہ خیز حرکتوں سے طفلانہ ذہن تو تحریک و تنشیط پا سکتا ہے لیکن وہ دماغ نہیں جس کی تشفی کا مدار قہقہے یا باچھیں کُھلنے پر نہیں ہوتا، اُس محسوساتی جھونکے پر ہوتا ہے جس کے مَس سے روح کو توانائی اور بہجت نصیب ہوتی ہے اور انسانی جذبے کے بطون میں رنگا رنگ کیفیتوں کے بے شمار دریچے کھل جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اکبر حمیدی کے انشائیے سماجی شعور کے پروردہ ہیں۔ اُس نے عام آدمی کی Projection پر خاصا زور دیا ہے۔ چھوٹا آدمی، ہیرو، نظام سقّہ، نقاد، درمیانی منزل، ضمیر کی مخالفت میں اور لوز تھنکنگ کا بنیادی محرک یہی جذبہ ہے۔ عامی لوگوں کو نمایاں جگہ دینے اور آبرومندانہ مقام عطا کرنے ہی سے جمہوری قدروں کو فروغ مل سکتا ہے۔ اکبر حمیدی کے نزدیک عام اور چھوٹے آدمی کے سادہ نظریات ضرر رساں نہیں ہوتے جبکہ بڑا آدمی نہ صرف مسائل حیات میں اضافے کا موجب بنتا ہے بلکہ اس کے نظریات کی درانتی کئی گردنوں کو کاٹنے کی ذمہ دار ٹھہرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر حمیدی نے دنیا کی سنگینی اور انہدام و انتشار میں بڑے آدمیوں کو شمار کیا ہے۔ اس کے مطابق چھوٹا آدمی اہم ہے۔ یہی اُس کا ہیرو ہے۔ اکبر حمیدی نے پشتینی شہنشاہ ہمایوں میں نہیں، ایک دن کے بادشاہ نظام سقّہ میں دلچسپی ظاہر کی ہے۔ دراصل عام اور چھوٹا آدمی ہی اُس کے خیال میں بڑا آدمی ہے۔ اس لیے کہ وہ محنت کار، شریف، غیرت منداور عالی حوصلہ ہے، ہماری آپ کی طرح شہر کے گلی کوچوں اور دیہاتوں کا باشندہ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اکبر حمیدی نے صنفِ انشائیہ کے ذریعے آدمی اور آدمیت کے مفہوم کو نئے سرے سے وضع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُس نے آدمی اور آدمیت کے اُن گوشوں کو دائرۂ نور میں لانے کا جتن کیا ہے جو دوراز کار موشگافیوں کے سبب فلسفیوں کی نظر سے اوجھل رہ جاتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ کام فلسفی سے زیادہ شاعر ہی انجام دے سکتا ہے اور اکبر حمیدی اصالتاً شاعر کا ذہن رکھتا ہے۔

(**اکبر حمیدی کے انشائیے۔۔ایک مطالعہ** مضمون از **رفیق سندیلوی** سے اقتباس)

محمود احمد قاضی (گوجرانوالہ)

اکبر حمیدی کے انشائیے کی کہانی

ابھی حال ہی میں انشائیہ کی تازہ بہ تازہ کتاب ''اشتہاروں بھری دیواریں'' سامنے آئی ہے۔ بقول اکبر حمیدی یہ اُس کے انشائیوں کی پانچویں کتاب ہے اور یوں اُس نے انشائیوں کی سینچری بھی مکمل کر لی ہے لیکن ساتھ ہی اُس کا کہنا ہے کہ اُس نے ہمیشہ مقدار سے زیادہ معیار پر نظر رکھی ہے۔ اور میں کہتا ہوں خوب رکھی ہے کہ یہی چیز اُسے دوسروں سے ممتاز بھی کرتی ہے۔ میں اس کی اس بات سے بھی اتفاق کرتا ہوں کہ کوئی بھی صنف بجائے خود بُری یا اچھی نہیں ہوتی بلکہ اگر وہ بری ہے کم تر معیار کی ہے تو بھی لکھنے والے کا ہی عجز ہوگا اور کچھ نہیں۔ لیکن یہیں میں ساتھ ہی یہ کہنے کی جسارت بھی کروں گا کہ چند لوگ ایسے ضرور ہوتے ہیں جو کسی بھی صنفِ ادب کا وقار بن جاتے ہیں یا جن کی وجہ سے وہ صنفِ ادب جانی اور پہچانی جا سکتی ہے دوسری اصناف چونکہ یہاں زیرِ بحث نہیں اس لیے میں یہ برملا کہہ سکتا ہوں کہ خصوصاً میرے انشائیے سے لگاؤ، اُسے پسند کرنے کی وجہ محض اور محض اکبر حمیدی کا انشائیہ ہے۔ کیوں کہ یہ انشائیے سے دیگر کچھ چیز بن جاتی ہے۔ میں یہاں کسی الجھن کے بغیر یہ بھی کہتا چلوں کہ اکبر حمیدی جہاں ایک منجھا ہوا، مشّاق غزل گو ہے (گو کہ نقاد نے اُس کی غزل سے بے اعتنائی بھی کی ہے) وہاں وہ ایک پختہ کار اور اپنی ہی طرز کا نثر نگار بھی ہے۔ اُس کا اسلوب اتنا سادہ پُر کشش اور دل موہ لینے والا ہے کہ آپ اُس کے انشائیے کے مختلف ابعاد میں اپنے shaday کا لطف اُٹھا سکتے ہیں۔ وہ اپنی غزل کے بارے میں کہتا ہے۔

الفاظ تو سب میری غزل کے بھی وہی ہیں
لیکن ہیں میرے زیرو زبر اور طرح کے

اور یہی ''اور طرح'' اُس کے ہر ہر انشائیے میں جاری و ساری ہے۔ یہ اُس کا زعم یا تعلّی نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے، عین سچ ہے۔

''یہ دنیا مجھے رنگا رنگ کہانیوں سے بھری ہوئی خوبصورت کتاب نظر آتی ہے اس کتاب کا آغاز جس

دیباچے سے ہوا تھا وہ دیباچہ بذاتِ خود ایک کہانی ہے۔''

(انشائیہ: دنیا ایک کہانی)

میں جس بات سے اکبر حمیدی کے انشائیہ کے حمایت میں آغاز کرنا چاہتا تھا وہ اکبر حمیدی نے خود ہی کہہ دی اوپر کی سطروں کو پھر سے پڑھیے۔ آپ کو لگے گا کہ اکبر حمیدی نے ایک کلید ہمیں دے دی ہے کہ اُس کا انشائیہ دوسروں سے مختلف اور جدا اہمیت کا حامل کیوں ہے۔ اُس کا انشائیہ ایک کہانی' بھی تو ہے۔ اُس کے اندر ایک کہانی کا راَزل سے چھپا بیٹھا ہے اور وہ انشائیے کے پردے کے پیچھے سے نمودار ہوتا ہے۔ اسی لیے اُس کا رنگ اور ہے ڈھنگ مختلف ہے۔ وہ ذہنوں پر کاری وار نہیں کرتا بلکہ ملائمت سے وہ بات بھی کہہ ڈالتا ہے جس کو کہنے کے لیے دوسروں کو شاید بہت بھاری ہتھیاروں کی ضرورت پڑتی ہے۔

''بادشاہ تو پھر بادشاہ ہوتے ہیں۔ میں اُن پاگلوں کی بات کر رہا ہوں جو جمہوریت کے نام پر بادشاہت کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس دنیا کے پاگل خانے میں صرف عام آدمی یا تخلیق کار ہی نارمل ذہن کے لوگ ہیں اور دنیا کا توازن انہی لوگوں کے باعث قائم ہے یہ وہ لوگ ہیں جو اس دنیا کے بڑے پاگل خانے میں اپنا ذہنی توازن قائم رکھے ہوئے ہیں۔'' **(انشائیہ: دنیا ایک کہانی)**

کیا اُس کے الفاظ ایک طرح کی فلاسفی اور وزڈم سے بھرے ہوئے نہیں ہیں۔ یقیناً ہیں لیکن کتنے ہلکے پھلکے۔ کتنے جامع اور بھلے لگنے والے ہیں' یہاں شاعر اکبر حمیدی اور انشائیہ نگار اکبر حمیدی آپس میں معانقہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اکبر حمیدی یقیناً اپنی زندگی کی طرح ادب میں بھی رکھ رکھاؤ اور شان والا دکھائی دیتا ہے۔ اُس کے پاس تمکنت تو ہے لیکن یہ محبت سے یوں لتھڑی رہتی ہے کہ بس کچھ نہ پوچھیے۔ وہ تو سارا کا سارا بس رس گُلے کے شیرے جیسا ہے۔ جو رس گُلے میں نہ ہو تو وہ بے کار ہوتا ہے۔

میں خود اکثر سوچا کرتا ہوں کہ اگر آپ کو اپنی ذات کا صحیح جلوہ دکھانا مقصود ہو تو ذرا اپنے خول سے باہر نکل کر دیکھئے۔ ہر وقت ادیب، شاعر، مفکّر ہی نہ بنے رہا کریں۔ آپ ایک عام آدمی بھی تو ہیں۔ خوشی سے گلے ملنے کے لیے تو آپ کو اونچے آدرشوں کے چبوتروں سے نیچے اُترنا ہی پڑے گا۔ تبھی تو آپ حکیم الامّت ہوتے ہوئے بھی، ایک بڑے شاعر ہوتے ہوئے بھی اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ فالودے کو فالودہ ہی کہا جاتا ہے، آپ کہتے ہیں۔۔۔ 'پھلودہ' آپ ایسا کہہ کر بھی وہی رہیں گے جو کہ آپ ہیں لیکن ایسا کرنے سے بس ذرا خلقِ خدا کے زیادہ قریب آ جائیں گے اور یُوں آپ آسودگی کے ساتھ سانس بھی لے سکیں گے۔

کسی نے جیسے چپکے سے مجھے کہا ہو

''حمیدی صاحب' آپ چیزیں ہمیشہ اپنی ہی قیمت پر خریدتے ہیں۔ کبھی دوسرے کی قیمت پر بھی لے لیا کریں آپ کے پاس اگر اُسے دینے کے لیے پیسے ہیں تو اُس کے پاس آپ کو دینے کے لیے خوشیاں

ہیں اور خوشیاں ہمیشہ پیسوں سے زیادہ قیمتی ہوتی ہیں۔''

(انشائیہ: **خوشیوں کی تلاش میں**)

دیکھا آپ نے اکبر حمیدی کا استادانہ فن لیکن جو کہ اُس نے بچوں جیسی سیرت کے ساتھ ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا کر پیش کیا ہے۔ اُس کی نثر ہمیشہ مجھے ہمیشہ تھر کے صحراؤں کی تپش کے درمیان ٹھنڈے پانی کا پیالہ لگی ہے اور اس ایک پیالے پر کئی بادشاہیاں قربان کی جاسکتی ہیں۔

''تاریخ گواہ ہے کہ جو قومیں ضرورت سے زیادہ مہذب اور کلچرڈ ہو جاتی ہیں وہ پھر اتنی کمزور ہو جاتی ہیں کہ جلد ہی کسی دوسری خونخوار قوم کے شوقِ فتوحات جسے 'شوقِ فضول کہنا زیادہ موزوں ہے' کی خونخواری کا شکار ہو جاتی ہیں۔''

''یہ قیمتی باتیں اختلافی بھی ہوسکتی ہیں اور آپ ان سے اختلاف کر سکتے ہیں مگر میرے 'اندر کا آدمی' اکثر مجھے ایسی باتیں بتاتا رہتا ہے۔''

اب دیکھئے کہ تاریخ کا شعور اُس کے لہو میں کیسے لہراتا ہے وہ یہاں مبلّغ بن کر نہیں سوچتا اور تبھی وہ اختلافی باتیں کرنے کی جرأت رکھتا ہے۔ میں اُسے جانتا ہوں وہ تو ہے ہی اختلافی۔۔۔ اچھائی اور برائی کے اُس کے اپنے معیارات ہیں جنہیں وہ کہنے سے ہچکچاتا نہیں۔۔۔ لیکن اُس کا سچ کھردرا نہیں۔ کان پھاڑ دینے والا نہیں۔۔۔ ایک ہلکی سی سرگوشی کی طرح ہے۔۔۔ آپ سے کچھ کہہ کے اپنے راستے کا موڑ مڑ جانے والا۔۔۔ آپ پر دباؤ ڈالنے والا بالکل نہیں۔۔۔ وہ بُرے سے نفرت نہیں کرتا۔ البتہ بہت زیادہ اچھائی بھی اُس کے نزدیک ایک 'کڑتن'' جیسی ہے۔ وہ جب لگے بندھے اُصولوں، نصب العینوں اور جامع خیالات سے اختلاف کرتا ہے تو یُوں ہی نہیں کرتا بلکہ ایسا کرتے ہوئے ہمیں ''قیمتی باتیں'' بتاتا چلا جاتا ہے جو کہ شاید دوسروں کے نصیب میں کم ہی ہوتی ہیں۔

''کانٹا ایک بگڑا ہوا ایک بچہ ہی سہی۔ مگر ہم نے اُس کی اصلاح کرنے اور اُسے معاشرے کے لیے مفید بنانے کے لیے اب تک کتنی کوشش کی ہے؟''

''آخر ہم کب تک 'جہاں پھول وہاں کانٹا' کی رٹ لگاتے رہیں گے کبھی ہمیں 'جہاں کانٹا وہاں پھول' کے الفاظ بھی کہہ کے دیکھ لینا چاہیئے''

(انشائیہ: **پھولوں میں گھرا کانٹا**)

دیکھا آپ نے یہ ہے اصل اکبر حمیدی۔۔۔ اپنی ہی فوک وزڈم کے ساتھ۔۔۔ خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال ایک شخص۔۔۔ جو اپنے الفاظ بھی برتتا ہے تو ایک سخی کی طرح ناں کہ ایک شُوم کی طرح۔ اُس کی انشائی نثر ایسی ہی خوبیوں، فکر انگیزیوں سے بھری پڑی ہے وہ ایک سچا اور کھرا فنکار ہے جو وقت کی سُولی پر چڑھتے

ہوئے بھی مسکراتا ہے لیکن ظلم کے چانٹے کے سامنے کبھی بھی اپنا دوسرا گال پیش نہیں کرتا بلکہ مزاحمت کرتا ہے۔

اس کتاب میں ویسے تو سبھی انشائیے ہمیں کچھ نہ کچھ کہنے پر اکساتے ہیں۔ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں لیکن انشائیہ ''اشتہاروں بھری دیواریں'' اس ضمن میں اپنا فریضہ کچھ زیادہ ہی اثر انگیزی سے ادا کرتا نظر آتا ہے۔

''سچ پوچھئے تو یہ کائنات مجھے شہروں بھری دنیا نظر آتی ہے، جس کی دیواریں، سب دیواریں اشتہاروں سے بھری ہیں بلکہ خود انسان جہاں کہیں بھی ہے، دیوار بن گیا ہے اور اس دیوار پر نظریوں، اعتقادوں، ملکوں، قوموں، نسلوں، جہتوں، مشغلوں کے اشتہار چسپاں ہیں جو کئی طرح کے تضادات سے بھرے ہیں اصل انسان تو اِن اشتہاروں کے نیچے کہیں چھپ گیا ہے۔ غائب ہو گیا ہے۔''

اُسے شاید اِسی ''غائب ہو جانے والے'' انسان کی تلاش ہے تبھی وہ ایک فنکار کا فریضہ ادا کرتا ہوا ہم سے براہ راست مکالمہ کرتا ہے اور یہ ایک زندہ آدمی کا زندہ آدمیوں سے مکالمہ ہے۔ مُردے اُس کا موضوع نہیں ہیں۔''

\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-

اکبر حمیدی انشائیے کی فنی اور تکنیکی ضرورتوں اور اس کے مزاج سے بخوبی آگاہ ہیں۔ میرے خیال میں ایک عمدہ انشائیے کی اولین خوبی یا ضرورت اس کی عمدہ نثر ہے۔ انشائیہ نگار محض کسی خیال یا بات کا سادہ زبان میں اظہار و بیان نہیں کرتا اسے ادبی نفاست اور تخلیقی خوشبو بھی عطا کرتا ہے اور جس طرح سمندر قطروں سے مل کر سمندر بنتا ہے اسی طرح کوئی فن پارہ لفظوں اور جملوں سے وجود میں آتا ہے۔ اس لیے بنیادی طور پر انشائیہ نگار کو شاعر اور افسانہ نگار کی طرح لفظوں کے بہترین استعمال کا سلیقہ ہونا چاہیے اور انشائیہ تو ایک بھی ڈھیلے ڈھالے جملے بلکہ کسی ایک لفظ کے بے محل استعمال کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ ذرا سی کوتاہی غفلت یا تن آسانی مخمل میں ٹاٹ کا پیوند ثابت ہوسکتی ہے۔ اکبر حمیدی لفظ آشنا ہے اور خوبصورت تخلیقی جملہ لکھنے پر قادر۔ چنانچہ اس کی نثر زندہ رواں دواں اور تکلف و تصنع سے پاک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے انشائیے دل میں اترتے اور اس کے جملے قلب و نظر کو روشن کرتے چلے جاتے ہیں۔ کوئی سا بھی موضوع ہو اس کی نثر کہیں سپاٹ یا بے رنگ نہیں ہونے پاتی۔ اپنی ادبی اور تخلیقی شان برقرار رکھتی ہے۔ ضرورت اور موقع کے مطابق وہ بیانیہ، علامتی یا استعاراتی تمثیلی لہجہ اور اسلوب اختیار کر لیتے ہیں جیسے ''نئی اور پرانی گاڑیاں'' میں وہ جسم کو گاڑی قرار دے کر زندگی اور اس کے پیچ در پیچ سارے سفر کی کوتا گاڑی ہی کے حوالے یا استعارے میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں جس سے تحریر میں دلکشی اور دوہری معنویت پیدا ہو جاتی ہے۔

(انشائیوں کے مجموعہ **جھاڑیاں اور جگنو** کے پیش لفظ از **منشا یاد** سے اقتباس)

خلیق الرحمٰن (اسلام آباد)

ٹوٹنے میں جلدی نہ کریں!

اکبر حمیدی کو پہلے پہل مَیں نے حلقہ ارباب ذوق اسلام آباد کے اجلاسوں میں دیکھا۔ سرو قد کی اِس سنجیدہ اور متین شخصیت کو ابتدا میں مَیں نے زیادہ اہمیت نہ دی۔ مگر حلقے کی تنقیدی نشستوں میں اُن کی منطقی، مدلل اور ٹھوس گفتگو حاضرین کو قائل کر لیتی۔ عموماً ایسا ہوتا کہ پیش کی جانے والی تخلیق کے حق یا مخالفت میں ایک نقطہ نظر سا بن جاتا اور لوگ ایک ہی بات پر متفق ہو جاتے، اور بات پر جیسے مہر تصدیق ثبت ہو جاتی، اِس صورت حال میں اکثر اکبر حمیدی کی رائے لوگوں سے مختلف اور متضاد ہوتی۔ اس بات سے قطع نظر کہ احباب اُن کی رائے کو بھی اپنی تنقیدی گفتگو کا نشانہ بنالیں گے، وہ بے دھڑک اپنے خیالات کا اظہار کر دیا کرتے۔ خاص طور پر نئے لکھنے والوں کے لئے اُن کی گفتگو میں نرم گوشہ ہوتا، اور تنقید میں بہت گنجائشیں محسوس ہوتیں۔ نوجوان لکھنے والوں کے لئے اُن کی رائے ہمیشہ مثبت اور حوصلہ مند ہوتی۔ جس پر کئی پُر جوش اور سخت گیر نقاد بہت شور مچاتے اور اِس بات کو سراسر حمایت جان کر اپنی اپنی تنقیدی کسوٹیوں کے بے رحم پیمانے لے کر چڑھ دوڑتے۔ لیکن مَیں نے دیکھا کہ اکبر حمیدی اور اُن کی قبیل کے دیگر بڑے ادیب ہمیشہ نئے لکھنے والوں کو تھپکیاں دے دے کر آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتے رہے۔ اور اُن کے اِس حربے اور رویے نے ہمیشہ اچھے اور سنجیدہ ادب کو پروان چڑھانے اور پھلنے پھولنے میں مدد ہی دی۔ اِس بات کا اندازہ مجھے خاص طور پر اُس وقت بھی ہوا جب مَیں نے پہلے پہل حلقہ میں اپنی نظمیں تنقید کے لئے پیش کرنا شروع کیں۔ خامی خوبی سے تو کوئی لکھنے والا مبرا نہیں، لیکن نئے لکھنے والوں کو قلم تھما کر لکھنے کا ڈھنگ بتانا اور آگے چلتے چلے جانے کا رستہ دکھانا، کسی سچے، ہمدرد اور نیک نیت ادیب ہی کا منصب ہو سکتا ہے۔ اور یہ بات مَیں نے اکبر حمیدی جیسے بڑے لکھنے والے لوگوں سے سیکھی اور دل میں بٹھالی۔

رفتہ رفتہ اکبر حمیدی کے خلوص، محبت اور دوستی نے مجھے اُن کے قریب ہونے کو موقع فراہم کیا۔ مجھے یہ بات کہنے میں خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ مَیں نے اُن کی رفاقت میں، دوستی اور محبت کا سچا انسانی خلوص دیکھا ہے۔ مَیں نے جب اور جہاں اُن کو یاد کیا، جب کسی کام، یا بات کا اُن سے تقاضا کیا، وہ ہمیشہ مجھے چشم و دل وا کیے نظر آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میرے دل میں اُن کے لئے بہت عزت، احترام، اپنائیت اور محبت ہے۔ اور مَیں

اُن کی صحت، تندرستی اور درازئ عمر کی دُعا کیا کرتا ہوں۔

کئی بار جب مَیں زندگی کی کسی اُلجھن یا مشکل میں گرفتار ہوا، تو ذہنی کتھارسس کے لئے اکبر حمیدی کے پاس جا بیٹھا، اور اُن کی بالواسطہ گفتگو سے حوصلہ اور ہمت لے کر واپس لوٹا۔ اُن کی خودنوشت کا یہ جملہ جو کہ اُن کی بائیوگرافی کا ماٹو بھی کہا جا سکتا ہے، کہ ''ٹوٹنے میں جلدی نہ کریں'' بارہا میرے شعور کی پنہائیوں میں گونجتا رہا ہے۔ ذاتی زندگی کے معاملات ہوں، دوستی یا تعلق داری کے، یا علم و ادب کے، اکبر حمیدی سے ہمیشہ مَیں نے رہنمائی، ہمت اور حوصلہ پایا ہے۔ دل جیتنے اور محبت جتانے میں اُن کا انداز مختلف، انوکھا، وارفتہ اور والہانہ ہے۔ میری پہلی کتاب ''کنول جھیل کا گیت'' شائع ہوئی تو مَیں نے اُنہیں اپنائیت اور محبت سے کتاب پیش کی۔ چند روز گزرے تو اکبر حمیدی کا خط موصول ہوا، جس میں اُنہوں نے مجھے خوب خوب سراہا اور پیشین گوئی کی کہ ایک دن تم نظم میں بڑا نام کماؤ گے، ستائش اور شاباشی کے علاوہ مجھ سے شاعری میں بہت سی اُمیدیں بھی وابستہ کیں۔ نئے لکھنے والے کے لئے یہ مواقع اور حوصلہ افزائی بہت معنی رکھتی ہے۔ اور مجھے اب اِس کا اندازہ ہوتا ہے کہ اکبر حمیدی ایسی مواقع کی نزاکت اور اہمیت کو بہت اچھی طرح سمجھتے اور برتتے ہیں۔ اُن کے خط سے مجھے بہت حوصلہ ملا، اور جس طرح اعلیٰ ظرفی اور کھلے دل سے اُنہوں نے کلمات کہے، اُس نے میرے اعتماد میں بے پناہ اضافہ کیا۔ مَیں اِس معاملے میں بے حد خوش قسمت ہوں کہ مجھے ہمیشہ اپنے سینئرز کی طرف سے بہت توجہ اور حوصلہ مندی میسر آئی، اور بہت سے بڑے لکھنے والوں نے میرے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کیا ہے۔ لیکن اکبر حمیدی کا مقام میرے دل میں بہت اُونچا ہے۔

مَیں دل سے یہ بات مانتا ہوں کہ اکبر حمیدی بڑے شاعر و ادیب ہونے کا ساتھ ساتھ ایک بہت اچھے انسان اور مخلص دوست بھی ہیں۔ گھر داری اور اُس سے وابستہ رشتوں میں بھی وہ سراپا خلوص و محبت نظر آتے ہیں۔ رشتے داری، دوست داری اور تعلق داری میں وہ ہمیشہ سے ہی ایک پسندیدہ شخص رہے ہیں۔ اگرچہ وہ میرے ماموں جان منشا یاد کے بھی گہرے اور پرانے دوست ہیں، اور اب تو مجھے بھی اکبر حمیدی کے دوستوں میں شمار ہونے اور اس گنتی میں شمار ہونے کا شرف حاصل ہے، یہ بات الگ کہ مجھے اپنے ماموں سے دوستی اور بے حد محبت کا دعویٰ بھی ہے، اور اُن سے میری دوستی، ماموں بھانجے جیسے خون کے رشتے، عمروں کے تفاوت اور مخصوص احترام کے باوجود بے تکلفی سے قائم ہے۔ جس میں منشا یاد کی محبت اور ادبی قربت کا بہت عمل دخل ہے۔

میری والدہ کی بیماری، رحلت اور اُس کے بعد کے کرب انگیز دنوں میں اکبر حمیدی نے میری بہت دلگیری کی۔ ہم دونوں کے گھروں میں چند گلیوں کا ہی تو فرق تھا، مَیں اکثر اُن کے پاس جا بیٹھتا، اور ہم گھنٹوں باتیں کیا کرتے۔ وہ اپنی زندگی کے نشیب و فراز سے مجھے آگاہ کرتے اور اپنے تجربات کے آئنے میں مجھے بہت کچھ بتاتے اور سمجھاتے رہتے۔ وہ اکثر کہتے کہ ''ٹوٹنے میں جلدی نہ کرو''۔ اور یہ بھی کہ ''جب مشکل گھڑی آئے تو

اپنی ہی ذات کی اوٹ میں ہو جانا چاہئے'' اُن کا یہ شعر زندگی کی ایسی ہی اٹل حقیقتوں کو سمجھنے کے لئے کتنا موزوں ہے

کہیں بھی رہ، در و دیوار جگمگا کے رکھ
اگر چراغ ہے چھوٹا تو لَو بڑھا کے رکھ

اُن کا کہنا تھا کہ گاہے گاہے اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کا تجزیہ ضرور کرتے رہنا چاہئے، لیکن کبھی خود کو معتوب اور کم تر نہیں سمجھنا چاہیے۔ اپنی ذات کی ہمت افزائی کرنا اور اپنے ساتھ دوستی کو بڑھاتے رہنا بہت ضروری ہے۔

ایسے میں تو خود سے بھی بچھڑ جاؤ گے اکبرؔ   تم خود سے خفا رہتے ہو اچھا نہیں کرتے

جہاں تک اکبر حمیدی کے فن کا تعلق ہے اُس کا دائرہ کار وسیع ہے۔ ناقدین نے اُن کے فن کی تمام اصناف اور جہات پر کُھل کر رائے زنی کی ہے۔ اُن کی غزل، انشائیہ اور خاکہ نگاری نے ادب کے قدر دانوں کو خوب خوب متاثر کیا ہے۔ نثر میں اُن کے انشائیے اور خاکے متاثر کن ہیں، خاص طور پر قریبی رشتہ داروں پر لکھے اُن کے خاکے قاری کے دل میں اُتر جاتے ہیں۔ اِن خاکوں میں جو لگاوٹ اور اپنائیت ہے وہ پڑھنے والے کو اپنی ہی بپتا نظر آنے لگتی ہے۔ خون کے رشتوں کی اُنسیت اور خوشبو ہمیں اپنی سانسوں میں اُترتی محسوس ہوتی ہے۔ مَیں نے یہ خاکے شوق سے بار بار پڑھے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں خاکہ نگار اپنے بچپن، گزرے ایام، گاؤں اور گھر آنگن کا حقیقی اور چمکتا ہوا نقشہ کھینچ کر رکھ دیتا ہے۔ یہ خاکے پڑھتے ہوئے ہمارے لبوں پر کبھی مسکراہٹ دوڑ جاتی ہے اور کبھی آنکھوں میں نمی سی چمک کر رہ جاتی ہے۔ اکبر حمیدی کے یہ خاکے پڑھ کر روح میں ایک اُداس سا انبساط پیدا ہو جاتا ہے۔

اُن کے انشائیے بھی اپنی طرز کے منفرد انشائیے ہیں، نہ صرف اسلوب اور تخلیقیت کی سطح پر بلکہ موضوعاتی سطح پر بھی وہ ہمیں چونکا دیتے ہیں۔ یہ دیکھ کر کہ انشائیہ نگار کا ذھن چیزوں کی عمومیت میں کس گہرائی پر جا کر مشاہدہ کر رہا ہے، اور وہ کسی ایک نقطے پر دائرے کی صورت ہر ہر زاویے سے نگاہ ڈالتا چلا جاتا ہے اور ہمیں محسوس ہونے لگتا ہے کہ جیسے پڑھتے ہوئے شعور میں حیرت و انبساط کی کھڑکیاں سی کھلتی چلی جا رہی ہیں۔

اکبر حمیدی ہمارے اُن چند بڑے اور سینئر لکھنے والوں میں سے ہیں، جنہوں نے ہمیشہ حلقہ ارباب ذوق میں اپنی نگارشات پیش کی ہیں اور اُس میں کبھی تامل اور ہچکچاہٹ کا اظہار نہیں کیا۔ شاعری کے ساتھ ساتھ اُن کے خاکے، انشائیے، مضامین اور خودنوشت کے ابواب حلقے کے پلیٹ فارم پر تنقید کے لئے تواتر سے پیش کئے جاتے رہے ہیں، اور اکبر حمیدی ہمیشہ خنداں پیشانی اور کشادہ دلی سے تنقید سنتے اور سخت سے سخت بات سننے اور سہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی تخلیقات میں معنویت کی تہہ داریاں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ صاف اور سیدھی بات میں بھی مفہوم اور معنی کا ایک سلیقہ اور سبھاؤ موجود رہتا ہوتا ہے۔ قریب کی بات دُور اور دُور کی بات قریب آ کر

سرگوشیاں سی کرنے لگتی ہے۔ یہ ہنر اور طرز ادا، زندگی بھر کی ادبی ریاضتوں کی ہی دین ہوا کرتی ہے، بات اتنی سیدھی اور سہل بھی نہیں جتنا لوگ عموماً سمجھ لیتے ہیں۔

لیکن مَیں اِس بات کا بھی ہمیشہ قائل رہا ہوں کہ بڑے سے بڑا لکھنے والا بھی کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں ٹھوکر ضرور کھاتا ہے۔ اس کی لکھت میں بھی فیز زاور پاز ضرور آتے ہیں۔ جہاں وہ اعلیٰ ادب تخلیق کر جاتا ہے وہاں اُس سے کچھ ایسی تخلیقات بھی ضرور سرزد ہوتی ہیں جن کی سطح خود اس کے اپنے ادبی معیارات کو نہیں چھو پاتیں۔ ایسا کم و بیش ہر ادیب کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور اس کا علم لکھنے والے کو خود بھی نہیں ہو پاتا۔ اس کا فیصلہ قارئین اور وقت کیا کرتے ہیں، اور اِس بات کے امکانات تو اُس وقت اور بھی بڑھ جاتے ہیں جب لکھنے والے کے تخلیقی دھارے کی جہات پھیلی ہوئی بھی ہوں، اور بہتے ہوئے دریا کے پاٹ دونوں اطراف سے زیادہ وسیع ہوں۔ لیکن دریا کی گہرائی کا اندازاہ تو دریا میں اُترنے سے ہی ہوتا ہے۔ اس معاملے میں مَیں اکبر حمیدی کا طرف دار ہوں کہ وہ حوصلہ مند اور جی دار تخلیق کار ہیں۔ اِس بات کے اندیشے سے کہ وہ کسی نئی صنف میں ناکامیاب بھی رہ سکتے ہیں وہ کبھی پیچھے نہیں ہٹتے، بلکہ اُنہوں نے جس صنف میں بھی طبع آزمائی کی ہے وہ اُس میں سرخرو ہوئے ہیں۔ اگرچہ تخلیق کار کسی ایک ہی صنف میں اپنا عروج حاصل کر پاتا ہے لیکن راستے تلاش کرنے کا اُسے پورا حق حاصل ہے اور لکھنے والوں میں اپنے تخلیقی سوتوں کو نئے شگافوں اور نئی سمتوں میں منتقل کرنے کا شعور اور حوصلہ ضرور ہونا چاہئے۔

اکبر حمیدی کی غزل بھی اپنی طرز کی ایک الگ پہچان رکھتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں وہ زندگی کے معاملات، پیچیدگیوں اور اُلجھنوں کی طرف انتہائی نزاکت سے سہولت کے ساتھ اشارے کر جاتے ہیں اُن کی غزل بوجھل تشبیہوں اور گھمبیر فارسی تراکیب سے آلودہ نہیں۔ غزل میں انوکھا اور نیا طرز تکلم پیدا کرنا اکبر حمیدی کا خاصا ہے۔ عام بات چیت کا انداز اُن کے ہاں نمایاں ہے۔ مَیں نے غزل کے معاملے میں بھی اُن کے ہاں ظفر اقبال جیسی جرات مندی دیکھی ہے۔ اِس بات سے قطع نظر کے شعر کی جمالیات یا معنیاتی سطح متاثر بھی ہو سکتی ہے وہ بے دھڑک زبان اور خیال کے انوکھے پن کو برت دیتے ہیں۔۔ جس سے بسا اوقات شعر آسمان کو چھو جاتا ہے اور کبھی بساط بھر اُڑان حاصل نہیں کر پاتا۔ مگر اکبر حمیدی کی غزل اپنے مزاج اور اپنی فضا کو قائم رکھتی ہے۔ تمام اشعار قریب قریب ایک ہی موضوع اور فضا کے آس پاس رہتے اور موڈ کو قائم رکھتے ہیں۔ غزل کے اہم شعراء کی طرح اکبر حمیدی کے بھی بہت سے اشعار خاص و عام میں مقبول ہیں اور وہ برصغیر کے چند سینئر اور خصوصی غزل گووں میں شمار ہوتے ہیں۔

کوئی بتائے اگر جانتا ہو رازِ حیات   یہ قافلے یہاں کس سلسلے میں ٹھہرے ہیں
ہواس باختہ لوگوں کو گم شدہ نہ کہو   یہ چلتے چلتے کہیں راستے میں ٹھہرے ہیں
کس آسمان سے گزرا ہے درد کا دریا   ستارے ٹوٹ کر آبِ رواں میں آنے لگے

خامشی جرم ہے جب منہ میں زباں ہو اکبرؔ ‏ ‏ ‏ ‏ کچھ نہ کہنا بھی ہے ظالم کی حمایت کرنا

کندن ہی بن کے نکلوں گا زندہ رہا اگر ‏ ‏ ‏ ‏ اپنے لہو کی آگ میں ڈالا گیا ہوں مَیں

اپنی خودنوشت ''جست بھر زندگی'' میں اُنہوں نے اپنی ذات کے بہت سے معاملات، اسرار اور بھیدوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ جس کے باعث مجھے اُن کی شخصیت کو سمجھنے اور جاننے کا موقع میسر آیا۔ یہ جان کر، کہ وہ لڑکپن اور نوجوانی میں ضدی اور اکھڑ رہے ہیں اور وہ کبھی بھی اُس گھی کے مصداق نہ تھے جسے سیدھی اُنگلی سے نکالا جا سکتا ہو۔ مگر ادب کی دوستی اور تربیت نے اُنہیں بچا لیا۔ اُن کا کہنا ہے کہ اگر وہ ادب تخلیق نہ کرتے تو شاید وہ اچھے انسان نہ ہوتے۔ اِسی بات کے سبب میرے دل میں شعروادب کی توقیر دوگنی ہو گئی ہے، کیونکہ ادب کی دُنیا میں بھی مَیں نے اکبر حمیدی جیسے خلوص ومحبت اور مہر ومروت کے انسان دوست لوگ کم ہی دیکھے ہیں۔

ہر اِک طرف سے ہے منظر بہشت کا اکبرؔ

وہ انجمن میں کئی زاویوں سے بیٹھے ہیں

اردو انشائیہ کے موجودہ تخلیقی رنگ روپ میں بعض ہمعصر انشائیہ نگاروں کا نمایاں حصہ رہا ہے اور ان میں اکبر حمیدی پیش پیش ہیں۔ اکبر حمیدی ایک اعلیٰ پائے کے شاعر بھی ہیں اور اپنی شعری خوؤں کو کام میں لا کے و[illegible] روزمرہ کے انشائی موضوعات میں بھی باتوں باتوں میں قارئین کو اتنا پار پرے لے جاتے ہیں گویا ان کی تیسری آنکھ کُھل گئی ہو اور کمال یہ بھی ہے کہ اپنی دو آنکھوں کو ہی حمیدی تیسری آنکھ کا وسیلہ بنا لیتے ہیں اور اس مانند گرد[illegible] پیش کو بھی اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ بظاہر یہ سب کچھ بڑی آسانی سے ہو رہا ہوتا ہے اور خیال گزرتا ہے کہ وہ یہ مرحلہ قلم برداشتہ طے کر لیتے ہیں مگر مجھے معلوم ہے اس قدر باریک فکر میں تخلیقی گپ شپ کی خوشگوار، غیر رسمی اور فراخ آسانیاں پیدا کرنے کے لیے وہ کیونکر رُک رُک کر ہر جملے میں اپنا دم پھونکتے ہوں گے۔

اکبر حمیدی کے قارئین نے ان کے انشائیوں کے گذشتہ مجموعوں کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا تھا۔ مجھے یقین ہے ان کا یہ مجموعہ بھی بڑے مانوس تحیّر اور مسرّت سے پڑھا جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ انگریزی انشائیوں کی نثر میں برتر لسانی وسعت کا احساس ہوتا ہے مگر حالیہ اردو انشائیہ نے اپنی نسبتاً کمتر لسانی وسعتوں میں بھی خنداں سنجیدگی کا جو تخلیقی سماں باندھا ہے وہ شاید انگریزی انشائیے کو بھی نصیب نہیں۔ اس اعلیٰ انشائی کارکردگی میں اگر صرف چار نام ہی گنوانا مقصود ہو تو بھی اکبر حمیدی اتنے پُرکار اور فراواں ہیں کہ بے دھڑک ذہن میں گُھستے چلے آتے ہیں۔

مَیں اپنے عزیز دوست کو انشائیوں کی ایک اور اہم کتاب پیش کر پانے پر اپنی دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

(انشائیوں کے مجموعہ **پہاڑ مجھے بلاتا ہے** میں شامل **جوگندر پال** کی رائے)

اکبر حمیدی کا **انشائیہ**

دہشت گرد

گذشتہ کچھ عرصے سے مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میرے خلاف قومی اور بین الاقوامی طور پر دہشت گردی ہو رہی ہے! کئی ایک شہروں سے کلاشنکوفوں کے چلنے اور بموں کے دھماکوں کی آوازیں مَیں سنتا رہتا ہوں۔ سمندر پار سے بھی ایسی ہی خوفناک آوازیں میری سماعت کا حصّہ بن رہی ہیں۔ پھر پریس جس دہشت ناک انداز میں اس دہشت گردی کو پیش کرتا ہے وہ بجائے خود دہشت گردی سے کم نہیں ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے یہ سب کچھ اہمیت اور طاقت حاصل کرنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ ہر کوئی گویا اپنی اپنی آواز میں مجھے مخاطب کر رہا ہے کہ ''ادھر دیکھو مَیں بھی ہوں.......... میری اہمیت اور طاقت کو تسلیم کرو۔''

لیکن کچھ عرصے سے وہ شعبے بھی جو بڑی خاموشی سے امن وامان کے ساتھ اپنا اپنا کام کیا کرتے تھے اب اپنے تیور بدل رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے وہ بھی بزورِ علم نہیں بلکہ بزور بازو اپنی اہمیت اور فضیلت مجھ سے منوانا چاہتے ہیں اور اپنی طرف بلکہ ان میں سے ہر کوئی اپنی ہی طرف مجھے متوجہ دیکھنا چاہتا ہے۔ پتہ نہیں انہیں اپنے بارے میں یہ احساس کیوں ہونے لگا ہے کہ میں انہیں غیر اہم سمجھ رہا ہوں۔ ان سب کی اہمیت تو ہمیشہ میرے دل میں موجود رہی ہے اور گاہے بگاہے جس خاموشی سے یہ شعبے کام کرتے چلے آ رہے ہیں اسی خاموشی سے میں ان کی اہمیت کو تسلیم کرتا چلا آ رہا ہوں۔ کچھ ایسا لگتا ہے وقت میں جو تیزی آ رہی ہے یہ سب بھی اس تیزی کا شکار ہو رہے ہیں اور یہ چاہتے ہیں جلدی سے مرکز نگاہ بن جائیں۔ راتوں رات امیر بننے کا جو رجحان ہمارے تمام شعبوں میں نظر آ رہا ہے۔ شاید ایسا ہی رجحان ان شعبوں میں در آیا ہے اور یوں یہ راتوں رات مرکزِ نگاہ بن جانا چاہتے ہیں۔

مثلاً کچھ سالوں سے میں دیکھ رہا ہوں کہ دنیا بھر کے سائنسدان عجیب وغریب پیش گوئیاں کرنے لگے ہیں۔ کبھی سمندروں کے اُلٹ جانے کی خبر دیتے ہیں۔ کبھی قطب شمالی میں صدیوں سے منجمد برفوں کے میلوں انبار پگھل جانے کی اطلاع دیتے ہیں۔ کبھی درجۂ حرارت انتہائی زیادہ اور کبھی انتہائی کم ہو جانے کی فکر میں ڈالتے ہیں۔ کبھی کسی سیارے کی مخلوق کے زمین پر حملہ آور ہونے کی خبر فراہم کرتے ہیں۔ پھر اس خبر کو دہشت ناک بنانے کے لیے یہ بھی کہتے ہیں کہ خلائی مخلوق اسلحہ سازی میں اہلِ زمین سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ گویا ان کے ہاتھوں اہلِ زمین کے بچ نکلنے کا کوئی امکان نہیں۔ وہ تو خدا بھلا کرے ان سیّاروں کی اَن دیکھی مخلوقات کا جو فی الحال ہمارے سائنسدانوں کی دہشت گردی میں مددگار بننے کے لیے تیار نہیں ہوئیں۔ یوں بھی میرا خیال ہے اگر وہ لوگ

ہم سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں تو انہیں قوت آزمائی کے لیے زمین کا رُخ کرنے کی فرصت کہاں ملے گی............ ہماری طرح وہ ایک دوسرے سے ہی فارغ نہیں ہوسکیں گے...........اوّل خویش اور بعد درویش کی کہاوت وہ ضرور جانتے ہوں گے!۔

سیّاروں کی مخلوق سے ہمارے سائنسدان کچھ زیادہ پُر امید دکھائی نہیں دیتے کیونکہ گذشتہ نصف صدی سے ان کی راہ دیکھ دیکھ کر اب ان کی آنکھیں دھندلانے لگی ہیں۔سواس سال یعنی ۱۹۹۸ء کے وسط میں انہوں نے ایک نہایت خطرناک اور غیر ذمہ دار سیّارے کے حوالے سے عالمی سطح پر اس پیش گوئی کو پھیلایا ہے کہ اسی نومبر میں ایک مہیب سیّارہ زمین سے ٹکرا جائے گا اور ہماری دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا کیونکہ وہ سیّارہ اپنے مدار سے نکل چکا ہے اور اب کا رُخِ روشن عین زمین کی طرف ہے۔اس خبر میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے اور شاید اپنی کوئی مالی مطلب برآری کے لیے یہ بھی کہہ دیا کہ امریکی صدر کلنٹن اس معاملے میں بڑی تشویش محسوس کر رہے ہیں۔نیز انہوں نے ایک بڑی رقم سائنسدانوں کے لیے مختص کر دی ہے تا کہ وہ اس سیّارے کا رُخ کسی طرح زمین کی سمت سے ہٹا کر کسی اور طرف موڑ دیں۔پھر اپنی اہمیت کا احساس دلانے کے لیے اور یہ بتانے کے لیے کہ اب دنیا کی بقا کا انحصار صرف سائنسدانوں کی مہارت اور شبانہ روز محنت پر ہے۔فرمایا کہ سائنسدان دن رات اس سّیارے کا رُخ تبدیل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔خدا کا شکر ہے کہ اس سیّارے نے بھی خلائی مخلوق کی طرح اپنی ذمہ داری محسوس کی اور سائنسدانوں کی دہشت گردی میں شریکِ کار نہیں ہوا۔!

دنیا کے دوسرے ممالک میں ان پیش گوئیوں کا خدا جانے کیا اثر ہوا مگر کم سے کم مجھ پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوا کیونکہ میں بچپن سے ایسی پیش گوئیاں سننے اور ان کے بے نتیجہ ہونے کا تجربہ رکھتا ہوں۔ مجھے یاد ہے میرے بچپن میں چھوٹی چھوٹی پرچیاں تقسیم ہوتی تھیں جن پر لکھا ہوتا تھا ''قیامت بس آنے ہی والی ہے۔توبہ کرلو اور اچھے کام کرنا شروع کر دو۔نیز اس پرچی کی پچاس پرچیاں لکھ کر آگے تقسیم کرو ورنہ کسی بڑی مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ گے'' وغیرہ وغیرہ۔خوش آئند بات یہ ہے کہ ایسی پرچیوں کا سلسلہ اب بھی جاری ہے جس کے باعث ہمارے لوگوں نے سائنسدانوں کی پیش گوئی کو ایسی ہی ایک پرچی سے زیادہ اہمیت نہیں دی!

مَیں دیکھ رہا ہوں کہ کوئی بھی شعبہ مجھ سے نرمی اختیار نہیں کر رہا ہے ہر کوئی مجھے یہی کہتا دکھائی دیتا ہے کہ میری اور میری دنیا کی بقا صرف اس بات میں ہے کہ میں غیر مشروط طور پر اس کی اطاعت کرتا رہوں۔ مذہبی پنڈتوں کے ہاں میرے بچ نکلنے کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ وہ ایسے ایسے انداز میں بات کرتے ہیں کہ سُن کر دہشت طاری ہونے لگتی اگر اللہ میاں کے حُسن و احسان کی عادت سے مَیں ذاتی طور پر متعارف نہ ہوتا!

حکومتیں وطن دوستی کے حوالے سے مجھے ہمیشہ زیر بار رکھتی ہیں۔ یہ لوگ کلاشنکوفوں سے نہیں اپنے اختیارات کے ذریعے دہشت گردی کرتے ہیں کہ میرے لیے قربانیاں دینے اور ان کے لیے قربانیاں لینے کا ایک لامتناہی

سلسلہ شروع ہے۔ ہر سال نئے نئے ٹیکس لگتے ہیں اور ساتھ ہدایت ملتی ہے کہ قوم قربانیاں دے۔اب قربانیاں دے دے کر قوم کی حالت عید قربان کے دُنبے کی سی ہو چکی ہے! میرے اپنے شعبے ادب میں یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ لوگ ادبی ذوق سے بے بہرہ ہو گئے ہیں۔اسی لیے وہ اعلیٰ انسانی قدروں سے محروم ہوتے جا رہے ہیں سوال یہ ہے کہ خود ادیبوں میں اعلیٰ انسانی قدریں کہاں تک نظر آتی ہیں جنہوں نے ادب پڑھا ہے اور ادب لکھا ہے!

میرے بچپن کے زمانے میں والدین بچوں کے سر پر سوار نہیں ہوتے تھے کہ انہیں لازماً سی۔ایس۔ پی افسر۔ڈاکٹر۔انجینئر یا اس طرح کا کوئی اور مفید پیشہ ور آدمی بنانا ہے۔اب اگر بچہ ٹیچر بننا چاہتا ہے تو والدین بضد ہیں کہ اسے ڈاکٹر۔انجینئر یا سی۔ایس۔پی افسر قسم کی کوئی مخلوق بنا کر دم لیں گے۔ یوں والدین بچوں کے لیے کسی دہشت گرد سے کم نہیں اور جب اس قسم کی دہشت گردی کا پروردہ بچہ وہ کچھ بن جاتا ہے جو وہ نہیں بننا چاہتا تھا تب وہ پورے معاشرے کے لیے ایک بڑا دہشت گرد ثابت ہوتا ہے!

اب حالت یہ ہے کہ یہ دہشت گرد اپنے اپنے سکّوں میں مجھ سے باقاعدہ جگّا ٹیکس وصول کرتے ہیں۔میرے ذرا سے انکار پر وہ جاہل۔کافر۔باغی غدار کی کلاشنکوف تان لیتے ہیں!

میرا مزاج کچھ ایسا ہے اور غنیمت ہے کہ ایسا ہے کہ جب بھی ماحول حد سے زیادہ سنجیدہ ہونے لگے۔ میرے اندر سے غیر سنجیدگی کی ایک چھوٹی سی لہر اٹھتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے برف سے ڈھکے سنجیدگی کے بحرِ بیکراں پر حاوی ہو جاتی ہے جیسے بعض اوقات تازہ ہوا کا ایک آہستہ خرام جھونکا ہمارے پژمردہ چہرے کو شاداب کر دیتا ہے!

ایک روز وطنِ عزیز کے خراب اقتصادی حالات کا ذکر ہو رہا تھا۔ ماحول سنجیدگی کی برف تلے میلوں تک دبتا چلا جا رہا تھا۔بعض حضرات رونی شکل بنا کر بڑی ہی کسمپرسی کے عالم میں دائیں بائیں دیکھ رہے تھے۔ شاید اس امید پر کہ کوئی انہیں اس برف زار سے نکالے کہ اچانک میرے اندر سے میری دوست لہر نے سر اُٹھایا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ لہر ایک دلکش مسکراہٹ کی طرح میرے چہرے پر ہی نہیں میرے رگ و پے میں بھی پھیل گئی۔ تب میں نے اپنے ایک شاعر دوست سے سنا ہوا قصِہ بیان کیا اور کہا ''دوستو سیاچین کی برفوں تلے ہیرے جواہرات سے بھری ہوئی کانیں ہیں۔ جونہی کسی روز اوپر کی برف پگھل گئی یہ جواہرات بھری کانیں ہمارے دامن میں اپنے منہ کھول دیں گی۔اس لیے زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں''۔

یہ کہہ کر میں نے حاضرین کے چہروں کی طرف دیکھا۔ وہاں ہلکی ہلکی روشنی اتر رہی تھی کہ اچانک محفل میں سے ایک دہشت گرد نے سر نکالا اور بولا ''حمیدی صاحب اگر برف پگھلی تو اس کے پانیوں کا رُخ کس طرف کو ہوگا''؟ میں نے صورتِ حال کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا اور میں اس دہشت گرد کی بدنیّتی کو بھی پوری طرح بھانپ چکا تھا اس لیے فوراً کہا ''سمندر کی طرف'' اور تب ایک طویل زوردار قہقہہ میرے، حلق سے نکلا اور سنجیدگی کی منحوس سرد برف زار کو میلوں تک ٹکڑے ٹکڑے کرتا چلا گیا!!!

اکبر حمیدی کا **منشا یاد** کے بارے میں لکھا ہوا **خاکہ**

مت سہل ہمیں جانو

جس طرح لاہور کے ساتھ شاہی قلعے، انارکلی اور مینارِ پاکستان کا تصور وابستہ ہے اسی طرح اسلام آباد کا خیال آتے ہی ذہن میں منشا یاد آتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب کے ایک جملے کو اگر تھوڑا سا تبدیل کر لیا جائے تو میں کہوں گا اسلام آباد ایک چھوٹا سا منشا یاد ہے اور منشا یاد ایک بڑا اسلام آباد۔

منشا یاد پیشے کے لحاظ سے انجینئر ہے اور ادب اس کی محبت ہے۔ آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تعمیر اس کا پیشہ ہے اور تخلیق اس کا شوق۔ اس نے ادب کی خاطر بہت قربانیاں دی ہیں، مواقع ملنے کے باوجود مڈل ایسٹ وغیرہ محض اس خیال سے نہیں گیا کہ وہ ادب اور ادبی محفلوں سے دور ہو جائے گا۔ اس شہر کی داغ بیل ڈالنے اور تعمیر و ترقی میں اس کا خون پسینہ بھی شامل ہے۔ ۱۹۵۸ء کے آغاز میں وہ کالج آف ٹیکنالوجی رسول سے سول انجینئرنگ میں ڈپلوما حاصل کر کے شیخوپورہ سے راولپنڈی پہنچا۔ پھر کچھ عرصہ مری میں تعینات رہا مگر ایسا لگتا ہے جیسے اسے یہ سارے شہر ادھورے ادھورے سے لگنے لگے چنانچہ اس نے جلد ہی ان سب شہروں کو ملا کر اپنی پسند کا الگ شہر تعمیر کرنے کا اردہ کر لیا۔ مئی ۱۹۶۰ء میں اس نے اس بے آب و گیاہ علاقے کا سروے شروع کر دیا جہاں اب ہرا بھرا اور سرسبز و شاداب اسلام آباد ہے۔ جونہی اس شہر کی کچھ صورت شکل بن گئی اس نے اس میں ادبی روح پھونکنے کی کوشش کی۔ شروع میں اس نے لکھنے والوں کی انجمن قائم کی پھر ۱۹۷۲ء میں حلقہ اربابِ ذوق کی بنیاد رکھی جس کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ابنِ انشا مرحوم نے خدشے کا اظہار کیا تھا کہ اب اسلام آباد بھی ثقافت (اور ادب) سے آلودہ ہونے لگا ہے۔

گذشتہ پندرہ سال سے میں منشا یاد کے شب و روز اور اس کی زندگی کے ہر گوشے میں شریک ہو رہا ہوں۔ وہ میرے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح ہے۔ اس نے کسی بھی شخص کے بارے میں دل کی کوئی بات کہنی ہو میرے سامنے بے دھڑک کہہ دیتا ہے۔ اس نے زندگی اور ادب میں موجودہ مقام تک پہنچنے کے لئے بڑی محنت کی ہے اور مجھے یہ بھی پتہ ہے گذشتہ تیس برسوں میں اس نے یہاں کے ادیبوں شاعروں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے اور یہاں کے ادیبوں شاعروں نے اسے کتنی محبت لوٹائی ہے۔

۱۹۸۰ء میں جب میں اسلام آباد آیا تو سب سے پہلا شخص منشا یاد تھا جس نے مجھے یہاں مستقل طور

پر ٹھہرنے کے لئے حوصلہ دیا۔ میں نے اسے اپنے مسائل بتائے اور اس نے ایک ایک کر کے سب کے حل بتا دیئے جیسے کوئی پڑھا کو بچہ ٹوکویں پہاڑے سنا دیتا ہے۔ اول اول میں سمجھا یہ حسنِ سلوک صرف مجھی سے ہے مگر پھر معلوم ہوا کہ یہ تو اس کی ''عادت'' ہے کہ اس سے کوئی راہگیر راستہ پوچھے تو وہ اسے محض راستہ ہی نہیں بتاتا اکثر گھر تک پہنچا کر چھوڑتا ہے۔

منشا یاد اپنے محکمے کے مختلف شعبوں میں کام کرتا رہا ہے۔ کچھ عرصہ وہ پبلک ریلشینز آفیسر بھی رہا اور اس نے پبلک ریلیشنگ کے کچھ گر بھی سیکھ لئے بلکہ شاید اسے فلاح کا کام کہنا چاہئے کہ رائٹرز ہاؤسنگ سوسائٹی کو جو ۲۵ پلاٹ ملے اس میں سی ڈی اے کے سابق چیئرمین سید علی نواز گردیزی کے علاوہ منشا یاد کی مساعی بھی شامل تھیں ۔ اسلام آباد میں ہر سال یوم آزادی کے موقع پر کل پاکستان مشاعروں کی طرح بھی اسی دور میں منشا یاد نے ڈالی۔ ان مشاعروں میں پڑھے جانے والے کلام کو باتصویر مجلوں کی صورت شائع بھی کیا۔

ریٹائرمنٹ سے پہلے منشا یاد اپنے محکمے (دارالحکومت کے ترقیاتی ادارے) میں چیف کمپلینٹس آفیسر یعنی افسرِ اعلیٰ شکایات کے طور پر کام کر رہا تھا جو انجینئرنگ اور عوامی بہبود کی ملی جلی جاب ہے۔ اس کے بے تکلف احباب اس کا پنجابی ترجمہ ''سب توں وڈا شکایتی'' بھی کرتے تھے لیکن منشا یاد شکایتیں کرتا نہیں سنتا اور رد ور کرتا تھا اور ایک ایسے ادارے کے اہلکاروں سے کام نکلوانا جس کے بارے میں انور مسعود نے اپنے دشمن کو بددعا دی تھی ''جا تجھے سی ڈی اسے سے کام پڑے'' کوئی آسان کام نہیں ہے۔

شروع میں میرا خیال تھا کہ منشا یاد کا خدمت کا وطیرہ پبلک ریلیشنگ کی غرض سے ہے لیکن کئی برس تک اسے قریب سے دیکھنے اور جاننے کا موقع ملا تو اندازہ ہوا کہ یہ تو اس کے خمیر میں رچا ہے اور یہ سلسلہ محض اپنے خاندان اور ادیب برادری تک محدود نہیں اس کے گاؤں تک پھیلا ہوا ہے کبھی وہ اکیلا شیخوپورہ سے آیا تھا اب اسلام آباد کے اندر ایک شیخوپورہ آباد ہو گیا ہے۔ وہ اپنے گاؤں کا پہلا لڑکا تھا جس نے پرائمری سے آگے تعلیم جاری رکھی طالبِ علمی کے زمانے میں ہی اس کی گاؤں میں بڑی عزت اور اہمیت تھی اور لکھنے پڑھنے کے ہر کام میں گاؤں والے اس سے مدد لیتے تھے۔ (اس کے گاؤں میں عام لوگ کم اور ڈاکو زیادہ تھے) مالیے آبیانے کی رسیدیں اور خط پڑھنے سے لے کر مقدموں کی تاریخیں اور بستہ ب کے بدمعاشوں کو راہداریاں لکھ کر دینے تک سارے کام اس کے ذمے تھے۔ چنانچہ اس کی حیثیت ایک ہیرو کی سی تھی اور اب جب کبھی اس کی تصویر اخبار میں چھپتی ہے، اس کے ڈرامے اور کبھی وہ خود گاؤں کی چوپال کے ٹی وی پر نظر آتا ہے، وہ گاؤں سے دور رہتے ہوئے بھی گاؤں والوں کے دلوں کے اور قریب ہو گیا ہے۔

منشا یاد کا گھر، افسانہ منزل ، ادیبوں کے لئے ٹی ہاؤس ہے اور وہ خود چلتی پھرتی ادیبوں کی ڈائریکٹری۔ کبھی کبھی مجھے وہ حاتم طائی کی طرح لگتا ہے جو لوگوں کے سوالات پورے کرنے کے لئے گھر سے نکلا ہوا

ہے۔غالب نے کہا تھا:

سرمہ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشم خریدار پہ احساں میرا

منشایاد پرلے درجے کا شریف آدمی ہے یا شاید بزدل کہ ہر شریف اور سفید پوش آدمی اصل میں بزدل ہوتا ہے، اس لئے افسانہ نگار لڑکیاں بے دھڑک اس سے ملتی ہیں جیسے وہ اسکی گہری سہیلیاں ہوں بعض تو ضرورت پڑنے پر اس سے ذاتی مسائل پر مشورے بھی لیتی ہیں۔اس لئے فن کی پرستار لڑکیاں اس سے مل کر مزید اس کی پرستار بن جاتی ہیں۔حد تو یہ ہے کہ شعر کہنے والی نوجوان لڑکیاں بھی اصلاحِ سخن کی خاطر اس سے ملنا بہتر سمجھتی ہیں اور یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ وہ ایک تائب شاعر ہے اور شاعری سے توبہ بھی اس نے عین وقتِ شباب کر لی تھی۔ادبی محفل کے اختتام پر لڑکیاں منشایاد کی گاڑی تلاش کرتی ہیں اور منشایاد بھی انہیں گھروں تک پہنچانے کو اپنا فرضِ منصبی سمجھتا ہے۔صرف ایک دفعہ منشا کا کسی لڑکی سے رومان کا چرچا ہوا تھا مگر یہ لڑکی ادبی حلقوں سے باہر کی تھی، منشایاد بھی خوش ہوا کہ اسے بھی یہ اعزاز حاصل ہو رہا ہے۔مگر معلوم ہوا یہ بامراد منشا کوئی اور ہے۔

ان سب نرمیوں، محبتوں اور بڑائیوں کے پیچھے منشایاد کی مضبوط شخصیت کارفرما ہے وہ اکثر کہتا ہے کہ منشایاد کی اپنی ایک شخصیت ہے اور وہ اس کو بحال رکھے گا۔وہ دوسروں کے طعنے سہنے اور الزام سن کر بھی اپنے حسنِ سلوک میں کمی نہیں آنے دیتا۔اسی طرح وہ کسی ادبی سیاست میں اپنی شخصیت کو گم نہیں ہونے دیتا۔وہ ایک روشن خیال اور سائنٹیفک سوچ رکھنے والا نیک دل آدمی ہے اس کے رویے اور اس کی تحریریں انہی الفاظ کے گرد گھومتی ہیں۔راولپنڈی اسلام آباد میں وہ غالباً واحد افسانہ نگار ہے جس کے بیک وقت احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا سے خوشگوار تعلقات ہیں اور وہ ''فنون'' ''اوراق'' دونوں جگہ وقار کے ساتھ چھپتا ہے۔اس کی امجد اسلام امجد اور عطاالحق قاسمی سے پرانی اور گہری دوستی ہے اور ڈاکٹر سلیم اختر اور انتظار حسین تو منشایاد ہی سے مل لینا کافی سمجھتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ منشایاد میں خوبصورت لڑکیوں والی کوئی خوبی ہے جو دوسروں کو اس کی طرف کھینچتی ہے۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہوں، شمس الرحمان فاروقی، جوگندر پال، بلراج مین را، محمد علی صدیقی یا جمیل الدین عالی، منشایاد کے سب لوگوں سے خوشگوار اور دوستانہ مراسم ہیں۔بقول ضیا جالندھری صاحب منشایاد میں سینس آف ڈپلومیسی بہت اعلیٰ درجے کی ہے۔

اس نے خود افسانے لکھے اور دوسروں کے لکھے ہوئے افسانوں کے انتخاب (انتھالوجیز) بھی شائع کی ہیں۔بہت سے ہلکے پھلکے طنزیہ مزاحیہ مضامین اور کالم اور ایک آدھ انشائیہ بھی لکھا ہے۔ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لئے بھی کئی ڈرامے لکھ چکا ہے اس کے ٹی وی سیریلز جنون، بندھن، راہیں اور پورے چاند کی رات بھی بہت مقبول ہوئے۔راہیں کو تو سال بھر کے بہترین سیریل کا پی ٹی وی نیشنل ایوارڈ بھی ملا۔اس کا مطالعہ کافی وسیع ہے۔

فلسفہ، مذہب، سائنس، تاریخ، طب اور نفسیات تو خیر کم و بیش سبھی پڑھتے ہیں لیکن ایک روز اس نے بتایا کہ وہ دراوڑی زبان کے الفاظ اور سنسکرت زبان سے متعلق ایک کتاب پڑھ رہا ہے غالباً اسے ہندی اور گورمکھی پڑھنا بھی آتی ہوگی کہ اس کی بہت سی کہانیوں کے تراجم بھارتی رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ایک مرتبہ اس نے مجھے گراموفون ریکارڈ سنائے جو کسی مرحومہ بائی کے گائے ہوئے گیتوں کے تھے،۔ریکارڈ سن کر میں نے کہا منشا جی آپ کو معلوم ہے یہ بائی آپ کے دادا جان کی ہم عمر ہیں آپ کچھ خیال کریں۔اس پر وہ مجھ سے لڑ پڑا۔

لتا منگیشکر کی آواز پر تو وہ باقاعدہ عاشق ہے شاید ہی لتا کی کوئی اچھی تصویر یا اچھا گیت ہو جو اس کے پاس موجود نہ ہو۔اسلم سراج الدین جب بھی جدہ یا گوجرانوالہ سے اسلام آباد آتا ہے یہ دونوں گھنٹوں لتا اور روشن آرا کے کلاسیکی اور نیم کلاسیکی گیت سنتے رہتے ہیں۔اکثر دونوں ایک دوسرے کو موسیقی کی کیسٹوں کے تحفے بھیجتے رہتے ہیں۔جہاں تک مذہب کا تعلق ہے ڈاکٹر وزیر آغا اور منشایاد کے بارے میں میرا خیال ہے کہ وہ ہر مذہب میں تھوڑے تھوڑے شامل ہیں اور ہر مذہب سے تھوڑے تھوڑے باہر۔بہر حال منشایاد عیدین کی نماز بہت ہی اہتمام اور شوق سے پڑھتا ہے کہ بالکل ہی کافر نہ ہو جائے۔منشایاد کے پاس زندگی کا اتنا گہرا اور متنوع تجربہ ہے۔اتنا وسیع مشاہدہ ہے کہ میں نے اکثر محسوس کیا کہ وہ کہانیوں سے لبالب افسانہ نگار ہے اور اس کے گودام کبھی خالی نہیں ہوتے۔آج اردو کہانی اپنے کہانی پن کی وجہ سے جو دوبارہ مقبول ہونے لگی ہے تو اس میں سب سے بڑا حصہ منشایاد کا ہے۔

دوستی کے لائق ہونا ایک غیر معمولی صفت ہے۔ممکن ہے کوئی شخص بہت عالم فاضل ہو، دانشور ہو، بے مثال تخلیق کار ہو اور بہت شریف آدمی ہو لیکن ان سب باتوں کے باوجود یہ عین ممکن ہے وہ اچھا دوست ثابت نہ ہو سکے بلکہ اچھا دوست ثابت ہونے کی صلاحیت ہی سے محروم ہو لیکن اگر کسی شخص میں ایسی سب خوبیاں بھی ہوں اور وہ اچھا دوست بھی ثابت ہو سکتا ہو تو سمجھ لیجئے وہ منشایاد ہے۔

☆☆☆

میں جب یہ خاکے لکھ رہا تھا اس زمانے میں مجھے عظیم سنگ تراش مائیکل انجلیو کئی دفعہ یاد آیا، جس نے کہا تھا ''تصویریں تو پتھر میں پہلے سے موجود ہوتی ہیں، میں تو صرف فالتو پتھر ہٹا دیتا ہوں''۔ایک عرصہ تک میں اس رائے کو اس کی فنکارانہ انکساری سمجھتا رہا مگر ابھی کل مجھے محسوس ہوا کہ نہیں یہ رائے مائیکل انجلیو کی فنکارانہ انکساری سے زیادہ اس کی دوررس اور باریک بیں نگاہ کو ظاہر کرتی ہے جو پتھروں میں تصویروں کو ان کے مکمل خدوخال کے ساتھ دیکھ سکتی تھی۔۔۔۔میں سمجھتا ہوں ایک بڑے تخلیق کار کے لئے ضروری ہے کہ وہ یہ طے کر سکے کہ لباس کہاں ختم ہوتا ہے اور جسم کہاں سے شروع ہوتا ہے۔

(خاکوں کے مجموعہ **چھوٹی دنیا بڑے لوگ** کے آغاز میں شامل **اکبر حمیدی** کی تحریر)

اکبر حمیدی (اسلام آباد)

محبت کے زمانے آگئے ہیں
عنایت کے زمانے آگئے ہیں

چلو اب جیت جانے دیں اسی کو
شرافت کے زمانے آگئے ہیں

گھنے جنگل تھے طاقت کے زمانے
سیاست کے زمانے آگئے ہیں

بہر سُو چھپے ہیں گل رُخوں کے
قیامت کے زمانے آگئے ہیں

ہوئے تہہ دار نظروں کے اشارے
علامت کے زمانے آگئے ہیں

رقابت کے زمانے ہو چکے سب
رفاقت کے زمانے آگئے ہیں

بہت ہے جنبشِ ابرو بھی ہم کو
بلاغت کے زمانے آگئے ہیں

وہ زلفیں کھول کر آئے ہیں اکبر
کہ راحت کے زمانے آگئے ہیں

اکبر حمیدی

مجھے تُو ہی نہیں سارا زمانہ چاہیے ہے
کہ اِک گوہر تو کیا پورا خزانہ چاہیے ہے

گزشتہ عمر تو اِس خبط میں ہم نے گنوائی
محبت کے لیے اچھا گھرانا چاہیے ہے

غزالوں کے شکاری تجھ کو یہ بھی سوچنا تھا
شکاری کو بہت کچھ دام و دانہ چاہیے ہے

جہاں شاہ وگدا، اپنے پرائے ایک سے ہوں
حقیقت میں ہمیں اِک بادہ خانہ چاہیے ہے

بغیر اس کے نہیں آئے گا اس میں لطف کوئی
حقیقت کو بھی کچھ رنگِ فسانہ چاہیے ہے

یہ دنیا تم کو حسن وعشق کی مورت لگے گی
پر اندازِ نظر بھی عاشقانہ چاہیے ہے

جسے سنتے ہوئے خود کو فقط انسان سمجھیں
ہمیں اکبر وہ انسانی ترانہ چاہیے ہے

اکبر حمیدی

خواب اب چبھنے لگے آنکھوں میں
وہ بھی دن تھے کہ سجے آنکھوں میں

میں نے دیکھا اُسے سب زاویوں سے
اُس کے سب رنگ پڑے آنکھوں میں

تن بدن اُس کے بھی کلیاں چٹکیں
میرے بھی پھول کھلے آنکھوں میں

وہ مناظر تھے حواس اُڑنے لگے
پھر مرے بارہ بجے آنکھوں میں

دل کے آنگن میں نہ کھل پائے تھے جو
سب کے سب کھلنے لگے آنکھوں میں

وہ الاؤ جو کبھی ذہن میں تھے
اُس کو دیکھا تو جلے آنکھوں میں

جو نہ اکبر کبھی لکھ پایا اُسے
سب خطوط ایسے لکھے آنکھوں میں

اکبر حمیدی

گئی گزری کہانی لگ رہی ہے
مجھے ہر شے پُرانی لگ رہی ہے

وہ کہتا ہے کہ فانی ہے یہ دنیا
مجھے تو جاودانی لگ رہی ہے

یہ ذکرِ آسماں کیسا کہ مجھ کو
زمیں بھی آسمانی لگ رہی ہے

ہر اک نوخیز کی مغروریوں میں
تری کافر جوانی لگ رہی ہے

بہت خوش معنی سی تحریر ہے وہ
کسی کی خوش بیانی لگ رہی ہے

وہ اِس حُسنِ توجہ سے ملے ہیں
یہ دنیا پُر معانی لگ رہی ہے

غزل دنیا میں رہتا ہوں میں اکبر
یہ میری راجدھانی لگ رہی ہے

اکبر حمیدی

دل کی گرہیں کہاں وہ کھولتا ہے
چاہتوں میں بھی جھوٹ بولتا ہے

سنگ ریزوں کو اپنے ہاتھوں سے
موتیوں کی طرح وہ رولتا ہے

جھوٹ ہی بولتا ہے وہ لیکن
لہجے میں اولیا کے بولتا ہے

کیسا میزان عدل ہے اس کا
پھول کانٹوں کے ساتھ تولتا ہے

ایسا وہ ڈپلومیٹ ہے اکبر
زہر اَمرت کے ساتھ گھولتا ہے

اکبر حمیدی

اس کو نظر میں بھر رکھا ہے
آدھا کام تو کر رکھا ہے

اس نے کہا تھا مت گھبرانا
ہر دیوار میں در رکھا ہے

کچھ تو اس کے معنی ہوں گے
ہر شانے پر سر رکھا ہے

سب جھلکے پر نظر نہ آئے
ایسا پردہ کر رکھا ہے

میری خاک کے اندر اکبر
لطفِ خیر شر رکھا ہے

اکبر حمیدی

کتنے برسوں سے مرے مہمان ہو
اے غمِ دنیا بس اب دفعان ہو

ختم ہو جائیں گی ساری دقتیں
عید آتی ہے اگر رمضان ہو

کِس طرح مایوس ہو کر لوٹ جاؤں
سامنے جو عالمِ امکان ہو

دیکھتا ہوں تم کو تو ایسا لگے
تازہ پھولوں سے بھرا گلدان ہو

تم سے ہیں اس آئینے کی رونقیں
تم ہی تو اس آئینے کی جان ہو

تنگ رستوں سے سڑاند آنے لگے
دوستو مت اس قدر گنجان ہو

کٹ تو جائے گا سفر اکبر مگر
ہمسفر اچھا ہو تو آسان ہو

اکبر حمیدی

توقعات زیادہ نہیں رکھا کرتے
دکھوں کے واسطے رستا نہیں رکھا کرتے

خود اپنے ذہن میں سب رونقیں لگا رکھیں
کہ اپنے آپ کو تنہا نہیں رکھا کرتے

سوائے اس کے کوئی دوسرا نہیں ہے یہاں
کبھی گماں بھی کسی کا نہیں رکھا کرتے

جو تم پہ بند ہوں دروازے بادہ خانے کے
خیالِ ساغر و مینا نہیں رکھا کرتے

پڑے جو رَن کسی بُزدل کو ساتھ مت لینا
کہ راہِ سیل میں تنکا نہیں رکھا کرتے

جو زندگی کا تقدس بحال رکھنا ہو
تو سب کے سامنے دکھڑا نہیں رکھا کرتے

چھپائے رکھا ہے اکبر نے اس کے ہجر کا دکھ
کچھ اس طرح سے کہ گویا نہیں رکھا کرتے

اکبر حمیدی

کسی وہم و گماں میں مت رہنا
بے مکاں کے مکاں میں مت رہنا

دیکھنا اوروں میں اتر کر بھی
اپنے ہی جسم و جاں میں مت رہنا

بھیڑ میں رہ کے کچلا جائے گا
دیکھ یوں درمیاں میں مت رہنا

وہی اچھے ہیں جو زمیں پر ہیں
تم کسی آسماں میں مت رہنا

اب یہ سکّہ نہیں ہے چلنے کا
نسبتِ این و آں میں مت رہنا

بات کر اس کے پیکرِ گُل کی
اپنے رنگِ بیاں میں مت رہنا

نئی دنیا بلاتی ہے اکبؔر
گئے گزرے جہاں میں مت رہنا

اکبر حمیدی

فضا میں اس کی خوشبو بھی ہے شامل
کہ جنگل میں وہ آہو بھی ہے شامل

جو شامیں سُرمئی ہونے لگی ہیں
تری آنکھوں کا جادو بھی ہے شامل

زمانہ اچھا اب لگتا ہے مجھ کو
زمانے میں کہیں تو بھی ہے شامل

سنورتے رہتے ہیں دنیا کے تیور
کہ دنیا میں وہ خوش خو بھی ہے شامل

میں خود کو جھانکتا ہوں خود میں، شاید
کہیں وہ آئینہ رُو بھی ہے شامل

رویے بائیں بازو کے ہیں سارے
مگر کچھ دایاں بازو بھی ہے شامل

نظر آتا ہے دنیا دار اکبؔر
پر اس میں ایک سادھو بھی ہے شامل

صبا اکبر آبادی

شبِ غم اور جگمگاتا شہر
ہے اندھیرے پہ روشنی کا قہر

دل میں اُٹھنے لگی ہے درد کی لہر
اس نظر نے پلا دیا کیا زہر

اے زمیں تیری خاکساری سے
کیا بدل جائے گا مزاجِ سپہر

اُس نظر میں سُرور کی موجیں
جیسے بہتی ہوئی شراب کی نہر

ڈر یہ ہے بندگانِ دنیا پر
کہیں نازل نہ ہو خدا کا قہر

کیا کریں اب تصوّرِ جنت
ہے بہت دلفریب جلوۂ دہر

ایک دیوانے کے نہ ہونے سے
کتنا ویران ہوگیا ہے شہر

دل میں خنجر اُتر گیا اُس کا
اب کہاں رک سکے گی خون کی لہر

گھر سے نکلے تو غم نہیں ہے صبؔا
کس کا ویرانہ اور کیسا شہر

صبا اکبر آبادی

جو ہمارے سفر کا قصّہ ہے
وہ تری رہگزر کا قصّہ ہے

صبح تک ختم ہو ہی جائے گا
زندگی رات بھر کا قصّہ ہے

دل کی باتیں زباں پہ کیوں لاؤ
گھر میں رہنے دو گھر کا قصّہ ہے

کوئی تلوار کیا بتائے گی
دوش کا اور سر کا قصّہ ہے

چلتے رہنا تو کوئی بات نہ تھی
صرف سمتِ سفر کا قصّہ ہے

جیتے جی ختم ہو نہیں سکتا
زندگی عمر بھر کا قصّہ ہے

شام کو ہم سنائیں گے تم کو
شبِ غم کی سحر کا قصّہ ہے

میری بربادیوں کا حال نہ پوچھ
ایک نیچی نظر کا قصّہ ہے

اُسی بیداد گر سے کہہ دے صبؔا
اُسی بیداد گر کا قصّہ ہے

مظفر حنفی (دہلی)

ہمارے گھر پہ کبھی سائبان پڑتا نہیں
یہ وہ زمیں ہے جہاں آسمان پڑتا نہیں

پڑاؤ کرتے چلے راہ میں تو چلنا کیا
سفر ہی کیا ہے اگر ہفت خوان پڑتا نہیں

بجھانی ہو گی ہمیں خود ہی اپنے گھر کی آگ
کہیں سے آئے گی امداد، جان پڑتا نہیں

مزے میں ہو جو تمہیں بے زمین رکھا ہے
کہ فصل اُگاتے نہیں ہو، لگان پڑتا نہیں

عطا خلوص نے کی ہے یقین کی دولت
گمان اس کے مرے درمیان پڑتا نہیں

ہم احتجاج کسی رنگ میں نہیں کرتے
ہمارے خون سے کوئی نشان پڑتا نہیں

بہتروں میں اسے بھی شمار کر لینا
مباحثے میں مِرا خاندان پڑتا نہیں

مظفر حنفی

ہوا ناراض تھی ہم سے، کنارا دور تھا ہم سے
سمندر تھا کہ یاں سے واں تلک بھرپور تھا ہم سے

خودی، خود آگہی، خود رائی جس میں جلوہ گر ہوتے
وہ آئینہ تو پہلے دن ہی چکنا چور تھا ہم سے

محبت اور جوانا مرگ ، رونا داستاں گو کا
گھنی باتوں کا جنگل رات بھر پُر نور تھا ہم سے

مزا بھی ہے، سزا بھی ہے مسلسل رقص کرنے میں
مگر ہم رقص ہم تھے آسماں مجبور تھا ہم سے

خود اپنے کو بھی اک پردے میں رہ کر دیکھنا ہوگا
یہی جو آئینے میں ہے ابھی مستور تھا ہم سے

مظفؔر اب یہی دنیا ہمیں نابود کردے گی
یہ پیمانہ لبا لب تھا کبھی، معمور تھا ہم سے

عبداللہ جاوید (کینیڈا))

گھٹا لے کر چلو، چھانا اگر ہو
کسی پیاسے کو ترسانا اگر ہو
فلک پر ڈولتے پھرنے سے حاصل
برس جاؤ، برس جانا اگر ہو
بہت پیاسی، بہت پیاسی، زمیں ہے
سمندر لاؤ، برسانا اگر ہو
پیو پانی شرابِ ناب کرکے
بہک جاؤ، بہک جانا اگر ہو
برونِ آئینہ کوئی نہ آئے
درونِ آئینہ جانا اگر ہو
پلٹ کر آیئے پھر زندگی میں
کیئے پر اپنی شرمانا اگر ہو
تعاقب کیجیئے بیتے دنوں کا
تعاقب کرکے پچھتانا اگر ہو
جہاں میں چھوڑیئے کچھ خاص اپنا
جہاں کو چھوڑ کر جانا اگر ہو
کسی لفظوں کے دیوانے سے ملیئے
کوئی لفظوں کا دیوانہ اگر ہو
ابھی کچھ حرف اور کچھ لفظ جی لیں
پھر اس کے بعد مر جانا اگر ہو
غزل بن جایئے جاویدؔ صاحب
غزل ارشاد فرمانا اگر ہو

عبداللہ جاوید

کبھی پیارا کوئی منظر لگے گا
بدلنے میں اسے دم بھر لگے گا
نہیں ہو تم تو گھر جنگل لگے ہے
جو تم ہو ساتھ جنگل گھر لگے گا
ابھی ہے رات باقی وحشتوں کی
ابھی جاؤ گے گھر تو ڈر لگے گا
کبھی پتھر پڑیں گے سر کے اوپر
کبھی پتھر کے اوپر سر لگے گا
درودیوار کے بدلیں گے چہرے
خود اپنا گھر، پرایا لگے گا
چلیں گے پاؤں اس کوچے کی جانب
مگر الزام سب دل پر لگے گا
ہم اپنے دل کی بابت کیا بتائیں
کبھی مسجد کبھی مندر لگے گا
اگر تم مارنے والوں میں ہو گے
تمہارا پھول بھی پتھر لگے گا
کہاں لے کر چلوگے سچ کا پرچم
مقابل جھوٹ کا لشکر لگے گا
زمیں کو اور اونچا مت اٹھاؤ
زمیں کا آسماں سے سر لگے گا
جو اچھے کام ہوں گے اُن سے ہوں گے
بُرا ہر کام اپنے سر لگے گا
سجاتے ہو بدن بے کار جاویدؔ
تماشہ روح کے اندر لگے گا

تاجدار عادل (کراچی)

سمجھ میں آ نہ سکا دل کا حال تھا کیسا
کہ اس سے مل کے بھی ہم کو ملال تھا کیسا

جسے یقین رہا مستقل بلندی کا
خبر ہوئی ہے اُسی کو زوال تھا کیسا

یہ آفتاب و ستارہ تو اک علامت ہیں
کہیں یہ کس سے کہ وہ بے مثال تھا کیسا

سنائیں کس کو کہ یہ ہجر سب کا موسم ہے
کسے بتائیں الگ اپنا حال تھا کیسا

نشاطِ وصل میں دل بھی سمجھ سکا نہ جسے
تری نگاہ میں جانے سوال تھا کیسا

جو ایک بوند لہو کی پلک پہ اُبھری تھی
بتا رہی تھی بچھڑ کر ملال تھا کیسا

کبھی جو آئے گا چہرے پہ گردِ وقت لئے
اُسے بتائیں گے اُس کا جمال تھا کیسا

خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور نہیں سمجھے
صبا کو قید کیا جس نے سال تھا کیسا

سجایا شہرِ سخن کو بھی جس طرح چاہا
ہمارے ہاتھوں میں عادل کمال تھا کیسا

تاجدار عادل

زندگی میں کوئی کمی ہے کہیں
لاکھ ڈھونڈا پتہ چلا بھی نہیں

اس طرح اس کی یاد آتی ہے
جیسے بادل برس رہا ہو کہیں

زندگی دھند اداس جنگل کی
کھوگئے ہو تم اس میں دور کہیں

دل کی دنیا میں آکے دیکھو تو
اس سے بہتر نہ آسماں نہ زمیں

روز تازہ فریب کھایا ہے
زندگی بھی تو خود فریب نہیں

میری منزل ہی اس کی منزل ہے
خوش گمانی پہ کررہا ہوں یقیں

طے کیا تھا کبھی نہ ملنا ہے
بھول کر عہد چل دیئے ہیں وہیں

رقص کیوں ہو رہا ہے خوشبو کا
تم تو ملنے کبھی بھی آئے نہیں

غم کی شدت میں خاص جوہر ہے
آگ لگنے لگی ہے دل کے قریں

آج دل کو کسی کی یاد آئی
بھول بیٹھے پھر آج کفر و دیں

تیرے درشن کا یہ کرشمہ ہے
زندگی ہوگئی ہے کتنی حسیں

میں نے عادل اسے بھلایا بہت
دل نے لیکن کہا سنا ہی نہیں

تاجدار عادل

ہر طرف کچھ کمی عجیب سی ہے
آج کل زندگی عجیب سی ہے

پھول کھلنے لگے ہیں کانٹوں میں
عشق میں تازگی عجیب سی ہے

کبھی جاتے نہیں ہیں اس کی طرف
طلبِ یار بھی عجیب سی ہے

ساری دنیا نظر میں ہے لیکن
اس کی تو بات ہی عجیب سی ہے

بے سبب دل اداس رہتا ہے
صبح بھی شام بھی عجیب سی ہے

اپنے ہی آپ کو ستاتا ہے
دوست کی دشمنی عجیب سی ہے

ہر اندھیرا دکھائی دینے لگا
آج کل روشنی عجیب سی ہے

کھِلتی ہے تمہاری یادوں سے
غم کی ہر اک خوشی عجیب سی ہے

جیسے صحرا میں کھل رہی ہو دھنک
رنگ میں سادگی عجیب سی ہے

راس آتی نہیں کسی کو بھی
آج کل دوستی عجیب سی ہے

اس کے خوابوں سے جی نہیں بھرتا
نیند کی آنکھ بھی عجیب سی ہے

سوکھے آنسو ہوں جیسے آنکھوں میں
گاؤں کی چاندنی عجیب سی ہے

عشق دنیا سے کیسے ہار گیا
یہ کہانی بڑی عجیب سی ہے

کیا توجہ ہے اُس کی ملنے پر
کس قدر بے رُخی عجیب سی ہے

کل پُراسرار جیسی چاہت تھی
ویسی ہی آج بھی عجیب سی ہے

عشق میں چند راز ہوتے ہیں
یہ مگر آگہی عجیب سی ہے

ایک جادو ہوئی حقیقت بھی
کبھی سادہ کبھی عجیب سی ہے

بھول بیٹھا ہوں میں اُسے جب سے
دل میں کچھ بے کلی عجیب سی ہے

بادشاہ ہیں فقیر کے در پر
عشق کی راہ بھی عجیب سی ہے

خود ہی لکھتا ہوں اور سوچتا ہوں
اب مری شاعری عجیب سی ہے

میں ہی شاید بدل گیا ہوں اب
یا تری دوستی عجیب سی ہے

عادل اُس کا دھیان رہتا ہے
تیری یہ بے خودی عجیب سی ہے

مقبول احمد مقبول (اودگیر، لاتور)

دینا ہی ہے تو دے دے تو موت ہی کی چادر
یارب نہ دے کسی کو یوں بے کسی کی چادر
چلنا سنبھل سنبھل کے، کھاؤ گے ورنہ دھوکہ
اوڑھے ہوئے ہیں رہزن اب رہبری کی چادر
بازارِ زندگی میں ہیں جھوٹ کی ردائیں
نایاب ہے اگر تو، ہے راستی کی چادر
ایسا نہ ہو کسی دن دَم گھٹ کے مر ہی جائیں
اوڑھے رہو نہ ہر دم سنجیدگی کی چادر
تن پر دریدہ کپڑے نورِ حیا نظر میں
سر پر یقیناً اس کے ہے بے کسی کی چادر
ہیں کام دوسرے بھی، کب تک رفو کروں میں
رہ رہ کے ہے مسکتی یہ زندگی کی چادر
بنتی ہے وجہِ ذلت ہر پوششِ تکبر
وجہِ فروغ عزت ہے سادگی کی چادر
ہر بوالہوس کے کے دل میں جب حرصِ شاعری ہو
کیسے رہے سلامت پھر شاعری کی چادر
مقبولؔ! پاسِ یزداں وقعت اسی کی ہو گی
بے داغ جس کسی کی ہو بندگی کی چادر

خورشید اقبال (جگتدل، مغربی بنگال)

دیوارِ احتیاط گری ، آگ لگ گئی
چنگاری اک ذرا سی اڑی ، آگ لگ گئی

تم نے کہی تو ہم نے سنی سن کے چپ رہے
ہم نے جب ایک بات کہی آگ لگ گئی

دشوار اصل میں تو بجھانا ہے میرے دوست
لگنے کو، ایک تیلی جلی ، آگ لگ گئی

ماحول ہی تھا آگ کے لائق بنا ہوا
جب ہی تو کوئی بات نہ تھی، آگ لگ گئی

اک زندگی اور اتنے مسائل مرے خدا
سیلاب آ گیا ،تو کبھی آگ لگ گئی

پلکوں میں اپنی خواب ادھورا لئے ہوئے
بے چارہ سو رہا تھا ،تبھی آگ لگ گئی

خورشیدؔ آگ آپ ہی لگتی نہیں کبھی
تم نے ہی احتیاط نہ کی ، آگ لگ گئی

حسن عباس رضاؔ (نیویارک)

زمیں سرکتی ہے ، پھر سائبان ٹوٹتا ہے
اور اُس کے بعد سدا آسمان ٹوٹتا ہے
میں اپنے آپ میں تقسیم ہونے لگتا ہُوں
جو ایک پَل کو کبھی تیرا دھیان ٹوٹتا ہے
کوئی پرند سا پَر کھولتا ہے اُڑنے کو
پھر اک چھناکے سے یہ خاکدان ٹوٹتا ہے
جسے بھی اپنی صفائی میں پیش کرتا ہُوں
وہی گواہ ، وہی مہربان ٹوٹتا ہے
نہ ہم میں حوصلۂ خودکشی ، کہ مر جائیں
نہ ہم سے قفلِ درِ پاسبان ٹوٹتا ہے
میں وجۂ ترکِ تعلق بتا تو دُوں ، لیکن
اِس انکشاف سے اک خاندان ٹوٹتا ہے
زکواۃِ عشق اگر بانٹنے پہ آ جاؤں
تو اک ہجومِ طلب مُجھ پہ آن ٹوٹتا ہے
کسی نے داغِ جدائی نہیں دیا ، لیکن
میں اتنا جانتا ہوں ، کیسے مان ٹوٹتا ہے
جو آندھیاں سرِ صحرائے ہجر اُٹھتی ہیں
اُنہی میں شیشۂ دل ، میری جان ٹوٹتا ہے

حسن عباس رضاؔ

عجیب کارِ زیاں پر لگا دیا تُو نے
تماشہ گر تھا ، تماشا بنا دیا تُو نے

میں عین خواب میں تجھ سے مُکرنے والا تھا
مجھے خبر ہی نہیں ، کب جگا دیا تُو نے

ابھی تو رات کی اندھی گلی کے وسط میں تھا
کہاں پہ لا کے بجھایا مِرا دِیا تُو نے

گریز پا مِرا ہمزاد مجھ سے تھا ، لیکن
اُسے تو اب مِرا دشمن بنا دیا تُو نے

پلٹ کے آنا بھی چاہوں تو آ نہیں سکتا
یہ کن ہواؤں کے رُخ پر اُڑا دیا تُو نے

سوال یہ نہیں ، میں نے تجھے بُھلایا کیوں؟
سوال یہ ہے ، مجھے کیوں بُھلا دیا تُو نے

میں ذات سے انکار کر بھی سکتا ہوں
گر اب کے بھی نہ مجھے آسرا دیا تُو نے

مِرے فراق میں شاید تجھے بھی ہو احساس
کہ میں وہ لعل تھا ، جس کو گنوا دیا تُو نے

کاوش پرتا پگڈھی (دہلی)

اب کہاں ہیں وہ سایہ دار درخت
ہائے کیا کیا تھے مشکبار درخت
ایک بھی تو نہیں ہے بار آور
اور آنگن میں چار چار درخت
پھل ابھی سے لگیں گے اس میں اگر
حسن کھو دے گا آبدار درخت
باغ سے کھیلتی ہے جب آندھی
ہو ہی جاتے ہیں ہمکنار درخت
فیض اُٹھاتے جو وقت پر آتے
کس کا کرتے ہیں انتظار درخت
باغباں سے ہیں کس لیے نالاں
باغ کے فربہ و نزار درخت
وہ یقیناً زمیں کو چومے گا
چاہے کتنا ہو پائدار درخت
باغباں قہقہے لگاتا ہے
گر پڑے سارے باردار درخت
کس کی فرقت میں رات دن کاوشؔ
روتے رہتے ہیں زار زار درخت

کاوش پرتا پگڈھی

پھرتی رہتی ہے جا بجا بدلی
میرے گھر پر کبھی تو آ بجلی
کس قدر خوش گوار تھا موسم
دیکھتے دیکھتے فضا بدلی
جانے کیا روگ لگ گیا ہے مجھے
وید نے آج پھر دوا بدلی
پہلے نکھرا ہے رنگ روپ اس کا
اور اب دیکھیے صدا بدلی
کچھ کو کتنا سکون ملتا ہے
اور کچھ کے لیے بلا بدلی
مدتیں ہو گئیں ملے تجھ سے
میری سن اور کچھ سنا بدلی
وہ بھی میری طرح ہے آوارہ
گھومتی رہتی ہے سدا بدلی
حملہ کرتی ہے دھوپ جب ہم پر
تو کھڑی دیکھتی ہے کیا بدلی
خیریت پھر نہیں میاں کاوشؔ
آنکھ اس کی اگر ذرا بدلی

قاضی اعجاز محوؔر

قاضی اعجاز محور (گوجرانوالہ)

کہانی مختصر لکھنی نہیں ہے
کہانی یہ مری اپنی نہیں ہے
جو گذرا ہے وہ سب کہہ ڈالنا ہے
کوئی اک بات بھی رکھنی نہیں ہے
حوالے چُپ کھڑے ہیں سامنے یوں
خموشی یہ سدا رہنی نہیں ہے
سبھی چہروں پہ اک عنواں لکھا ہے
ابھی وہ حرف بامعنی نہیں ہے
ہے پہرہ وحشتوں کا ہر گلی میں
کوئی کھڑکی نئی کھلنی نہیں ہے
محاذ آرائی دستک دے رہی ہے
یہ جنگ ہونی ہے اَب رکنی نہیں ہے
پرندہ امن کا پر تولتا ہے
کوئی زیتون کی ٹہنی نہیں ہے
زمیں کی پیاس بڑھتی جا رہی ہے
ندی اب سطح پر بہنی نہیں ہے
کوئی زندہ نہیں محوؔر یہاں پر
جو کہتا ہے 'میں ہوں' یعنی نہیں ہے

عظیم انصاری (نارتھ ۲۴ پرگنہ)

مدتوں بعد جنوں اس کا اثر تو آیا
مدتوں بعد سہی لوٹ کے گھر تو آیا
مدتوں بعد درِدل پہ ہوئی پھر دستک
مدتوں بعد کوئی لے کے خبر تو آیا
مدتوں بعد تبسم میں چھپایا غم کو
مدتوں بعد مجھے کوئی ہنر تو آیا
مدتوں بعد مرے دل میں تمنا جاگی
مدتوں بعد کوئی خواب نظر تو آیا
مدتوں بعد گرا دستِ دعا پر آنسو
مدتوں بعد مرے ہاتھ گہر تو آیا
مدتوں بعد جگا دل میں تصور اس کا
مدتوں بعد وہی شوقِ سفر تو آیا
مدتوں بعد بہت ٹوٹ کے برسا بادل
مدتوں بعد دعاؤں میں اثر تو آیا
مدتوں بعد حقیقت سے چرائیں آنکھیں
مدتوں بعد تخیل کا نگر تو آیا
مدتوں بعد ملا پھر کوئی منصور ہمیں
مدتوں بعد کوئی دار پہ سر تو آیا
مدتوں بعد ہوا پیڑ وہ سرسبز عظیمؔ
مدتوں بعد سہی اس پہ ثمر تو آیا

اقبال نوید (برطانیہ)

دور دور تک کوئی جب نظر نہیں آتا
آنکھ کا پرندہ بھی لوٹ کر نہیں آتا

موت بھی کنارہ ہے وقت کے سمندر کا
اور یہ کنارہ کیوں عمر بھر نہیں آتا

خواہشیں کٹہرے میں چیختی ہی رہتی ہیں
فیصلہ سنانے کو دل مگر نہیں آتا

دور بھی نہیں ہوتا میری دسترس سے وہ
بازوؤں میں بھی لیکن ٹوٹ کر نہیں آتا

اپنے آپ سے مجھ کو فاصلے پہ رہنے دے
روشنی کی شدت میں کچھ نظر نہیں آتا

میں کبھی نوؔید اس کو مانتا نہیں سورج
بادلوں کے زینے سے جو اُتر نہیں آتا

اقبال نوید

اگرچہ پار کاغذ کی کبھی کشتی نہیں جاتی
مگر اپنی یہ مجبوری کہ خوش فہمی نہیں جاتی

خدا جانے گریباں کس کے ہیں اور ہاتھ کس کے ہیں
اندھیرے میں کسی کی شکل پہچانی نہیں جاتی

مری خواہش ہے دُنیا کو بھی اپنے ساتھ لے آؤں
بلندی کی طرف لیکن کبھی پستی نہیں جاتی

خیالوں میں ہمیشہ اس غزل کو گنگناتا ہوں
کہ جو کاغذ کے چہرے پر کبھی لکھی نہیں جاتی

وہی رستے، وہی رونق، وہی ہیں عام سے چہرے
نوؔید آنکھوں کی لیکن پھر بھی حیرانی نہیں جاتی

بھول جا اُس کو بھول جاے دل

ناظم خلیلی (رائچور)

بہت سی چیزیں ہی جن کا کوئی شمار نہیں
گناہ جتنے ہیں، اُتنے گناہ گار نہیں

تجھے یہ فخر کہ تو نے کچل دیا مجھ کو
میں چوم کر ترے تلوے بھی شرمسار نہیں

پکارتا ہوں تجھے شاعری کی اوٹ سے میں
تو اپنے دل میں کہے لاکھ، یہ پکار نہیں

ہزار نعمتیں اور لاکھ صحبتیں حاصل
یہ خاک دھول ہیں کیونکہ وہ گل عذار نہیں

اس ایک غم کو لیے ساری عمر جینا ہے
وہ تیر دل میں ترازو ہے دل کے پار نہیں

میں اپنا مال پرایا کہوں مروت میں
میں تنگ دل سہی پر یہ مِرا شعار نہیں

غزل کو اپنی کسی اور کو نہ نذر کرو
جہانِ اردو میں سوپنگ کا کاروبار نہیں

Swapping مغربی ملکوں کے اعلیٰ طبقوں میں
میاں بیوی کی ادل بدل کا نیا فیشن ۔ (ناظم خلیلی)

ناظم خلیلی

بہارِ موسمِ دل اُتنی زرنگار نہیں
کہ نخلِ چشم پہ اب بارِ یادِ یار نہیں

ہجومِ درد، نہ آہ و بکا نہ یورشِ غم
دُکانِ عشق کھلی ہے پہ کاروبار نہیں

ہماری آنکھوں میں اُس چشمِ سُرمہ سا کی قسم
گزشتہ دور کی کرچیں ہیں، اب خمار نہیں

نہ آرزو، نہ طلب، جستجو نہ شوقِ وصال
مگر یہ دل ہے کہ پھر بھی اسے قرار نہیں

کچھ ایسا ہو کہ ہراک بات اَبکے اُلٹی ہو
وہ بار بار کہیں ہاں، میں بار بار نہیں

عجیب جا ہے یہ بازارِ دوستی کہ جہاں
ہر ایک جنس ہے پر جنسِ اعتبار نہیں

کاوش عباسی (کراچی)

بھول جا اُس کو بھول جا اے دل
وہ نہیں چاہتا وفا اے دل
دل نہیں اُس میں درد سا اے دل
وہ ہے بس دوست دور کا اے دل
حُسن ہے ،شوخیاں ہیں،چشمک ہے
چاہت اس کی نہیں ادااَے دل
میں ہوں یا اُس کے ملنے والے اور
وہ ہر اِک کو ہے ایک سااَے دل
مل لیے جب تو مل لیے اُس سے
ہجر اُس کا نہ پالنا اَے دل
ایسی گزری ہماری ،یار کے ساتھ
سفر اک جیسے دشت کا اَے دل
لاکھوں لمحوں میں ایک لمحہ بھی
وہ نہ تنہا ہمیں ملا اَے دل
وہ تھی بارش کہیں برستی اور
تُو تھا کھڑکی سے دیکھتا اَے دل
اُس کو بانہوں میں بھر نہ پانے کا
واقعہ جاں ہے پھونکتا اَے دل
اپنے دکھ سکھ بھی کچھ جیا ہوتا
تُو سب اُسی پر ہی مر مٹا اَے دل
وہ ہے پتھر ،تُو پاگلوں کی طرح
اُس کی جانب ہے بھاگتا اَے دل
وہ جو اب مُڑ کے دیکھتا بھی نہیں
تُو بھی کچھ اُس سے جی چرا اَے دل
تُو ہے کیوں اُس کے سلک میں لپٹا
قصہ تو ختم ہو چکا اَے دل

کاوش عباسی

عمر کا میل تو ہے دور کی بات
کوئی آئے نبھائے رات کی رات

یادِ یار آ کہ تیرے عکس بنیں
حسن و رنگ آفرینِ تشبیہات

کُھل ہی جائے گی آگے بڑھنے کی رَہ
اور کچھ دیر سر کھپائے حیات

بے حسی مجھ کو کھائے جاتی ہے
درد ، اے درد ، کوئی راہِ نجات!

تُو بھی سو جااَے میرے جاگتے دل
ہوگئی صبح سوئی جاگتی رات

کیسے آئینے چکنا چور ہوئے
وائے،اَے دہر سنگدل، ترے ہات

وصل تو فنگِ وصل تھا کاوشؔ
ہجر میں کون سی ہے ہجر کی بات

شبانہ یوسف (برطانیہ)

میں اُڑنا چاہوں بھی تو جیسے پَر نہیں ہوتا
اگر وہ میرا شریکِ سفر نہیں ہوتا

عذابِ در بدری پوچھ ان ہواؤں سے
کہ جن کا اس زمیں پر کوئی گھر نہیں ہوتا

بسا ہوا ہے کسی یاد کا جہاں اس میں
تبھی تو ویراں یہ دل کا نگر نہیں ہوتا

تُو شہرِ ذات میں یہ سوچ کر سفر کرنا
کہ واپسی کا یہاں کوئی در نہیں ہوتا

یہ بیل رزق ہواؤں کا بن چکی ہوتی
جو تیری چاہتوں کا اک شجر نہیں ہوتا

شبانہ کارِ سخن بھی ہزار نعمت ہے
میں کب کی مر چکی ہوتی یہ گر نہیں ہوتا

شبانہ یوسف

کسی کے واسطے اس طرح گھر لکھا میں نے
کہ خود تو دھوپ رہی اور شجر لکھا میں نے

میں کیسے روکتی بڑھتے ہوئے قدم اپنے
مرے نصیب میں تھا یہ سفر لکھا میں نے

یہ شاعری تو مرے دل کی اک بغاوت ہے
مجھے ہر ایک نے روکا مگر لکھا میں نے

کسی طرف بھی کنارا نظر نہیں آیا
جدائیوں کو سمندر ، اگر لکھا میں نے

بھٹک رہی ہوں نجانے تلاش میں کس کی
خبر نہیں کسے شام وسحر لکھا میں نے

اسے مٹایا کئی بار خوفِ دنیا سے
کبھی جو نام ترا ہاتھ پر لکھا میں نے

مرا یہ جرم، زمانے کے ساتھ چل نہ سکی
کہ پتھروں کی فصیلوں پہ در لکھا میں نے

شبانہؔ اس پہ بھی جھپٹے عقاب دنیا کے
جو کاغذوں کے کبوتر پہ پَر لکھا میں نے

سہیل احمد صدیقی (کراچی)

چلی ہوا بہار کی تو گُل وہ نار ہوگئے
خزاں کا ذکر کیا کریں کہ خود ہی خار ہوگئے

ہماری دُزنگاہی کا فسانہ پوچھتے ہو کیا
کبھی جو ذکر چھڑ گیا' وہ شعلہ بار ہوگئے

نگر نگر' ڈگر ڈگر' ہر اِک پہ ہے کڑی نظر
جو ننگِ شہر تھے کبھی ' سو شہر یار ہوگئے

عَلم بڑھا کے یک بہ یک جو میر کارواں چلا
تو پیڑ سارے شہر کے بے برگ و بار ہوگئے

کبھی ہمارے نام پہ تھا اعتبارِ انس وجاں
بس ایک تم سے کیا ملے' بے اعتبار ہوگئے

مہ و نجوم سے بھلا سہیلؔ کا مقابلہ؟
نثار جس فروغ پر مہر ہزار ہوگئے

[سہیلؔ ستارہ کائنات کا دوسرا روشن ترین ستارہ ہے جو سورج سے کئی ہزار گنا روشن تر ہے]

ناصر نظامی (ہالینڈ) سائنسی غزل

پیڑوں نے مسموم ہوا خود کھائی ہے
زندگی بخش ہوا ہم کو لوٹائی ہے

اپنے پھل کو میٹھا کرنے کی خاطر
جڑ نے کیا کیا دُکھ تکلیف اُٹھائی ہے

خود مٹی میں دب کر پھل کے لیے غذا
تنے کے رستے شاخوں تک پہنچائی ہے

چیزوں کا مُتضاد عمل کیا ہوتا؟
اِسی عمل کو جاننا تو دانائی ہے

محفل نے ہی تنہائی کو توڑا تھا
محفل نے ہی پیدا کی تنہائی ہے

سورج کی کرنوں کی ضو افشانی سے
چاند کے چہرے نے تابانی پائی ہے

جب کوئی عالیشان عمارت دیکھتا ہے
بام و در کی کرتا مدح سرائی ہے

کون بھلا اس اینٹ کے بارے سوچتا ہے
بنیادوں کی تہہ میں جو کام آئی ہے

صائمہ کنول (جرمنی)

چھائی اِس دل پہ یہ فضا کیا ہے
اور مرے دل میں خوش نما کیا ہے
مجھ کو بے چین کر گیا ہے جو
"آخر اس درد کی دوا کیا ہے"
دل دھڑکتا ہے، کیوں ترے دم سے
تجھ سے اب ،میرا واسطہ کیا ہے
بے وفا ہم کو کہہ رہے ہو مگر
جانتے بھی ہو تم وفا کیا ہے؟
وہ جو شرم و حیا سے عاری ہیں
پوچھ مت اِن سے، اب حیا کیا ہے
خود جسے اب تلک سمجھ نہ سکے
کیا کہوں تجھ سے ماجرا کیا ہے
گھر گئے سازشوں کے جال میں ہم
کیا کہوں اب برا بھلا کیا ہے
سوچ میں گم ہے آج دِل میرا
اُس نے آخر مجھے دیا کیا ہے
پوچھتی ہے کنولؔ خدا سے اب
میری قسمت کا یہ لکھا کیا ہے

غزل رضوی (فلوریڈا)

گڑیوں سے کھیلنے کے زمانے گزر گئے
اب خود سے پوچھتی ہوں ، وہ لمحے کدھر گئے

سویا رہا بدن میں کسی آرزو کا دکھ
جتنے حسین خواب تھے آنکھوں میں مَر گئے

اب کے بھی اُس نے بھیجا تھا خط میں ہمیں پیام
اب کے بھی اُس کا خط نظر انداز کر گئے

شاید نئی رُتوں میں مِلیں رنج بھی نئے
مدت ہوئی جو زخم پرانے تھے ، بھر گئے

حیرت سے دیکھتا ہے ہمیں آئنہ غزلؔ
ہم خواہشِ وصال میں اتنے سنور گئے

حیدرقریشی (جرمنی)

دل کہیں پر ہے اور دماغ کہیں
اپنا ملتا نہیں سراغ کہیں
وصل کی شب کہیں پہ اُتری ہے
بجھ گیا ہجر کا چراغ کہیں
مئے رُخسار و چشم و لب اتنی
چھوٹا پڑ جائے نہ ایاغ کہیں
لَو لپکتی، نہ دُود سا کچھ تھا
عشق کا جل رہا تھا داغ کہیں
خواب مجھ سا ہی دیکھ کر کوئی
ہو رہا ہوگا باغ باغ کہیں
نقطۂ علم کے سمجھنے کو
دل سا، لائے کوئی دماغ کہیں
اک تصور میں کھو گئے ایسے
اب میسر نہیں فراغ کہیں
جتنا ممکن تھا،اُتنا وعدہ تھا
کب دکھائے تھے سبز باغ کہیں
محوِ پرواز ہے ابھی حیدؔر
رہ گئے راستے میں زاغ کہیں

حیدرقریشی

وصل کی تفہیم،تفریقِ ہوس کرتے ہوئے
مان ہی جائے گا آخر پیش و پس کرتے ہوئے

آنکھ سے اوجھل کیا،اذنِ سفر دے کر ہمیں
اور دل میں رکھ لیا،دل کو قفس کرتے ہوئے

پختگی ایمان میں آئی ہے پہلے سے سوا
دشمنِ ایماں کو اپنا ہم نفس کرتے ہوئے

فون سے بھی اس کے ہونٹوں کا اثر آیا سدا
گھولتا ہے کان میں،لفظوں کو، رَس کرتے ہوئے

پھیلتی جاتی ہے اس کے لمس کی دل میں دھنک
اُسنے دیکھااس طرح نظروں سے مَس کرتے ہوئے

عمر کی ناپائیداری کا بھی کچھ تو سوچتے
وصل کی تاریخ کو اگلے برس کرتے ہوئے

آخری منزل سمجھ کر ،جسم و جاں کا قافلہ
رُک رہا ہے، بند آوازِ جرس کرتے ہوئے

اب نہ وہ زورِ بیاں حیدؔر ،نہ اب وہ رات دن
پھر شروع ہوجانا اک قصہ کو بس کرتے ہوئے

شاہد ماہلی (دہلی)

پتّھروں کی چاپ سُن، نقشِ صَدا محفوظ کرلے
آنے والی یہ صَدی پُوچھے گی کیا، محفوظ کرلے

مُشتہر کردے، کتابِ زندگی کے باب سارے
رازِ دل کے کچھ مگر صفحے ذرا محفوظ کرلے

کچھ ریا، کچھ مَصلحت، کچھ دُور اَندیشی کی خاطر
دُشمنوں کے درمیاں کچھ ہم نَوا محفوظ کرلے

کچھ سُراغِ زندگی ماضی کے تہہ خانوں میں رکھ دے
اُنگلیو ں کے کچھ نِشاں، کچھ نقشِ پا محفوظ کرلے

کون جانے ،خُشک ہوجائیں کہاں،خوشیوں کے دَھارے
کچھ ہنسی بچوں کی، بوڑھوں کی دعا محفوظ کرلے

ڈال دے دَامن میں کل کے،تلخیاں ماضی کی ساری
داستانِ غم کا سارا سلسلہ محفوظ کرلے

سارے منظر بے کراں شب میں پگھل جائیں گے شاہدؔ
تیرگی بڑھنے سے پہلے اِک سِرا محفوظ کرلے

شاہد ماہلی

سانسوں میں، رَگ و پے میں سَمایا ہے کوئی اور
ہے زیست کسی اور کی جیتا ہے کوئی اور

آنکھوں نے بَسائی ہے کوئی اور ہی صُورت
اِس دل کے نہاں خانے میں ٹھہرا ہے کوئی اور

کیا طُرفہ تماشا ہے کہ اِس دل کی صَدا کو
سُنتا ہے کوئی اور سمجھتا ہے کوئی اور

اِک آگ ہے جو دل میں بُجھی جاتی ہے ہر پَل
خِرمن سے جو اُٹھتا ہے وہ شعلہ ہے کوئی اور

لاشے ہیں کنارے پہ پڑے تشنہ لبوں کے
جو پیاس بُجھاتا ہے وہ دریا ہے کوئی اور

ہر صبح پہ سایہ سا ہے کچھ تلخی شب کا
ہر شام کو اندیشۂ فردا ہے کوئی اور

اِک بوئے رِفاقت سی فضاؤں میں ہے شاہدؔ
اِس کوچۂ بیگانہ سے گذرا ہے کوئی اور

شاہد ماہلی

درد تھم جائے گا، موسم بھی بدل جائے گا
دِل تو پھر دِل ہے کسی طور بہل جائے گا

میہماں بَن کے جو آیا ہے درونِ دل میں
آج اگر رُک بھی گیا ہے تو وہ کل جائے گا

زخم بھر جائے گا رہ جائے گی تا عُمر چُبھن
یہ جو کانٹا ہے کِسی طرح نِکل جائے گا

کھینچ رکّھا ہے تمنّاؤں نے شعلوں کا حصار
جو بھی یاں پاؤں کو رکّھے گا وہ جَل جائے گا

اِک ذرا وقت کی باہوں میں سمٹ جانے دو
کوہ صدیوں کا بھی لمحوں میں پگھل جائے گا

تجھ کو الفاظ کی دیوار میں چُن جاؤں گا
یہ قلم لے کے ترے پاس غزل جائے گا

آنے والی یہ صدی یاد کرے گی شاہدؔ
جو بھی اِک لمحہ مِرے شعر میں ڈھل جائے گا

شاہد ماہلی

کوئی صَدا، کوئی سایہ، نہ سلسلہ کوئی
تمام راہ دُھندلکوں میں ڈُوب ڈُوب گئی

بہت قریب سے دیکھا تو میرا سایہ تھا
جسے گلے سے لگائے ہوئے تھی تنہائی

عجب صَدا تھی کہ دیکھی گئی نگاہوں سے
عجیب بَرق تھی کانوں سے آ کے ٹکرائی

رگوں میں پھیل گیا زَہر خود پسندی کا
نمو کی دُھوپ سے دیوارِ جسم ٹوٹ گئی

خیالِ ریت کا صحرا، اُمید راکھ ہی راکھ
کوئی شرر بھی نہیں دل کی آگ ایسی بُجھی

شاہد ماہلی

اُداسی کا دُھواں بن کر جو روز و شب پہ چھایا ہے
وہ گذری ساعتوں میں اِک حسیں لمحے کا سایا ہے

بدلتے موسموں کا درد پھیلا ہے رَگ و پے میں
نگاہوں میں مگر اَب بھی وہی منظر سَمایا ہے

وہ صحنِ شب سے نکلا ہے جو شرمایا سا ایک سُورج
نہ جانے کِتنے خوابوں کے محل کو اس نے ڈھایا ہے

تری آنکھوں میں اُمیدوں کی شمعیں اَب بھی روشن ہیں
فسُردہ آندھیوں نے یوں تو ہر لمحہ بُجھایا ہے

ابھی تک یاد ہے اِک روز و شب کے وصل کا منظر
وگرنہ اس دلِ بے رحم نے کیا کیا بھُلایا ہے

شہپر رسول (نئی دہلی)

پتھرائی ہوئی آنکھیں، لب خاک
بیکار ہے سب دنیا سب خاک
جو صرف فسانوں میں مشغول
اشعار کا سمجھے مطلب خاک
سیلاب ہے اشکوں کا پُرزور
آرام سے اب نیچے دب خاک
اک چاند کا، اک سورج کا کھیل
دن راکھ اڑاتے ہیں شب خاک
کب فوج اُکھڑتی ہے اے شاہ
میدان میں اُڑتی ہے کب خاک
ہر کام ہے جب شہپر اک جھوٹ
ہر نام بھی ہوجائے تب خاک

شہپر رسول

سلاسل اُلٹے گھمادے سبھی نیا کردے
کہ انتہاؤں کو ساری تو ابتدا کردے

وہ اپنے ساتھ لیے جارہا ہے شہر کا شہر
اُسے کہو، مرے حق میں بھی کچھ دعا کردے

ہر اک جواب کی سرحد سے وہ گزر جائے
بس اک سوال اُسے میرا آئینہ کردے

ہر ایک آہوئے صحرا سیہ نہ ہوجائے
جو کرسکے کوئی اِس دھوپ کو گھٹا کردے

ہ
ے ''سچ میاں'' سے بڑا ''جبر خاں'' تو پھر شہپر
وہ ہنستی کھیلتی بستی کو کربلا کردے

شہپر رسول

زخم جلتے تو داغ کیا جلتے
روشنی میں چراغ کیا جلتے

بات چھڑتی نئے نشانوں کی
دل بھی جلتے، دماغ کیا جلتے

جرعۂ حرف تک نہیں روشن
یاں غزل کے اِیاغ کیا جلتے

راگ، سر، بھید سب طلسماتی
لحنِ بلبل پہ زاغ کیا جلتے

شہر میں درد کی ہوا ہے بہت
یاں چراغِ فراغ کیا جلتے

شہپر رسول

غضب تنہائی ہے سایہ نہیں ہے
ترے جیسا کوئی یکتا نہیں ہے

اتر کر پار ہم جائیں گے کیسے
ہماری راہ میں دریا نہیں ہے

دلوں پر جم گیا سکّہ سخن کا
مگر بازار میں چلتا نہیں ہے

تو آؤ! دور ہی سے دیکھتے ہیں
اگر اُس شہر کا رستہ نہیں ہے

بڑے، اچھے، نئے کو چھوڑو شہپر
کہ ان باتوں میں کچھ رکھّا نہیں ہے

شہپر رسول

''ثمر چراغ'' جو طاقِ شجر کو دیکھتے ہیں
ہوا کے ہاتھ بھی اپنے ہنر کو دیکھتے ہیں

یہ کس کا درد مرے دل میں آکے بیٹھ گیا
یہ کس کے اشک مری چشمِ تر کو دیکھتے ہیں

وہ اپنے وہم کی آہٹ سے چونکتے ہیں مگر
عجب نظر سے مرے ہم سفر کو دیکھتے ہیں

یہ تجربات خزانہ ہیں یا خسارہ ہیں
سنورنے ہی میں بکھرنے کے ڈر کو دیکھتے ہیں

عجب سکون سے پنجرے کی تیلیوں سے طیور
فضا میں اُڑتے ہوئے بال و پر کو دیکھتے ہیں

کئی عزیز مرے طرزِ شعر کے ہیں حریص
کئی غزال تری رہگزر کو دیکھتے ہیں

شہناز نبی (کولکتہ)

گم ہوئی کب کی زمیں، کب آسمان کھوگیا
ہم نے پیارے پر ذرا، سارا جہان کھوگیا

کس شہریت کی بات ہم کرتے وفا کے شہر میں
جس کی گواہی اہم تھی وہ مہربان کھوگیا

کیا جانے کتنی بار ہم گذرے سفر کے جوش میں
منزل تمام مٹ گئی، اک اک نشان کھوگیا

لو اب کے پھر وہی ہوا جس کا تھا اندیشہ ہمیں
دیوار و در ملے ہی تھے کہ سائبان کھوگیا

پھر یوں ہوا کہ خود بخود لہریں پکڑ میں آگئیں
جس پر بھروسہ تھا بہت وہ بادبان کھوگیا

اب دوپہر کی نیند کو آنکھیں ترس کے رہ گئیں
رخصت ہوئیں وہ فرصتیں، وہ اطمینان کھوگیا

صحراؤں کے اصول بھی ہوتے ہیں مختلف ذرا
لیلائے زر کی کھوج میں اک اک جوان کھوگیا

اپنی خموشی خود کو بھی تڑپاتی ہے پہ کیا کریں
اس دل کو جس پہ ناز تھا وہ ہم زبان کھوگیا

شہناز نبی

مسکنے لگی ہے یہاں اور وہاں
سیئے چادرِ یاد کوئی کہاں

میں اپنی نگاہوں میں گر جاؤں گی
اگر اشک بننے لگیں گے زباں

ہمیں تو بہاروں سے وحشت رہی
سیانوں کو ڈستا ہے خوفِ خزاں

وہ تھا نکتۂ انجامِ وفا
جسے ہم سمجھتے تھے آبِ رواں

تھکن اب کے کھلنے نہیں دیتی پر
نگاہوں سے ناپیں زماں اور مکاں

بہی لکھتا جاتا ہے وہ عشق کی
ہمیں تو برابر ہے سود و زیاں

وصیت یہ کی قاضیٔ شہر نے
سلامت رہے نہ کوئی فکر داں

مرا سر سجانے کی کوشش نہ کر
اسے تو بلاتی ہے نوکِ سناں

شہناز نبی

جلدی میں کچھ تو وہ بھی تھا، عجلت میں ہم بھی تھے
اس کو بھی کچھ جنون سا، وحشت میں ہم بھی تھے

مدت کے بعد رونے کی آخر فضا بنی
کچھ دل شکستہ وہ بھی تھا، فرصت میں ہم بھی تھے

بے اعتباریاں ہی جدائی کا ہیں سبب
اس کو اگر تھا خوف تو دہشت میں ہم بھی تھے

عیاریاں بنا کسی کوشش کے آگئیں
آخر کو شہر زادوں کی صحبت میں ہم بھی تھے

اچھا ہوا کسی نے بھی رکھا نہ ہم کو یاد
لوگوں کو بھول جانے کی عادت میں ہم بھی تھے

کس دل جلے نے موڑ دیا منزلوں کا رخ
رستوں کے اختصار سے کلفت میں ہم بھی تھے

اب تو شریکِ بزم وہ روشن دماغ ہے
کل تک تو ناشناسی کی ظلمت میں ہم بھی تھے

شہناز نبی

پھر یوں ہوا کہ طبقے بھی طبقوں میں بٹ گئے
وہ زعمِ اقتدار میں رعیت سے کٹ گئے
اب کیسا انقلاب، کہاں سر فرو شیاں
جو جان دینے والے تھے گھر کو پلٹ گئے
پھر تو رکا نہ کوئی جو آیا بہاؤ میں
مدت سے تھے خموش جو لاوے وہ پھٹ گئے
کچھ ایسے ہیں کہ جن کو میسر نہیں فراز
کچھ تو بلندیوں پہ پہنچ کر بھی گھٹ گئے
آخر تماشہ گاہ سے لوٹا وہ خالی ہاتھ
بس تالیاں بجا کے تماشائی چھٹ گئے
اس بحرِ بیکراں میں کریں کس لہر کی بات
سارے بھنور سفینے سے آکر لپٹ گئے
ہم نے نمازِ عصر میں جوں ہی جھکایا سر
جتنے غنیم تھے وہ مقابل میں ڈٹ گئے
منزل پکارتی ہے ادھر اور اس طرف
گھر کو رواں ہوئے تھے کہ رستے سمٹ گئے
دن بھر پکارتی ہی نہیں کوئی شئے ہمیں
لے آئی گھر میں رات تو گھر سے چمٹ گئے
شاید کبھی ادھر سے گذر جائے ماہ تاب
تھے جتنے خوش خیال دریچے سے سٹ گئے
پوچھا نہ ایک پل کو بھی اس نے ہمارا حال
اور ہم ہیں کہ حدیثِ غمِ جاں تھے رٹ گئے

خاوراعجاز (ملتان)

بات جب ہے کہ کوئی بات بنانی آ جائے
ایک ہی ذرّے میں صحرا کی کہانی آ جائے

آئنہ خانے میں چلتے ہیں دِیا لے کر ہم
دیکھتے ہیں جو نظر عہدِ جوانی آ جائے

ساتھ مِل جائے جو اِک بچھڑی ہُوئی لہر کبھی
میرے دریائے تحیّر میں روانی آ جائے

لِکھتے لِکھتے مجھے اِک عرصہ گزر جائے مگر
اُس کا اِظہار جب آئے تو زبانی آ جائے

ہو بھی سکتا ہے عصا ٹیکتی رَستے میں کہیں
وہی بچھڑی ہُوئی اِک شکل پُرانی آ جائے

خاوراعجاز

کوئی مہلت نہ دِی دریا کی سِتم رانی نے
مجھ کو بھی کھینچ لیا بہتے ہُوئے پانی نے

ڈُھونڈتا تھا مَیں گئے وقت کے کُچھ عکس مگر
مجھے گم کر دِیا آئینے کی حیرانی نے

مَیں جہاں بھی رہا تنہا نہیں رکھا مُجھ کو
خُود سے لپٹا لیا اُس شہر کی وِیرانی نے

کب ہُوئے میرے ، در و بامِ زمانہ تیرے
بے گھری ہی مجھے دِی گھر کی نگہبانی نے

ایک سِکہّ بھی مِرے نام کا چل پایا نہیں
مجھ کو رُسوا کِیا اِک روز کی سُلطانی نے

خاوراعجاز

زمینِ خواب پہ اِک نقش سا بناتا ہُوا
گزر گیا ہے وُہ دریا مجھے بُلاتا ہُوا

پڑی ہُوئی ہے مِرے دِل میں کس جہاں کی راکھ
کُریدتا ہے جسے وقت آتا جاتا ہُوا

مِرے جلو میں دُھواں ہی نہیں چراغوں کا
جلوسِ برگ بھی ہے تالیاں بجاتا ہُوا

ہوائے تیز میں اِک نخلِ خشک بیٹھ گیا
گذشتہ عہد کے رنج و الم اُٹھاتا ہُوا

رُکے ہُوئے نہیں ہم بھی بفیضِ سیلِ جنوں
گزر رہا ہے زمانہ بھی ڈگمگاتا ہُوا

خاوراعجاز

قریہ ء انجم و مہتاب سے آگے کیا ہے
خواب ہی خواب ہے تو خواب سے آگے کیا ہے

نیم روشن سا ہے اطراف کا سارا منظر
بابِ عرفاں تِری محراب سے آگے کیا ہے

بے سبب تو نہیں یہ نقلِ مکانی کا سماں
دوستو عالمِ اسباب سے آگے کیا ہے

اے زمانے مِری دھڑکن میں سما جا تُو بھی
اِس جہانِ دلِ بیتاب سے آگے کیا ہے

کِس لیے بھاگتی ہے وحشتِ صحرا آگے
میرے اِس دیدہ ء پُر آب سے آگے کیا ہے

نذیر فتح پوری (پونہ)

اپنے ہی پاس ہے جو جنسِ گراں باقی ہے
ہاٹ سب بند ہوئے دل کی دوکاں باقی ہے

حادثوں نے تو بہت شور مچایا لیکن
دل کی بستی میں محبت کا مکاں باقی ہے

شب کا ہر نقش تو سورج نے مٹا ہی ڈالا
شہر میں بس مِری آہوں کا دھواں باقی ہے

خواب تو آج بھی صف باندھے کھڑے ہیں لیکن
اپنی ہی آنکھ میں اب نیند کہاں باقی ہے

اس کے بجھنے کا ابھی کیسے کروگے اعلان
جس کی پلکوں پہ ابھی کاہ کشاں باقی ہے

اور اب کتنا مٹانا ہے مجھے خود کو یہاں
کتنا تقدیر میں اب کارِ زیاں باقی ہے

میں نے جو ماضی کے اوراق پہ لکھی تھی نذیرؔ
اس کہانی میں مِری عمرِ رواں باقی ہے

نذیر فتح پوری

ہے جب سے بند کوچۂ جاناں مرے لیے
وا ہو گئے ہیں کتنے بیاباں مرے لیے

آہیں تری ہیں میرے لیے آگ کی صلیب
آنسو ترے ہیں موجۂ طوفاں مرے لیے

میں ہر طرح تھا پیار کے مرہم کا مستحق
لائے ہیں یار لوگ نمکداں مرے لیے

جس نے حقیقتوں کو فسانہ بنا دیا
اب ڈھونڈتا پھرے ہے وہ عنواں مرے لیے

دل کی زمیں پہ سبزے کی چادر تنی رہی
جب جب کیا بہار نے احساں مرے لیے

میری رگوں میں کون جلا ہے لہو سمان
کس نے کیا ہے نظمِ چراغاں مرے لیے

میری طرح جو مجھ کو سنائے غزل نذیرؔ
اب ہوگا کون ایسا سخن داں مرے لیے

نذیر فتح پوری

کھول رہی ہے زخموں کی قندیل ہوا
کردے گی اب زخموں کو تبدیل ہوا

تیرے ہاتھ میں رنگوں کی تقسیم تمام
تیرے ذمے موسم کی ترسیل ہوا

قید ہیں سارے میری غزل کی سانسوں میں
پربت، جھرنا، وادی، جگنو، جھیل ہوا

لوٹے گی تو آگ لگا کر لوٹے گی
لے گئی بجھتے شعلوں کی قندیل ہوا

دھرتی کب تک بوجھ سہے گی یار نذیرؔ
کب تک دے گی بوڑھے پیڑ کو ڈھیل ہوا

نذیر فتح پوری

آ گئے کارواں اس کی تحویل میں
رہزنی قید تھی جس کی زنبیل میں

ہر برس بس یہی سوچ کر رہ گئے
گاؤں جائیں گے ہم اب کے تعطیل میں

آخری سین تھا، وہ بھی رخصت ہوا
عکس باقی نہیں اب کوئی رِیل میں

دائرے قید اس کو نہیں کر سکے
ایک سایہ لرزتا رہا جھیل میں

روشنی بانٹنے وہ چلا ہے نذیرؔ
تیل باقی نہیں جس کی قندیل میں

سلطان جمیل نسیم (کینیڈا)

تیز ہوا کے بعد

ہم سب خوف کے غبار میں لپٹے ہوئے تھے۔ بچوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور تیز ہوا کا ہر جھونکا بیوی کا رنگ اُڑا کے لے جاتا تھا۔ میں بظاہر زیادہ فکرمند نظر نہ آنے کی کوشش کرتا لیکن مجھے خبر تھی کہ اپنے ہی گھر میں قید ہو جانے کے احساس نے میرے اعصاب کو بھی شل کر کے رکھ دیا ہے اور مجھے بھی گھر کے بند دروازوں پر خوف کی دستک سنائی دے رہی ہے۔

آخر ایک رات ریڈیو اور ٹی وی نے یہ خوشخبری سنائی کہ شہر کی رونق اور ہمہ ہمی کو نگل جانے والے عفریت پر قابو پالیا گیا ہے..ہم نے اطمینان کا سانس لیا....میں نے کئی دن کے بعد کمرے کی کھڑکی کھول کے باہر جھانکا.... صحن میں تھکے ہوئے چاند کی روشنی دھول کی طرح اُڑتی پھر رہی تھی۔

''سب ٹھیک ہے نا....'' بیوی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا

''ہاں ابھی تو سب کچھ ٹھیک ہی دکھائی دے رہا ہے۔ سویرا ہونے پر ہی صحیح اندازہ ہوگا....'' میں نے کھڑکی کے پٹ بند کرتے ہوئے کہا۔

صبح جب ہم اُٹھے تو چہروں کی ایسی حالت تھی جو طویل سفر طے کرتے ہوئے کہیں ٹھہر کر ستانے سے ہوتی ہے۔ جب ہم ناشتہ کرنے بیٹھے تو بیوی نے اُن تمام چیزوں کی ایک پرچی بنا کے دیدی جو ختم ہو چکی تھیں۔

میری سب سے چھوٹی بیٹی نے پوچھا'' آج ہم اسکول جائیں؟''

میں نے شفقت سے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرا، پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا

''راستے تو کھل گئے ہیں۔ اسکول بند ہونے کی خبر بھی اخبار میں نہیں آئی ہے لیکن میرا خیال ہے بیٹے آج کے دن اپنے بستے اور کتابیں ٹھیک کرلو....کل سے جانا..''

عام طور سے اسکول نہ جانے کی خوش خبری بچوں کے چہروں پر گلال سا بکھیر دیتی ہے، مجھے اِس مسرت کا عکس اپنے بچوں کے چہروں پر نظر نہ آیا البتہ گھر میں بند رہنے کی دہشت ختم سی ہوگئی تھی۔ میں نے ضروری چیزوں کی فہرست لی اور بازار کے لئے گھر سے نکلا....کمرے سے نکل کر صحن میں پہنچتے ہی ایک عجیب سے احساس نے گھیر

لیا کہ آج کا دن اُن دنوں سے مختلف ہے جن سے ہفتہ بھر پہلے سامنا ہوتا رہا تھا...صحن میں سوکھے پتوں کے ساتھ دھوپ کی کرچیاں بھی پھیلی ہوئی ہیں....پیڑ پودوں کا رنگ بھی وہی ہے....گھر کے در و دیوار بھی پہلے جیسے ہیں...گلی میں لوگوں کی آمد و رفت بھی حسب سابق ہے۔ پھر دن میں کمی کا احساس کیوں ہوا....؟ اِس احساس کو میں نے یہ کہہ کر تھپکا کہ ہفتہ بھر گھر کی چار دیواری میں بند رہا ہوں..یہی ہفتہ بھر کی اجنبیت میرے اور دن کے درمیان حائل ہے....گھر سے چند قدم آگے نکلنے کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔

بازار میں معمول کی چہل پہل تھی۔ تمام دکانوں پر خریداروں کا ہجوم تھا۔ سڑک پر ٹریفک کی رفتار بھی پہلے ہی جیسی ہوگئی تھی اور تمام لوگوں کے چہرے اُن تاثرات سے بھرے تھے جو سویرے آئینہ دیکھتے ہوئے مجھے اپنے چہرے پہ دکھائی دیئے تھے۔ جب میں سودا سلف لے کے پہنچا تو اتنی دیر میں گھر کی صفائی ستھرائی ہو چکی تھی۔ صحن میں بکھرے ہوئے سوکھے پتے اور ہوا کے ساتھ اُڑ کے آجانے والا کوڑا کرکٹ صاف کیا جا چکا تھا اور درخت کی شاخوں سے چھن چھن کر آنے والی دھوپ کے دھبوں نے فرش پر روشنی کے پھول سے بکھیر رکھے تھے۔

میرے ہاتھ سے سودے کی ٹوکری لیتے ہوئے بیوی نے غور سے میری طرف دیکھا۔ میں سمجھا کہ چیزوں کی فہرست بنواتے وقت شاید کوئی چیز رہ گئی ہے اور اُس کا ذکر کرتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس کی جا رہی ہے۔ میں نے پوچھا:

''کیوں....کیا بات ہے۔''

''نہیں کچھ نہیں....''

میں نے ہنس کر کہا۔'' بتاؤ بھئی....کوئی چیز رہ گئی ہے تو ابھی لائے دیتا ہوں۔..''

اُس نے میری بات کا جواب نہیں دیا اور ٹوکری میں سے ایک ایک چیز نکال کر اپنے سامنے رکھتی رہی۔ پھر خالی ٹوکری ایک طرف رکھتے ہوئے پوچھا'' باہر سب ٹھیک ہے نا۔۔؟''

''ہاں آں....بالکل...'' وہ پھر خاموش ہوگئی....میں نے بچوں کی طرف دیکھا وہ اپنے کھیل میں مگن تھے....میں نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں کندھے اُچکائے اور اخبار پڑھنے لگا....اخبار کو دیکھتے ہوئے مجھے پھر اچانک خیال کہ آج کا دن باقی دنوں سے کچھ الگ تھلگ ہے۔ حالانکہ اخبار کی خبریں وہی ہیں جو ٹی وی اور ریڈیو نے سنائی ہیں۔ بس اخبار کی زبان، مصلحتیں اور رپورٹنگ ذرا مختلف ہے۔

لیکن یہ اخبار تو میں برسوں سے پڑھ رہا ہوں۔ اخبار کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ آج کا دن باقی دنوں سے کہیں مختلف ہے....کچھ ہونا چاہئے تھا جو نہیں ہے.... میرے اِس احساس کا تعلق اخبار سے نہیں ہوسکتا کیونکہ اخبار پڑھنے سے پہلے...کمرے سے باہر نکلتے وقت بھی مجھے یہی خیال گزرا تھا....میں نے اخبار ایک طرف رکھا اور دیوار میں لگے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کے اپنے چہرے کو غور سے دیکھا...کوئی خاص بات نہیں تھی....آج شیو نہیں کیا تھا۔ چہرے پہ کوئی زخم کا نشان تھا نہ کوئی اضافہ

نہ کمی...صرف دکھ اور تشویش کے آثار۔فکر مندی کی کیفیت جو کئی دن سے طاری تھی بس اُس کا ہلکا سا شائبہ موجود تھا پھر کیا ماجرا ہے۔جو آج کا دن مجھے سب گزرے دنوں سے مختلف معلوم ہو رہا ہے۔ایسا لگتا ہے جیسے آج جو کچھ ہے وہ مکمل نہیں ہے۔کہیں کچھ نہ کچھ رہ گیا ہے مگر کیا.....؟ یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔

''کیا سوچ رہے ہیں۔.؟'' بیوی نے سوال کیا

میں اُسے کیا بتاتا.....کیسے کہتا کہ ایک عجیب حماقت آمیز سی بات ذہن میں آ رہی ہے۔میں نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن خاموشی بے کلی کا جواب نہیں ہوتی.....میں دن بھر گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں الجھا رہا.....اس دوران پیٹ بھر کے تازہ کھانا بھی کھایا گھنٹہ سوا گھنٹہ سویا بھی۔ذرا دیر ریڈیو بھی سنا.....ٹی وی بھی دیکھا۔اپنے ایک دوست کو شہر کے حالات تفصیلاً اور تجزیاتی طور پر لکھے بھی.....بچوں کو ہوم ورک کرنے میں مدد بھی دی.....بیوی سے مختلف موضوعات پر باتیں بھی ہوئیں لیکن میرے اندر ہلکے ہلکے اضطراب کی لہریں بھی اُٹھتی رہیں۔

شام کی چائے پیتے وقت بیوی نے کہا۔'' آپ نے کچھ محسوس کیا۔؟''

اِس سوال پر میں چونک پڑا۔حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔وہ بھی میری طرح کچھ بے چین سی نظر آ رہی تھی۔میں سویرے سے جس خلجان میں مبتلا تھا، جو نامعلوم سی کمی محسوس کر رہا تھا، اُس کا کیا اظہار کرتا۔اِس لئے میں نے اُسی سے سوال کیا۔

''کس بارے میں پوچھ رہی ہو۔؟''

اُس نے چائے کی پیالی میز پر رکھی اور آہستہ سے کہا۔'' آج کا دن..کچھ عجیب سا نہیں لگ رہا ہے۔۔؟ مجھے تو بار بار یہ محسوس ہوتا ہے جیسے ابھی کوئی کام کرنا باقی رہ گیا ہے۔''

اُس کی بات سن کر میں نے سوچا کہ اب اپنی کیفیت چھپانا مناسب نہیں ہوگا.....ہم دونوں کی سوچ ایک ہی نقطے کے اطراف گھوم رہی ہے اس لئے کھل کر باتیں کر لینی چاہئیں یوں ممکن ہے ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکیں..شاید اُس کمی کی نشاندہی ہو سکے۔

''ہاں.....سویرے آنکھ کھلنے سے لے کر اب تک یہ احساس تو ہو رہا ہے جیسے ہمارے صبح و شام میں کوئی اور بھی شریک ہوتا تھا' اب نہیں ہے.....لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا ہے وہ کون تھا..کیا چیز تھی۔۔''

''کہیں ہم اُن لوگوں کے بارے میں تو نہیں سوچ رہے ہیں جو کل تک ہمارے شہر میں تھے۔فضا میں جن کی سانسیں گھلی ملی تھیں۔۔؟''

''نہیں۔وہ دکھ تو دل کے اندر بیٹھا ہے۔اسے پہچاننا مشکل نہیں ہے۔یہ کیفیت تو بالکل ہی علاحدہ ہے۔''

''آپ باہر گئے تھے.....وہاں کچھ لوگ ملے ہونگے۔اُن میں سے کسی نے اس قسم کی بات کی...؟''

''نہیں۔کسی سے کوئی بات نہیں ہوئی....''

پھر ہم دونوں نے کوئی بات نہیں کی.....وہ گھر کے کاموں میں الجھ گئی اور میں اپنے خیالوں میں۔میری سوچ کی لہریں کئی سمتوں میں پھیلتی اور سمٹتی رہیں۔....یہ خیال بھی آیا کہ بھول جانا انسانی فطرت کی ایک خوبی بھی ہے لیکن اگر حد سے بڑھ جائے تو ایک بیماری بھی ہے۔ہر لمحۂ موجود کی کوکھ سے تاریخ کے صفحات لئے واقعات جنم لیتے رہتے ہیں۔اور تاریخ یاد رکھنے کی چیز ہوتی ہے۔آج کو بھلا دینے والے گزرے ہوئے کل کی جانب دیکھتے ہیں اور نہ آنے والے کل پر اُن کی نظر ہوتی ہے۔یہ بیماری کی نشانی ہے۔بے حسی کی دلیل.....لیکن وہ نظریں جو آج کا پردہ اُٹھا کے ماضی و مستقبل کے ورق پڑھتی ہیں۔آج اور کل کے فرق کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہیں شاید وہی ہر عہد کا حاصل ہوتی ہیں۔مگر کہاں ہیں وہ نظریں.....خود کو صاحبِ بصیرت سمجھنے والے تو عیب جوئی میں.....کاسہ لیسی میں.....بھیک کا کشکول تھامے اقتدارِ زر کے لئے قطار میں کھڑے ہیں.....زہر ٹپکانے والے والے ہاتھ تو بہت ہیں اور اُن سے سبھی واقف بھی ہیں سوال یہ ہے کہ تریاق دینے والے ہاتھ کہاں ہیں.....؟ زخم تو لگتا ہی ہے.....ٹیس تو اُٹھتی ہی ہے معالج ماہر ہو تو زخم جلدی بھر جاتا ہے۔مگر ہم تو عطائیوں کے کے ہاتھ میں کھلونا بنے ہوئے ہیں۔قصور ہمارا بھی ہے.....مگر ہم کیا کر سکتے ہیں۔؟ ہم نے تو ایک بیماری کے کئی نام رکھ چھوڑے ہیں.....کیا کوئی ایسا نہیں ہے جو ہمارے زخموں کو ایک بار چھیل کر سارا مواد نکال دے اور پھر مرہم رکھے۔ورنہ یہ قطرہ قطرہ ٹپکنے والا زہر تو زخموں کو ناسور بنا دے گا.....ناتجربہ کار عطائی سارا الزام مرض اور مریض پر ڈال کے بری الذمہ ہو جائیں گے کہ ایسا ہو بھی چکا ہے......جانوروں کا ریوڑ بھی جب ہرا ہرا چارہ دیکھتا ہے تو منہ مارنے کیلئے لپکتا ہے مگر اِس ریوڑ میں سے کوئی ایک اپنا نوالہ چھوڑ کے گردن اُٹھا کے چاروں طرف دیکھتا ہے کہ کہیں کوئی خطرہ.....سب کے لئے کوئی تاک میں تو نہیں ہے.....ہے کوئی ہم میں ایسا جو، اپنا نوالہ چھوڑنے کی قربانی دینے کو تیار ہو۔....؟ آج میں جو کچھ سوچ رہا ہوں ممکن ہے کل نہ سوچوں.....اُڑتے ہوئے لمحے جذباتی کیفیت کو بھی لے اُڑتے ہیں.....انسان کو صبر آ ہی جاتا ہے.....غموں پر.....دکھوں پر وقت کی راکھ جمتی چلی جاتی ہے.....آج ایک انجانے اضطراب کا جال میرے اطراف پھیلا ہوا ہے۔کل تک اِس جال کے حلقے ڈھیلے پڑ جائیں گے۔خدا کرے، کل پھر کوئی اِس پھندے کے خانوں کو کس نہ دے۔رات گئے تک میں رہ رہ کر ایسے ہی الجھاوؤں میں مبتلا رہا۔

دوسرے دن بچوں کو اسکول تک چھوڑنے کے لئے جب گھر سے نکلا تو پھر کل والے احساس نے چٹکی سی لی.....میں نے مڑ کے اپنے گھر پہ ایک نظر ڈالی۔صحن میں کھڑا ہوا اُونچا درخت اپنی گھنی شاخوں پر سورج کی ہلکی ہلکی کرنوں کو جھولا جھلا رہا تھا۔سارا منظر دیکھا بھالا تھا۔کس چیز کی کمی ہے۔؟ اسی بات پر غور کرتا ہوا میں آگے بڑھ گیا بچوں کو اسکول پہنچا کے اپنے کام پر چلا گیا۔وہاں دفتری ساتھی اپنے اپنے انداز میں حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے رہے۔میں اُن کی باتوں میں شریک رہا اور بھول گیا کہ کل سے آج تک کیسے کیسے خیالوں میں بھٹکا رہا تھا۔

جب گھر پہنچا تو سورج اپنی دن بھر کی کمائی سمیٹ رہا تھا۔دروازے پر دستک دیتے ہی یہ احساس پھر میرے

اندر پھیلنے لگا کہ شہر پہ ٹوٹنے والے ظلم کے علاوہ بھی کچھ اور ہوا ہے اور جو کچھ اُس ظلم کے علاوہ ہوا ہے....کیا اُس کا تعلق میری ذات سے ہے۔؟نہیں....میرے گھر سے ہے۔؟ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا...لیکن کچھ ایسا ضرور ہے جو میرے ساتھ ساتھ میری بیوی کو بھی میرا شریکِ احساس بنا گیا ہے....اِس خیال نے مجھے کل سے زیادہ بے چینی میں مبتلا کر دیا...پھر مجھے بے کلی سی کیوں ہے....یہ نامعلوم سا کرب....درد کی ایک بے وزن لہر....گھر کے دروازے پر پہنچتے ہی ایک بوجھ کا احساس....بیوی نے دروازہ کھولا تو اُس کے چہرے پر بھی کل جیسی الجھن کے آثار دکھائی دیئے....گھر میں قدم رکھتے ہی اُس نے پوچھا۔''شہر کی حالت کیا ہے۔''

جواب دینے سے پہلے میں صحن میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور مٹی میں بچوں کو کھیلتے دیکھ کر کہا۔

''شہر...گھائل شیر کی طرح اپنے زخم چاٹ رہا ہے۔''

میرے جواب سے اُس کی تشفی ہوئی یا نہیں۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اُس نے پوچھا۔

''چائے یہیں پیئں گے یا اندر۔۔۔''

''یہیں لے آؤ۔۔''

چائے کی پیالی دیتے ہوئے اُس نے دھیمے لہجے میں کہا۔''مجھے تو آج بھی سارا دن ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے میرے بدن میں کہیں درد ہے....کہاں ہے....کتنا ہے...یہی پتا نہیں چل رہا....بچوں کو لینے اسکول بھی گئی تھی۔ وہاں بھی سب ٹھیک ہی تھا۔۔''میں جانتا تھا وہ بھی اِس بے نام کیفیت کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہے جس کو میں کل سے کوئی نام دینے کی فکر میں ہوں۔ ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھے چائے کے گرم گرم گھونٹ بھرتے رہے۔ پھر اُس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے پلٹ کر بچوں کو مخاطب کیا۔

''چلو بھئی اٹھو....بہت کھیل ہو چکا...دونوں وقت مل رہے ہیں....آ جاؤ شاباش...''اچانک وہ اس طرح خاموش ہو گئی جیسے بجتا ہوا ریڈیو بجلی چلے جانے سے ایک دم بند ہو جاتا ہے۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کا چہرہ اتر گیا تھا اور وہ دہشت بھری نگاہیں اٹھا کے درخت کو تک رہی تھی۔ غیر ارادی طور پر میں نے بھی درخت کی طرف دیکھا....ہوا میں جھولتی شاخیں جیسے بڑھتے اندھیرے کا ہاتھ جھٹک رہی تھیں۔

''دیکھا آپ نے۔۔۔؟''اُس نے سحر زدہ لہجے میں کہا

''کیا...؟''میں نے پھر نظریں اُٹھائیں۔ جب مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا تو میں نے اُس کی طرف دیکھا....اُس کے سُتے ہوئے چہرے پر خزاں دیدہ پتّے کی زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ وہ بڑے نڈھال لہجہ میں بولی۔

''آج....آج پیڑ پہ چڑیاں نہیں ہیں....''

یہ سن کر میں چونک اٹھا....یہی کمی تو کل سے محسوس ہو رہی تھی۔

اقبال حسن آزاد (مونگیر)

کاٹنے والے جوڑنے والے

یہ قصہ سن انیس سو چھیالیس کا ہے۔

جمن میاں کی بیچ بازار میں ایک چلتی پھرتی ٹیلرنگ شاپ تھی۔ ان کی دکان پر کئی کاریگر کام کرتے تھے۔ خود جمن میاں گردن میں فیتہ لٹکائے رہتے۔ شوکت میاں کا کام کپڑوں کو کاٹنا تھا۔ رحمت میاں آنکھوں پر موٹا چشمہ لگائے سوئی دھاگے سے دستکاری میں مشغول رہتے۔ شکور میاں مشین چلاتے تھے اور مشین کی موسیقی ریز آواز کے ساتھ ساتھ ان کا سر بھی ہلتا رہتا تھا۔ وہ ثریا کے عاشقوں میں تھے اور اس کے گائے ہوئے گیت گنگناتے رہتے۔ جمن میاں کے صاحبزادے اسلم میاں دیکھتے کہ شوکت میاں چٹائی پر بیٹھے بیٹھے بڑی سرعت سے قینچی چلاتے اور پھر قینچی کو پیروں تلے داب کر کٹے ہوئے کپڑوں کو موڑتے اور جب سوئی دھاگے سے ٹانکے لگاتے لگاتے رحمت میاں کی انگلیاں درد کرنے لگتیں تو سوئی کو اپنی ٹوپی میں اُڑس کر اُنگلیاں چٹخاتے۔ اس وقت اسلم میاں کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ شوکت میاں قینچی کو پیروں کے نیچے کیوں رکھتے ہیں اور رحمت میاں سوئی کو سر کے اوپر کیوں؟ ایک روز انہوں نے اپنے والد صاحب سے یہ سوال کیا تو انہوں نہایت سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

''وہ اس لئے کہ کاٹنے والے کی جگہ پیر کے نیچے ہوتی ہے اور جوڑنے والے کی سر کے اوپر۔''

اسلم میاں کو بچپن سے پڑھنے لکھنے سے لگاؤ تھا۔ پڑوس کے لالہ شمبھو ناتھ کا بیٹا پردیپ روز صبح بستہ اُٹھائے مدرسے کی جانب جاتا دکھائی دیتا۔ شمبھو ناتھ اسلم میاں کے والد جمن میاں کے بچپن کے دوست تھے۔ اسلم میاں نے بھی اماں سے کہہ سن کر اپنا نام بھی مدرسے میں لکھوا لیا۔ اب وہ اور پردیپ گلے میں بانہیں ڈالے مدرسے جاتے اور اسی طرح واپس آتے۔

وقت کسی سبک رو دریا کی طرح بہتا رہا اور اس طرح کئی سال گزر گئے۔ اب اسلم میاں بیس برس کے نوجوان تھے اور مقامی کالج میں ایف۔اے کے طالب علم تھے۔ دیپک ابھی بھی ان کا کلاس فیلو تھا۔ بھارت چھوڑو تحریک اپنے تکمیلی مرحلے میں تھی اور ہندوستان کا بٹوارا ہونا طے پا چکا تھا۔ پرجوش نعرے سن سن کر نوجوان اسلم میاں کے جوان خون کی روانی بھی تیز ہو گئی۔ مسلمانوں میں خاندان کے خاندان ترک وطن کر رہے تھے۔ کئی مسلم لیگی آزادی سے قبل ہی کراچی منتقل ہو گئے تھے کیونکہ وہ قائداعظم کو پاکستانی فوجوں کی سلامی لیتے ہوئے دیکھنا

چاہتے تھے۔اسلم میاں نے بھی اپنے والد سے کہنا شروع کیا۔

''ابا میاں! ہمارے سب دینی بھائی جا رہے ہیں۔کیوں نہ ہم لوگ بھی.....''جمن میاں بھڑک اُٹھے۔

''کہاں کا دین اور کیسے بھائی۔یہ سب سگ زمانہ ہیں۔اپنی جان بچانے اور ایک بہتر مستقبل کی تلاش میں یہ اپنا ملک چھوڑے جا رہے ہیں۔''

''لیکن ابا میاں! ہجرت تو سنت ہے۔''

''ہاں وہ ہجرت جو دین و ایمان کی سرفرازی کے لئے کی جائے۔اپنی نفسانی خواہشوں سے مجبور ہو کر نہیں اور یاد رکھو! ترک وطن کرنے والوں کو وطن کی مٹی بددعا دیتی ہے۔''

اسلم میاں اماں کو ٹٹولتے۔مگر وہ تو اپنے شوہر کا سایہ تھیں۔کہنے لگیں۔

''کیا تم اپنا شہر چھوڑ سکتے ہو، اپنا ملک چھوڑ سکتے ہو۔اپنے بچپن کے دوستوں کو چھوڑ سکتے ہو۔ہمیں چھوڑ سکتے ہو؟ اگر ہاں! تو پھر جہاں جی چاہے جا سکتے ہو۔''۔۔۔۔۔۔۔اسلم میاں خاموش رہ گئے۔

ملی جلی آبادی والا یہ علاقہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور گنگا جمنی تہذیب کی جیتی جاگتی مثال تھا اس لئے جمن میاں کے دل میں کبھی بھی ترک وطن کی خواہش پیدا نہیں ہوئی۔مگر جیسے جیسے آزادی کی صبح قریب آتی جا رہی تھی ویسے ویسے فرقہ وارانہ فسادات کی سیاہی پھیلتی جاتی تھی۔پنجاب کے شہروں سے لے کر بمبئی اور نواکھالی کے ساتھ ساتھ جب جموئی اور بہار شریف آ گئے تو جمن میاں کے پائے استقامت میں بھی لغزش آ گئی۔انہیں لگا کہ ان کا بیٹا سچ ہی کہتا ہے۔اس ملک میں مسلمان محفوظ نہیں رہے۔ایک روز انہوں نے دکان کھولی تو معلوم ہوا کہ شوکت میاں مع اہل و عیال جلد ظہور پذیر ہونے والی مملکت خداداد کو کوچ کر گئے۔بقیہ کاریگر بھی پر تول رہے تھے۔صرف رحمت میاں کا اب بھی یہ خیال تھا کہ وطن کی محبت جزو ایمان ہے۔

کئی روز سے شہر کی فضا اکھڑی ہوئی تھی۔اکا دکا ناخوشگوار واقعات رونما ہونے لگے۔ایک مسلمان رکشے والے کو ہندوؤں کے محلے میں پیٹ دیا گیا جبکہ ایک ہندو حلوائی کی دکان پر کچھ شرپسندوں نے ہنگامہ آرائی کی۔گورے افسروں کی ٹکڑیاں شہر میں گشت کرنے لگیں۔مگر جس جس علاقے میں گورے پہنچتے وہاں ماحول کشیدہ ہو جاتا۔جمن میاں نے چپکے چپکے روانگی کی تیاری شروع کر دی۔وہ لوگ اب تک نکل گئے ہوتے لیکن دکان کا کوئی مناسب انتظام نہیں ہو پا رہا تھا۔حالانکہ اس کا سیدھا اثر سکینہ کی زندگی پر پڑتا کیونکہ اس کی نسبت اس کے خالہ زاد بھائی سے طے ہو چکی تھی اور جہیز کا سارا سامان بھی مہیا کیا جا چکا تھا۔مگر اس کے ہونے والے سسر نے کہیں جانے کے خیال کو یکسر مسترد کر دیا تھا۔

''خیر! جو ہوگا دیکھا جائے گا۔اگر خدا نے چاہا تو وہاں اس کے لئے اور بہتر رشتہ مل جائے گا۔''جمن میاں نے اپنی بیگم کو ڈھارس بندھائی۔

وہ لوگ اب تک نکل گئے ہوتے لیکن جمن میاں کے لئے بڑی مشکل یہ تھی کہ دکان اور مکان کا کوئی

معتبر اور مستقل انتظام نہیں ہو پا رہا تھا۔ان کی گلی میں ان کے مکان کو چھوڑ کر صرف ایک گھر اور مسلمان کا تھا۔ان کے گھر کے بالکل سامنے نواب سید حشمت الدولہ کی عظیم الشان حویلی تھی جس کا بلند و بالا دروازہ عموماً بند رہتا تھا۔حویلی میں نواب صاحب اپنے چند خادموں کے ساتھ سکونت پذیر تھے۔کوئی اولاد ان کے پاس نہ تھی۔جمعہ کے روز یا عیدین کی نماز ادا کرنے نواب صاحب دو گھوڑوں کی بگھی پر سوار ململ کا کرتہ اور تنگ مہری کا پاجامہ زیب تن کئے جامع مسجد جاتے۔سر پر دو پلی ٹوپی اور پیروں میں سلیم شاہی جوتی ہوتی۔سردیوں میں گرم شیروانی کا اضافہ ہو جاتا۔محلے والوں سے ان کا کوئی ربط ضبط نہ تھا۔البتہ ان کے دولت کدے پر شہر کے رؤسا اور انگریز افسران کی آمد و رفت رہا کرتی۔فٹن اور موٹر گاڑیاں ان کے دروازے کی رونق میں اضافہ کرتیں۔نواب صاحب کے کپڑے جمن میاں ہی کی دکان میں سلتے۔جب حویلی سے بلاوا آتا تو وہ فیتہ لے کر حاضر ہو جاتے۔نواب صاحب مشین کی سلائی پسند نہیں فرماتے تھے، ہمیشہ ہاتھ کا سیا کپڑا پہنتے تھے گو اس کی مزدوری مشین کے مقابلے میں دوگنی تھی۔

ایک دن صبح صبح شمبھو ناتھ نے جمن میاں کا دروازہ کھٹکھٹایا۔''جمن میاں!''انہوں نے سرگوشی کی۔

''سنا ہے آج حملہ ہونے والا ہے۔باہر سے دنگائی بلائے گئے ہیں۔کل رات کئی ٹکڑیاں پہنچی ہیں اور وہ سبھی شہر کے بڑے لوگوں کے مہمان بنے ہوئے ہیں۔بہتر ہوگا کہ آپ لوگ کسی محفوظ مقام پر چلے جائیں۔ہم لوگ تو آپ کے ساتھ ہیں مگر ان پاگل فسادیوں کے آگے بھلا کس کا بس چلے گا۔''

جمن میاں کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔خوامخواہ مکان دکان کے چکر میں رکے رہے۔جان بچے تو سب کچھ ہے۔انہیں اپنے حلق میں کانٹے چبھتے ہوئے محسوس ہوئے۔ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ نواب صاحب کا ایک ملازم تیز تیز قدموں سے آتا دکھائی دیا۔اسے دیکھ کر شمبھو ناتھ اپنے گھر کے اندر چلے گئے۔ملازم نے قریب آ کر کہا۔

''جمن میاں! آپ کو نواب صاحب بلا رہے ہیں۔''جمن میاں نے بیٹے کو آواز دی کہ وہ آ کر دروازہ اندر سے بند کر لے اور خود نواب صاحب کے ملازم کے ساتھ ہو لئے۔نواب صاحب آرام کرسی پر، دونوں ہاتھوں کو گود میں رکھے نیم دراز تھے۔انہوں نے وقت برباد کئے بغیر کہنا شروع کیا۔

''جمن میاں! آپ کو تو خبر لگ ہی چکی ہوگی۔حالات خراب ہو گئے ہیں۔''

''جی حضور!''جمن میاں نے سر جھکا کر جواب دیا۔نواب صاحب نے کہا۔

''میرے خیال میں محلے کے سارے مسلمان یہاں آ جائیں۔عورتیں اور بچے زنان خانے اور مرد لوگ اوپری منزل پر۔اللہ ہماری حفاظت کرے گا۔آپ سب کو خبر کر دیں۔''

جمن میاں الٹے قدموں لوٹے۔اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اہل ایمان نواب صاحب کی حویلی میں جمع ہو گئے۔جمن میاں کی بیوی نے زیور اور نقدی تو اپنے پاس رکھ لی اور سکینہ کے جہیز کی حفاظت اوپر والے پر سونپ دی۔جمن میاں نے دروازے میں تالا لگایا اور پھر اپنے گھر کو یوں دیکھا جیسے آخری بار دیکھ رہے ہوں۔انہیں خیال

آیا کہ کنجی لالہ کو سونپ دیں مگر دل نہ مانا۔

سارا دن بے چینی کے عالم میں گزرا۔نواب صاحب نے سبھوں کے کھانے پینے کا نظم کر رکھا تھا۔ شیر خوار بچوں کے لئے دودھ بھی مہیا تھا۔اس قدر بھیڑ بھاڑ کے باوجود چہار جانب خاموشی چھائی ہوئی تھی۔اگر کبھی کسی چھوٹے بچے کے رونے کی آواز اٹھتی تو اسے فوراً ہی چپ کرانے کی کوشش کی جاتی۔

دن تو جیسے تیسے گزر گیا مگر رات اپنے ساتھ بھیانک اندیشے لے کر آئی۔پوری حویلی کو اندھیرے کے حوالے کر دیا گیا تھا۔یوں رات بھی بالکل تاریک تھی۔ایسا لگتا تھا جیسے روشنی کا وجود ختم ہو چکا ہے۔ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔اندر، باہر، اوپر، نیچے، دل و دماغ میں.....بس اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔سبھی لوگ حویلی کی چھت پر دم سادھے پڑے تھے۔کبھی کبھی کوئی شخص جذبۂ تجسس سے مجبور ہو کر منڈیر سے جھانکنے کی کوشش کرتا تو فوراً کوئی دوسرا شخص اس کا دامن کھینچتا اور پھر سرگوشیاں گشت کرنے لگتیں۔محلے کے ایک بزرگ نے دھیمی آواز میں نواب صاحب سے کہا۔"حضور! اگر آپ اپنی بندوق بھی....."نواب صاحب نے خشمگیں نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا اور وہ بزرگ خاموش رہ گئے۔

اچانک سامنے گلی سے کچھ آوازیں اُبھریں، دبی دبی سی، اور ہلکی سی روشنی بھی آئی۔جمن میاں سے نہ رہا گیا۔انہوں نے جھانک کر دیکھا اور جی دھک سے ہو کر رہ گیا۔ان کے گھر کے سامنے کچھ سائے حرکت کرتے دکھائی دیئے۔پھر کچھ ایسی آوازیں آئیں جیسے ہتھوڑے سے ان کے گھر کا تالا توڑا جا رہا ہو۔جمن میاں دم بخود رہ گئے۔کسی نے ان کا دامن کھینچا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔پھر دامن کھینچنے والے نے بھی جھانک کر دیکھا.....اور دیکھتا رہ گیا۔اس کے بعد کئی گردنیں منڈیر پر ٹک گئیں۔۔ادھر تالا ٹوٹ چکا تھا اور وہ سائے اندر داخل ہو چکے تھے۔پھر تھوڑی دیر بعد ان سبھوں نے حیرت بھری نگاہوں سے دیکھا کہ جمن میاں کے گھر کا سارا سامان لوٹا جا رہا ہے۔جمن میاں کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔وہ بے بسی کے ساتھ یہ سارا تماشا دیکھتے رہے۔

کالی اندھیری رات کسی بے کس بیمار کی طرح جاگ رہی تھی۔جب بارہ کا گجر بجا تو دور سے بہت تیز روشنی آتی دکھائی دی اور ساتھ ہی ساتھ ہر ہر مہادیو کی دل دہلانے والی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔چھت پر موجود سبھی لوگوں کے دل بیٹھ گئے اور وہ چھت پر سینے کے بل لیٹ کر دعائیں پڑھنے لگے۔روشنی قریب آتی گئی، آوازیں بلند ہوتی گئیں مگر کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ نیچے جھانک کر دیکھے کہ کیا ہو رہا ہے۔گلی میں شعلوں کی لپٹ دکھائی دی تو سبھوں کی سمجھ میں آیا کہ گھروں میں آگ لگائی جا رہی ہے۔ستر برس کے نواب صاحب جوان سبھوں کے درمیان موجود تھے، اچانک اُٹھ کھڑے ہوئے اور تیزی سے سیڑھیاں اُتر گئے۔تھوڑی دیر بعد جب وہ لوٹے تو ان کے ہاتھ میں بھری ہوئی بندوق تھی۔انہوں نے سیدھے کھڑے ہو کر زور سے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور بھیڑ کی جانب شست باندھ کر فائر کر دیا۔فسادی جن کے ہاتھوں میں بھالے، گڑاسے اور ترشول تھے، گولی کی آواز سن کر

گھبرا گئے اور ان کے درمیان بھگدڑ مچ گئی۔نواب صاحب نے پے در پے کئی گولیاں داغ دیں۔فسادیوں کے درمیان چیخیں اُبھریں اور ان کے پیر اُکھڑ گئے۔یہ دیکھ کر چھت پر موجود لوگوں کی ہمت بندھی اور وہ بھی زور زور سے نعرۂ تکبیر بلند کرنے لگے۔

دیکھتے ہی دیکھتے پوری گلی خالی ہو گئی۔اس کے بعد پولس کی گاڑیاں دندنانے لگیں۔رات اسی طرح گزر گئی۔

دوسرے روز سرکاری لاریاں آئیں اور سبھی لوگ عارضی کیمپ میں منتقل ہو گئے۔ایک رات فسادیوں نے کیمپ پر بھی حملہ کیا مگر کامیاب نہ ہو سکے۔امید و بیم کے ساتھ جھولتے ہوئے، موت و حیات کی کشمکش میں ایک ہفتہ گزر گیا۔شہر میں دھیرے دھیرے امن و امان قائم ہونے لگا۔فساد کا چڑھا ہوا بخار اُترنے لگا۔لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے لگے۔جمن میاں کے لبوں پر جیسے تالا لگ گیا تھا۔جب ان کی بیوی ان سے گھر چلنے کو کہتیں تو وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے۔"گھر! کون سا گھر؟ وہ گھر جسے ہماری آنکھوں کے سامنے لوٹ لیا گیا اور بلوائیوں نے جس میں آگ لگا دی۔اب تو ہمیں ایک نئی جگہ نیا گھر بنانا ہے۔"

"پھر بھی۔جانے سے پہلے ایک نظر اپنے گھر کو دیکھ لیتی۔" بیوی کے التجا آمیز لہجے نے جمن میاں کو پگھلا دیا۔

"ٹھیک ہے۔تم کہتی ہو تو چلے چلتے ہیں۔مگر اب وہاں جا کر کرنا کیا ہے۔ہو سکتا اس پر اب کسی اور کا قبضہ ہو۔"

دن اچھی طرح نکل آیا تو جمن میاں بیوی بچوں کے ساتھ اپنے محلے میں داخل ہوئے۔انہوں نے دیکھا کہ دیواریں جلنے کے باعث سیاہ ہو چکی تھیں۔صدر دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔مگر یہ وہ تالا نہ تھا جو وہ لگا کر گئے تھے۔انہیں یاد آیا۔اسے تو.....وہ زیادہ دیر تک وہاں نہیں رک سکے اور جانے کے لئے مڑے۔اچانک ان کے کانوں میں ایک جانی پہچانی آواز آئی۔"جمن میاں! آپ لوگ آ گئے۔شکر ہے بھگوان کا۔" شمبھو ناتھ دونوں ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ان کے جی میں آیا کہ اس ولد الحرام کو کھڑے کھڑے گولی مار دیں مگر خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے۔اتنے میں پردیپ ہاتھوں میں کنجی لئے آتا دکھائی دیا۔

"جمن میاں! آپ کے گھر کا تالا تو ٹوٹ گیا۔میں نے اپنا تالا لگا دیا تھا۔لیجیے اپنا گھر سنبھالیے۔"

جمن میاں کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے کنجی سنبھالی، گھر کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئے۔

ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔گھر کا سارا سامان بالکل اسی طرح رکھا ہوا تھا جیسا وہ چھوڑ کر گئے تھے۔

انہوں نے حیرت زدہ نگاہوں سے شمبھو ناتھ کی طرف دیکھا۔وہ شرمندہ سا کھڑا تھا۔

"جمن میاں! ہم لوگوں نے تمہارا سامان تو بچا لیا مگر تمہارے گھر کو جلنے سے نہ بچا سکے۔معاف کر دینا۔" جمن میاں کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں اور وہ بے اختیار ہو کر شمبھو ناتھ سے لپٹ گئے۔

☆☆☆

جیتندر بلّو (برطانیہ)

شب کے ساتھی

دن سرد تھے۔ ویک اینڈ کا آغاز تھا اور میں مرکزی لندن کی ایک پب (PUB) میں بیٹھا ہفتے بھر کی تھکن ہی دور نہیں کر رہا تھا بلکہ ''وقت'' کو بھی قتل کرنے کی کوشش میں تھا جس نے میرے ساتھ کئی انوکھے کھیل کھیلے تھے اور چاہتے ہوئے بھی میرا ساتھ کبھی نہ دیا تھا۔ مجھے زندگی کے ہر موڑ، ہر قدم پر اتنا پریشان کیا تھا کہ میرے پورے سنسار میں اس کا واحد دشمن تھا اور ہوں۔ میرے سینے میں اس کے لیے اس قدر نفرت بھری ہوئی تھی کہ اگر وہ نور کو کسی پیکر میں سمو کر میرے روبرو آجاتا تو میں دنیا بھر کا بارود اس پر لٹا کر تالیاں پیٹتا اور بہ آوازِ بلند کہتا کہ تمہارے نظام میں توازن نہ ہونے کے کارن تمہارا یہ انجام ہوا ہے لیکن ''وقت'' لارڈ کرشنا کی طرح ہر سو پھیلا ہوا مجھ سے کہہ رہا تھا کہ تم، تمہاری آنے والی نسلیں اور تمہارے آباؤ اجداد یکجا ہو کر بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ تم میرے نزدیک ایک بے معنی سا ذرہ ہو، جس کی کوئی وقعت، کوئی اوقات نہیں ہوتی اور وہ تا حیات گرد میں رُلتا رہتا ہے۔ مایوس ہو کر میں نے گہرا سانس بھرا اور بیئر کا مگ اٹھا کر ارد گرد نگاہ دوڑائی، ماحول گرم ہو چکا تھا۔ ہر شخص کسی نہ کسی کے ساتھ دکھائی دے رہا تھا۔ کوئی اپنی بیوی کے ساتھ سر جوڑے بیٹھا تھا تو کوئی اپنی گرل فرینڈ کی کمر میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھے، کوئی یار دوستوں کی موجودگی میں بے فکری سے قہقہے لگا رہا تھا۔ لیکن میں واحد شخص تھا جو سارے پب میں تن تنہا تھا، بالکل اس شخص کی طرح جس کے چاہنے والے تو بے شمار ہوں مگر پھر بھی بھری دنیا میں وہ تنہا ہو۔ معاً دوست احباب کا دائرہ گلاس کی سطح پر پھیل گیا۔ ان میں بعض تو ایسے تھے جو میرے بچپن کے سنگی ساتھی تھے اور بعض نے جوانی کی رنگینیاں میرے ساتھ دیکھی تھیں مگر ان سبھوں نے دیارِ غیر میں آباد ہو کر دولت کو اتنی تیزی سے سمیٹا تھا کہ ان کی کایا ہی پلٹ کر رہ گئی تھی۔ وہ اس دوڑ میں دیوانہ وار بھاگ رہے تھے جب کہ میری ٹانگیں اس دوڑ کے قابل نہ تھیں۔ میں تو ایک ریستوراں میں ادنیٰ سا ویٹر تھا۔ دوستوں کے قریب رہ کر میں نے یہی محسوس کیا کہ ان کی جون ہی بدل چکی ہے۔ وہ، وہ نہیں رہے جو کبھی ہوا کرتے تھے۔ ان کی ہر ادا سے پیسے کی بو آیا کرتی۔ ان کی ہر بات، ہر خیال مایا جال میں الجھ کر رہ جاتا۔ وہ ضرورت پڑنے پر ہی مجھ سے ملنا پسند کرتے، ورنہ میں ان کے سامنے کھڑے کھڑے دم توڑ دیتا، انہیں ذرا بھی ملال نہ ہوتا۔ میں اکثر سوچا کرتا کہ یہ تبدیلی ان میں کیونکر در آئی ہے؟ مادہ پرستی

اور نو دولتیئے بننے کے کارن یا کلاس بدل جانے پر مغربی اقدار اور طرزِ زندگی اپنانے پر، لیکن مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا کرتا۔ ایک روز میں نے جلالی کیفیت کے تحت عالمِ تصور میں تمام دوستوں کو موت کے گھاٹ اتار ڈالا اور خود سے وعدہ کیا کہ ان کی صوت دور سے دیکھنا بھی پسند نہیں کروں گا۔ وہ سب کے سب خود غرض، مطلب پرست اور موقع شناس ثابت ہوئے تھے لیکن ''وقت'' تو میری گھات میں لگا بیٹھا تھا۔ وہ تنہائی کا چولا پہن کر میرے تن من سے ہوتا ہوا میرے اندرون تک اتر گیا۔ میری حالت اس پرندے کی طرح ہوتی چلی گئی جو اپنی ڈار سے بچھڑ کر خلاؤں میں بھٹکتا پھرتا ہو۔ میں نوے (90) لاکھ باسیوں کے شہر میں بالکل اکیلا ہو گیا تھا۔

پب کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ کاؤنٹر تک پہونچنا مشکل ہو رہا تھا۔ لوگ باگ ایک کونے سے دوسرے کونے تک پینے پلانے اور باتوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ لال، پیلے، ہرے لباس بڑھ چڑھ کر اپنی اہمیت کا احساس دلا رہے تھے۔ کچھ جوان پنچھی اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے لمبی اڑان کے واسطے پر تول رہے تھے مگر وہ بھی اکیلے نہیں تھے۔ ہر کوئی اپنے شب کے ساتھی کے ساتھ تھا۔ انہیں دیکھ کر یہی خیال آتا کہ آدمی اگر یورپ میں ہو، جوان ہو اور اس کے پاس پنچھی بھی ہو تو یورپ ہر لحاظ سے اس کے واسطے جنت ہے۔ ورنہ یہی جنت اس کے لیے جہنم ثابت ہوتا ہے۔ حالانکہ دونوں لفظ 'ج' سے شروع ہوتے ہیں لیکن دونوں کے درمیاں فاصلہ اتنا زیادہ ہے کہ آدمی کا وجود گرد بن کر رہ جاتا ہے۔ سگریٹ سلگا کر میں نے کش لیا ہی تھا کہ لگا کوئی میری دائیں طرف کچھ فاصلے پر بیٹھا مجھے گھور رہا ہے۔ واقعی ایک سفید فام عورت ٹکٹکی باندھے مجھے تک رہی تھی۔ نظریں ٹکراتے ہی اس کے لبوں کے کونے پھیل گئے اور وہ اپنی عمر سے بڑی دکھائی دینے لگی۔ وہ اٹھائیس تیس کے لگ بھگ تھی۔ بے ترتیب گھنے بال اس کی گردن اور کانوں کے گرد پھیلے ہوئے تھے۔ دودھیا رنگ کے چہرے پر بڑی بڑی آنکھیں اور ہلکی سی اٹھی ہوئی ناک جس نے اس کی صورت میں کمی پیدا کر دی تھی لیکن بدقسمتی سے وہ بھی اکیلی نہیں تھی۔ اس کی نشست کے ایک طرف تین جوان لڑکے یورپین یونین (E.U) کے متعلق بات چیت کر رہے تھے کہ آیا ملک ترکی کو اس میں شامل ہونے کی اجازت دی جائے یا نہیں؟ وہ خود میں اتنے کھوئے ہوئے تھے کہ کوئی بھی اس عورت کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ وہ بھی ان سے بے نیاز مگر سگریٹ کا دھواں اِدھر اُدھر بکھیر رہی تھی لیکن جانے کیوں میرے اندر کسی نے سرگوشی کی کہ وہ بھی میری طرح اکیلی ہے اور اسے بھی میری طرح کسی کی تلاش ہے۔ میں نے گلاس اٹھا کر اسے اشارتاً CHEERS کیا لیکن اس نے فوراً ہی منہ پھیر کر پب کا داخلی دروازہ دیکھنا شروع کر دیا۔ مجھے سخت شرمندگی ہوئی کہ میں نے ناحق کسی اجنبی کو WISH کیا ہے لیکن چند پل بھی نہ بیتے تھے کہ اس عورت نے اپنا گلاس اٹھا کر ہوا میں لہرایا اور میری CHEERS کو قبول کر لیا۔ پھر مجھے اپنی جگہ سے اٹھتا ہوا دیکھ کر وہ ایک طرف کو سرک گئی۔ اس کے قریب ہی بیٹھے ہوئے عمر رسیدہ آئرش نے جب مجھے اس عورت کے قریب کھڑے پایا تو وہ بھی اپنی جگہ سے قدرے سرک گیا۔ میز پر گلاس رکھ کر میں دونوں کے درمیان پھنس کر بیٹھ گیا اور پشت دیوار سے لگا لی۔ پھر آئرش کا شکریہ ادا کر کے عورت کی طرف

زیرِلب متوجہ ہوا۔ ”کیا تم اکیلی ہو؟“

”فی الحال تو اکیلی ہوں اور تم؟“

”میں بھی اکیلا ہوں۔“

اس مرتبہ اس کے ہونٹ ہی نہیں دانت بھی پھیل گئے تھے جو بیشتر انگریزی عورتوں کی طرح زیادہ اچھے نہ تھے مگر وہ مجھے ذرا بھی بھدے نہ لگے کہ پی پلا کر میں ان ہی سے کچھ چرانے کی کوشش میں رہا کرتا تھا۔ میں نے اسے سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہا: ”کیا تم کسی کا انتظار کر رہی تھیں؟“

”میں کبھی کسی کا انتظار نہیں کرتی۔“

اس کی بے باکی نے مجھے پر گہرا اثر کیا۔ سنجیدگی سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے وہاں مجھے ایک جزیرہ دکھائی دیا جہاں ایک انوکھی دنیا آباد تھی۔ جس کی وہ خود ہی حاکم تھی اور خود ہی محکوم۔

”مگر کبھی نہ کبھی تو انتظار کرنا ہی پڑتا ہے؟“

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“

میں نے پہلو بدل کر دونوں کے درمیان مزید جگہ بنائی اور بولا:

”فرض کرو تم نے کسی سے ملنے کا وعدہ کر رکھا ہے اور تم مقررہ وقت سے پانچ دس منٹ پہلے وہاں پہنچ جاتی ہو۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں تم انتظار کرو گی؟“

”میں ایسا موقع کبھی آنے نہیں دیتی۔ میں ہمیشہ پانچ دس منٹ دیر سے پہنچتی ہوں۔ ملنے والا وہاں موجود ہو تو ٹھیک، ورنہ سیدھی آگے بڑھ جاتی ہوں۔“

خیال آیا کہ یہ تجربہ یہ سوچ حاکم کی تھی یا محکوم کی؟ مگر اتنا ضرور واضح ہو گیا تھا کہ حاکم سخت جان ہے اور محکوم بے بس۔ ایک بڑا گھونٹ پی کر میں اس سے مخاطب ہوا:

”مگر تم لوگ تو وقت کے بڑے پابند ہو۔۔۔ وقت پر نہ پہنچنا یا دیر سے پہنچنے کو بہت بُرا سمجھتے ہو؟“

”ہاں یہ ہمارا کلچر ہے۔۔۔ لیکن میں ہر چیز کو اپنے ڈھنگ سے دیکھتی ہوں۔“ میں نے اپنے ردِعمل سے اسے جتایا کہ اس کی بات مجھ تک پہنچنے کی بجائے اسی تک رہ گئی ہے۔ مگر وہ دانا عورت تھی۔ اسے میری ذہنی کیفیت کا اندازہ جلد ہی ہو گیا تھا۔ بولی: ”میرے نزدیک انتظار کا مطلب کچھ اور ہے؟“

”بُرا مت مانو تو وہ بھی بتا دو، کیا ہے؟“

وہ میرے رویئے سے مطمئن نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاید وہ اس خیال میں تھی کہ جس ذہنی سطح پر وہ جی رہی ہے وہاں تک میری رسائی ہے یا نہیں؟ ہچکچا کر بولی: ”جب کوئی شخص کسی کا انتظار کرتا ہے تو وہ دراصل اپنے پاؤں کاٹ رہا ہوتا ہے۔ وہ کہتے کہتے اچانک رُک گئی تھی۔ پھر دور دیکھ کر تلخی سے کہا: ”میں نے ایک بار کسی کا انتظار کیا تھا

لیکن اتنی بری طرح سے زخمی ہوئی تھی کہ بیان کرنا مشکل ہے۔“

”بیان کرنے سے فائدہ بھی کیا۔۔ کوئی کسی کے دکھ درد میں شریک تو ہو نہیں سکتا۔ صرف ہمدردی جتا سکتا ہے۔“

ردِعمل گہرا تھا۔ اسے یقین سا ہو چلا تھا کہ ادراک کی جس سطح پر وہ سانس بھر رہی ہے وہیں کہیں میں بھی چہل قدمی کر رہا ہوں۔ وہ بدستور مجھ کو دیکھتی رہی لیکن میں نے فضا کو خوشگوار بنانا چاہا:

”ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ جو مزہ انتظار میں ہے وہ دنیا کی کسی شے میں نہیں۔“

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی اور یکبارگی اپنی عمر میں بیس برسوں کا اضافہ کر کے پچاس کی بن گئی۔ پل بھر کو اُن لڑکوں نے ہمیں دیکھا پھر خود میں کھو گئے۔ انجام کار وہ ہنسی پر قابو پا کر بولی: ”تم لوگ بڑے رومانی ہو اور جذباتی ہو۔۔۔۔ بلکہ کسی حد تک اذیت پسند بھی۔ میں ایک بار ایسٹ (EAST) ہو کر آئی ہوں۔ ہماری طرزِ زندگی اور ہماری اقدار تم سے بالکل الگ ہیں، جو ہمیں سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔“

”اسی لیے تم ہر چیز کو اپنے ڈھنگ سے دیکھا کرتی ہو؟“

”تم کہہ سکتے ہو کہ ہاں۔“

ہم خاموش ہلکے ہلکے گھونٹ بھرتے رہے۔ اس نے جو بھی کہا تھا وہ میرے لیے نیا نہیں تھا۔ مگر اتنا ضرور واضح ہو چکا تھا کہ وہ تیز فہم ہے۔ دنیا کو الگ نظر سے دیکھتی ہے۔ عام روش سے ہٹ کر دوسروں کو پرکھتی ہے۔

گلاس خالی ہو چکے تھے۔ میں نے اس کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھا کر پوچھا:

”تم کون سی وائن لے رہی ہو۔ ڈرائی یا سویٹ؟“

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”نہیں۔ مجھے اور نہیں چاہیے۔“

”کیوں؟ ابھی تو رات بھی جوان نہیں ہوئی۔“

اس نے اپنی نرم نرم انگلیاں میرے ہاتھ کی پشت پر پھیریں۔

”یہاں CROWD بہت زیادہ ہو گیا ہے۔۔۔ اور مجھے گھٹن سی ہو رہی ہے۔۔“

”لیکن مجھے تو CROWD میں رہ کر بڑا آنند ملتا ہے۔ یقین کرو میں اس کا اٹوٹ حصہ بننا چاہتا ہوں۔ ورنہ جب اکیلا ہوتا ہوں تو عجب سا محسوس کرتا ہوں۔“

مگر اب تو تم اکیلے نہیں ہو“

وہ پلکیں جھپکائے بنا مجھ کو تکتی رہی۔ لگا کہ پوری کائنات ایک ہی مرکز پر اکھٹی ہو گئی ہے اور ”وقت“ بھی ٹھہر گیا ہے۔ موجودہ لمحے کے بعد اگلا لمحہ شاید ہی جنم لے۔ میرا رکتا بڑھتا بازو انجام کار اس کی کمر کے گرد پھیل گیا۔ اس نے ذرا بھی مزاحمت نہ کی بلکہ چاہت سے مجھ کو دیکھا۔ مجھے فوراً احساس ہوا کہ زندگی کی پر پیچ راہوں اور

دشوار گزار راستوں میں اس کے ساتھ دور دور تک قدم اٹھایا جا سکتا ہے۔ میں نے جھک کر اس کے کان کی گرم لو کو محسوس کیا اور اپنائیت سے کہا: ''آؤ کہیں اور چلتے ہیں۔''

کچھ دیر میں ہم پب کے باہر کھڑے تھے۔ یخ بستہ ہوا نے ہمارا خیر مقدم اس طرح سے کیا کہ آن کی آن میں ہمارا انگ انگ آندھی کی زد میں آئے ہوئے خزاں زدہ پتوں کی طرح لرز اٹھا۔ اگر ہم وہاں کچھ دیر اور کھڑے رہتے تو ہمارے چہرے سن ہو کر رہ جاتے۔ اس نے اگلا پل ضائع کیے بغیر چمڑے کے دستانے نکالے اور بھاری کوٹ کی دوسری جیب سے اونی ٹوپی نکالا کر پہن لی۔ سڑک کے اس پار شیشوں سے بنی ہوئی عمارت میں خوبصورت سا پب تھا جس کی گونا گوں روشنیاں ہر راہ گیر کو اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔ اس نے جھٹ سے میرا بازو تھام کر وہاں چلنے کو قدم بڑھایا۔ جنکشن کی بتی سرخ میں تبدیل ہوتے ہی آتا جاتا ٹریفک رک گیا اور ہم تیزی سے سڑک کو پار کر کے پب میں داخل ہو گئے۔ لیکن بد قسمتی سے وہاں بھی کم و بیش وہی حالت تھی جس سے بھاگ کر ہم یہاں تک آئے تھے۔ چورس اور جدید پب کا ہر گوشہ جوان طبقے سے بھرا ہوا تھا۔ ان میں سے بعض تو قالین پر ہی پھیلے ہوئے تھے، موسیقی شور، شرابہ، قہقہے، سگریٹ کا گاڑھا کسیلا دھواں، ان سب نے مل کر ہماری امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ اس کے چہرے پر آگ سی لگ گئی تھی لیکن میں نے کندھے اچک کر لاچارگی ظاہر کی۔ وہ میری ادا سے محظوظ ضرور ہوئی مگر بھیڑ پر بھرپور نظر ڈال کر حقارت سے کہا:

"I am sick of such crowd , which has no character

وہ کونسل کی عمارت شیفرڈ کورٹ کی پندھرویں منزل پر مقیم تھی۔ لفٹ منزل بہ منزل ہوتی ہوئی آخری منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میرے ایک ہاتھ میں وائن کی نصف بوتل تھی تو دوسرے میں بیئر کے چند ڈبے۔ کیرل نے فش اینڈ چپس کے پیکٹ پکڑ رکھے تھے اور وہ ٹٹولتی ہوئی نظروں سے مجھ کو جاننے کے عمل سے گزر رہی تھی کہ آیا میں اس کی توقعات پر پورا اتروں گا یا نہیں؟ جبکہ میں تو اسے کب کا جان چکا تھا۔ ایک ہی ملاقات میں لاتعداد ملاقاتیں چھپی ہوئی تھیں۔ مختصر سے عرصے میں ہم نے کئی فاصلے طے کر لیے تھے اور کچھ دیر میں ہم آخری فاصلہ طے کر کے ایک دوسرے کی روح تک اترنے والے تھے۔ اچانک میرے ذہن کے کسی گوشے سے ''وقت'' نے نمودار ہو کر کہا کہ مجھے جھک کر اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ میں اس کے کرم سے ایک مشتاق پنچھی کی صحبت سے لطف اندوز ہو رہا ہوں لیکن میری گردن مزید تن کر رہ گئی کہ ذاتی کامیابی میں وقت کا دخل کہاں اور اگر ہے بھی تو وہ اپنے غیر متوازن نظام میں توازن پیدا کرنا چاہتا ہے۔ باقی سب بکواس ہے۔

لاؤنج میں داخل ہو کر اس نے فائر گیس جلایا، کھڑکی پر پردے کھینچے اور گلاس لانے کو کچن کی طرف بڑھ گئی۔ سامان رکھ کر میں نے فلیٹ پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ دو کمروں کا فلیٹ تھا۔ سامان ہر طرف بے ترتیبی سے بکھرا ہوا تھا۔ فلیٹ کی آرائش، وال پیپر، فرنیچر کی ترتیب اور دیواروں پر آویزاں تصویروں سے نمایاں تھا کہ فلیٹ کی اپنی

کوئی شخصیت نہیں ہے۔ کارنس پر دھری ہوئی تصویر کو دیکھ کر میرے حواس اوپر نیچے ہونے لگے۔ کیرل بیاہتا عورت تھی۔ وہ شادی کا لباس پہنے اپنے شوہر کے دوش بدوش کھڑی فخریہ مسکرا رہی تھی۔ غیر مرئی اندیشے سر اٹھا کر مجھے خود میں گھیرنے لگے اور میں دم بخود کبھی تصویر کو دیکھتا اور کبھی صدر داخلے کو عین اسی وقت کیرل گلاس تھامے گنگناتی ہوئی داخل ہوئی اور مجھے حیران سا پا کر بول اٹھی:

''ڈرومت مجھے اپنے شوہر سے علیحدہ ہوئے ایک سال سے اوپر ہو چکا ہے۔''

''پھر؟۔۔۔۔ پھر تم نے یہ تصویر یہاں کیوں رکھی ہے؟''

''تاکہ ہر کسی کو پتہ چل جائے کہ میں ایک بار آگ میں جل چکی ہوں۔''

'تم شادی کو آگ کہتی ہو؟''

''اور کیا کہوں اسے۔۔۔ میری شخصیت کو جلا کر رکھ دیا اس نے۔''

میں نے بئیر کے ڈبے کھول کر مشروب گلاسوں میں انڈیلا اور کوٹ اتار کر اس کے شوہر پر بھرپور نظر ڈالی۔ وہ دراز قد، پھریرے بدن کا خوبرو جوان تھا۔ اس کی شوخ شریر آنکھوں میں کئی سوال تھے۔

''تمہیں یہ تصویر پریشان نہیں کرتی؟''

''مجھے یہ کیوں پریشان کرنے لگی۔۔۔ میرا اَب اس سے رشتہ ہی کیا ہے؟''

''میرا مطلب ہے تمہیں شادی کے وہ حسین دن، راتیں، باتیں، ہنسی مذاق، واقعات اور بری بھلی یادیں رہ رہ کر یاد نہیں آتیں؟''

''وہ سب ختم ہو چکا ہے۔ میرے لئے ہر شے مر چکی ہے۔'' اس کا لہجہ تیز تھا گلاس ٹکرا کر اس نے اپنی بات کو آگے بڑھایا۔ ''میں بہت مشکل سے اس آگ سے نکل پائی ہوں''

میں ایک کے بعد دوسرا گھونٹ بھرتا چلا گیا اور میں نے جزیرے کے ذریعے اس کے اندرون تک پہنچنا چاہا لیکن وہاں گہرے پردے حائل تھے۔ لہذا میں نے براہِ راست دریافت کیا:

''لگتا ہے تم میرج کے بعد ذاتی آزادی کھو بیٹھی تھیں؟''

''تم آزادی کی بات کرتے ہو۔ میری شخصیت ہی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔'' اس نے بے حد اکھڑ کر کہا۔ پھر کچھ دیر بعد نہایت افسوس کے ساتھ گویا ہوئی: ''کسی کو اتنا پیار بھی نہیں کرنا چاہیے کہ عورت کی اپنی شخصیت دب کر رہ جائے اور مرد اُس پر اتنا حاوی ہو جائے کہ وہ ہر قدم پر فائدہ اٹھانے لگے۔۔۔۔ یقین کرو میں وہ نہیں رہی تھی جو شادی سے پہلے تھی''۔ میں سمجھ گیا کہ کیرل بھی ہر یورپین عورت کی طرح خود مختار اور آزاد ہے۔ وہ بھی شہری حقوق، شخصی آزادی اور زندگی کے ہر شعبے میں مساوات چاہتی ہے۔ وہ مرد کی برتری اور اس کا غلبہ کسی بھی طور برداشت نہیں کر پاتی، خواہ وہ معاشرتی زندگی میں ہو یا ازدواجی زندگی میں۔ اس نے گلاس میز پر رکھ کر پوچھا: ''تم تو

اس آگ میں جل چکے ہونا؟‘‘

’’نہیں، ابھی تک تو بچا ہوا ہوں۔‘‘

’’کتنے خوش قسمت ہو تم، میں تو کہوں گی بھول کر بھی آگ کے قریب مت جانا ورنہ راکھ ہو جاؤ گے۔‘‘ مجھے بے اختیار ہنسی آگئی لیکن میں نے گفتگو کا ربط ٹوٹنے نہ دیا۔

’’مگر جانے کیوں لوگ کہتے ہیں کہ بیاہ شادی کے بعد ہی آدمی مکمل ہوتا ہے۔‘‘

’’ممکن ہے مرد مکمل ہو جاتا ہو، پر عورت ادھوری رہ جاتی ہے۔اس لیے کہ مرد اس پر حاوی ہو جاتا ہے۔‘‘

اس کی باتوں سے زیادہ اس کی شراب مجھ پر اثر چھوڑ رہی تھی لیکن میں نے مناسب یہی سمجھا کہ موضوع کو زندہ رکھ کر اس سے وہ پہلو دریافت کیا جائے جو میرے نزدیک نہایت اہم تھا۔

’’شوہر سے علیحدہ ہو کر تم خود میں کمی محسوس نہیں کرتیں؟‘‘

’’تم ذہین ہو، ہو سکے تو کھل کر بات کرو۔‘‘

’’میرا مطلب ہے، تم ایسا محسوس نہیں کرتیں کہ تم اتنی بڑی دنیا میں پھر سے اکیلی ہو گئی ہو؟‘‘

’’اکیلی تو میں پہلے بھی تھی۔۔۔پھر کیوں بھولتے ہو کہ آدمی اکیلا ہی پیدا ہوتا ہے، اکیلا ہی زندگی سے لڑتا ہے اور اکیلا ہی مر جاتا ہے۔‘‘

’’مگر زندگی کے سفر میں آدمی کہاں تک اکیلا چل سکتا ہے؟ کبھی نہ کبھی تو اسے ہم سفر کی ضرورت پڑتی ہی ہے۔ ورنہ اکیلا پن اسے قدم قدم پر ڈسنے لگتا ہے۔‘‘

’’صرف ان لوگوں کو جو اکیلے پن سے ڈرتے ہیں۔ مجھے تو اکیلے پن سے محبت ہے۔ میں اکیلا رہنا پسند کرتی ہوں۔‘‘

مجھے اس کے رویئے پر تعجب ہوتے ہوئے بھی تعجب نہیں ہو رہا تھا کہ عموماً انگریز عورت ماضی میں کم، حال میں زیادہ زندہ رہتی ہے۔ وہ زندگی کو جس طرح سے وہ ہے، قبول کرتی ہے لیکن اس کے خیالات کی گہرائی اور سوچ کے تسلسل سے واضح تھا کہ اس کی ہر بات، تجربہ اور مشاہدہ اس کی اپنی ذات کے تعلق سے ہے لیکن میں پھر بھی بال کی کھال نکالنے سے باز نہیں آ رہا تھا۔‘‘ مانا کہ تمہارا تعلق خود سے بہت گہرا ہے اور تم دن کا ہر پل اپنے ساتھ گزارنا چاہتی ہو۔۔۔مگر کبھی نہ کبھی تو تمہیں بھی خود سے اکتاہٹ ہوتی ہوگی؟‘‘

’’میں تمہارا مطلب سمجھ گئی۔ یقین کرو میں کئی ہفتوں تک اپنے دوستوں سے بھی نہیں ملتی۔ پھر ملوں بھی کس لئے؟ شخصیت کے ٹکراؤ کے لیے؟ انا کو ٹھیس پہنچانے کے لیے؟۔۔خود میں ناآسودگی پیدا کرنے کے لیے؟‘‘

اس کے لہجے میں زمانے بھر کا طنز چھپا ہوا تھا۔ لگا کہ وہ سارا زہر جو اس کے سینے میں بھرا ہوا ہے، اگل ڈالے گی۔ مجھے خیال آیا کہ میں اور وہ ان کشتیوں کے مسافر ہیں جن کی منزل تو ایک ہے لیکن وہ دھند میں کھوئی

ہوئی الگ الگ دھاروں پر بہہ رہی ہیں۔ کیرل اکیلے ہوتے ہوئے بھی اکیلی نہیں ہے، جب کہ میں نہ ہوتے ہوئے بھی اکیلا ہوں۔

’’شاید تو م اس سوچ میں ہو کہ میں نٹ کیس (NUTCASE) ہوں؟‘‘

’’نہیں میں سوچ رہا تھا کہ ہمارے سوچنے کا ڈھنگ کتنا الگ الگ ہے۔ پھر بھی میں سمجھتا ہوں ہم اچھے دوست ثابت ہو سکتے ہیں؟‘‘

’’یہ کہنا تو کافی مشکل ہے لیکن تمہاری پرابلم کچھ اور ہے جس نے تم کو تنگ کر رکھا ہے؟‘‘

یوں لگا کہ اس نے میرے اندر جھانک جان لیا ہو کہ میں زندگی کے دوراہے پر بے یار و مددگار کھڑا ہر راہ گیر کے ساتھ قدم اُٹھانے کو تیار ہوں۔ یکبارگی میرے بدن سے کپڑے غائب ہو گئے اور میں اس کے سامنے برہنہ بیٹھا رحم کی بھیک طلب کر رہا ہوں۔ ایک مرتبہ پھر مجھے گلاس کی ضرورت محسوس ہوئی اور میں ایک ہی گھونٹ میں تین چوتھائی گلاس صاف کر گیا۔ کیرل کا چہرہ ہمدردی سے بھر گیا لیکن لبوں پر پھیلی ہوئی پیچیدہ مسکراہٹ پھانس بن کر میرے اندر اتر گئی۔ فاصلے ہمارے درمیان از سرِ نو پیدا ہو گئے اور ہم پھر سے اجنبی بن گئے۔ کیرل کو احساس ہوا تو برجستہ بول اٹھی:

’’اس دنیا میں کوئی بھی شخص ایسا نہیں جس کے ہاں پرابلم نہ ہو۔ میرے ہاں بھی وقت بے وقت ایک پرابلم پیدا ہوتی ہے۔ وہ مجھے سخت پریشان کرتی ہے۔۔۔مگر دنیا میں ہر پرابلم کا حل بھی تو موجود ہے نا؟‘‘ اس کی پرابلم کو سمجھنے کی خاطر مجھے زیادہ مغز پچی نہ کرنی پڑی تھی۔ وہ اس خشک ندی کی طرح تھی جو اپنی خشکی سے تنگ آ کر ہر سمت سے رواں پانی کو خود میں سمو کر اپنی پیاس بجھانا چاہتی ہے اور یوں وہ خود کو سیراب کر لیتی ہے۔ میں اسے ذہن نشین کرانا چاہتا تھا کہ آدمی کتنا بھی تنہا پسند کیوں نہ ہو، اس نے کتنی بھی دیواریں اپنے اردگرد کیوں نہ کھڑی کر رکھی ہوں اسے دوسروں کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے لیکن اس نے مجھے لب کشائی کا موقع ہی نہ دیا۔ صوفے سے اٹھ کر اس نے کمرے کی بڑی بتی بجھا دی صرف سپاٹ لائٹ جلتی رہ گئی کمرے کی شخصیت بدلتے ہی مدھم روشنی میں ہر شے کا رنگ روپ بدل گیا لیکن ماحول نکھر آیا اور وہ دھیرے دھیرے جذبات کو ابھارنے لگا۔ اس نے ہائی فائی یونٹ کا بٹن دبایا تو الگ الگ جگہ پر دھرے ہوئے اسپیکروں سے موسیقی کی آواز ابھرنے لگی۔ گانے کے بول فضا میں جادو جگانے لگے۔ "ALL YOU NEED IS LOVE.... LOVE."

موسیقی کی تھرتھراہٹ پر اس کے شریر کا انگ انگ جھوم اٹھا۔ پھر وہ ہولے ہولے جھومتی ہوئی ادائے خاص سے تن سے ایک کے بعد دوسرا کپڑا الگ کر کے اسے ہوا میں لہراتی چلی گئی۔ ہلکی روشنی میں بھی اس کا گورا بے داغ بدن مقناطیس بنا مجھے اپنی طرف کھینچتا رہا۔ وہ مستی میں ڈوبی، آنکھیں موندے بدن کے الگ الگ حصے پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ میں تیزی سے اٹھا اور قمیض کے بٹن کھولتا ہوا اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ پھر ہمارے ہونٹ، ہاتھ

اور بدن پیار کی زبان میں بات کرنے لگے۔ ہم ایک دوسرے کے واسطے لاکھ اجنبی سہی؟ ہمارے سوچنے کا ڈھنگ بھی الگ الگ سہی؟ مگر پیار کرنے کا ڈھنگ ایک جیسا تھے۔ مجھے ذرا بھی احساس نہ ہوا کہ وہ دنیا کے کسی الگ خطے ،الگ نسل اور الگ قوم سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ دیوانہ وار میرے چہرے پر ہونٹوں کے نشان چھوڑ رہی تھی، جب کہ میرے ہاتھ اس کے بدن کی پیمائش میں مصروف تھے۔ پھر میں نے ایک ہی جھٹکے سے اسے بازوؤں میں اٹھالیا اور اس کے ہونٹ اپنے ہونٹوں میں مقید کر کے اس کی خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔

صبح آنکھ کھلی تو کافی دیر ہو چکی تھی۔ کھڑکی پر پھیلے ہوئے پردے کے پیچھے دن کا اجالا اپنی عظمت کا اعلان کر رہا تھا۔ پردے کی رنگت بھی اس کی شدت سے بدلی بدلی سی تھی۔ کیرآل ابھی تک بے خبر سو رہی تھی۔ اس نے مجھے اپنی بانہوں میں اتنی مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا کہ جیسے اسے ڈر ہو کہ میں کچھ ہی دیر میں اس سے جدا ہونے والا ہوں اور کبھی لوٹ کر نہیں آؤں گا؟ لیکن اس کے چہرے پر ڈھیروں سکون تھا، طمانیت تھی، قرار تھا، میں بھی خود کو ہلکا محسوس کر رہا تھا اور میری آتما بھی خوش تھی۔ میں نے خود کو کیرآل سے الگ کر کے اٹھنا چاہا تو اس کی گرفت اور بھی مضبوط ہو گئی۔ پھر اس نے میری پیٹھ پر ناخن کھرونچنے شروع کر دیئے۔ میرے بدن میں جھرجھری ہوئی تو چیونٹیوں نے مونہہ کھول ڈالا اور سوئیاں سینے میں چبھنے لگیں۔۔ بس پھر کیا تھا۔ ہم ہمارے بدن اور ہمارے دماغ بھرے اجالے میں ایک دوسرے کو مزید جاننے میں جُت گئے۔

چائے کا پیالہ ختم کر کے جب میں اس کے فلیٹ سے چلنے کو تیار تھا تو کیرآل شب خوابی کا گاؤن پہنے میرے قریب چلی آئی۔ گہری نظروں سے دیکھا جیسے میں اس کے نزدیک نہایت ہی اہم شخص ہوں اور ہمارے درمیان رات اور دن میں جو بھی ہوا وہ بھی اپنی جگہ نہایت اہم تھا۔ اس نے دھیمے سے کہا:

''کل رات تم نے کہا تھا، ہم اچھے دوست ثابت ہو سکتے ہیں؟''

''ہاں، کہا تو تھا۔''

''میں بھی اب ویسا ہی محسوس کر رہی ہوں۔''

میری آنکھوں کی روشنی تیز ہو گئی اور میں نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ اکیلا پن دور ہوتا دکھائی دیا۔ سارا جگت مسکرا اٹھا اور میں نے خود کو ہمالیہ کی چوٹی پر کھڑا پایا۔

''لیکن میری ایک شرط ہے؟''

''کیا؟''

''میں تم سے تب ہی ملنا پسند کروں گی، جب میں چاہوں گی؟''

''ورنہ؟''

''ورنہ نہیں۔'' اس نے قطعیت کے ساتھ کہا۔

میں چکرا گیا۔ میرے ہاتھ خود بخود اس کے ہاتھوں سے الگ ہو گئے لیکن کئی سوال میرے وجود پر پھیل گئے۔ ان میں طنز بھی تھا اور سمجھ بوجھ کا عنصر بھی۔ فوراً صوفے سے کوٹ اٹھایا اور بولا:

کیرآل تمہاری ٹریجڈی بڑی عجیب ہے جس نے تم کو سخت تنگ کر رکھا ہے۔؟''

وہ محتاط ہو گئی۔

''تمہیں مرد ذات سے سخت نفرت ہے۔ تمہارے بس میں ہو تو تم اس سے بات بھی نہ کرو؟''

وہ محتاط تو تھی، سنجیدہ بھی ہو گئی۔

''لیکن تم کو مرد کی ضرورت بھی وقت بے وقت رہتی ہے۔ اس کے بغیر تم رہ نہیں سکتیں۔''

میرا انکشاف اس کے واسطے کڑوی گولی ثابت ہوا۔ چہرے پر ہر آتے جاتے رنگ سے عیاں تھا کہ میں نے اس کی شخصیت کو پارہ پارہ کر ڈالا ہے۔

''میں اکیلا ضرور ہوں لیکن اخلاق سے اتنا گرا ہوا نہیں کہ تم مجھ کو ایک سٹڈ (STUD) کی طرح استعمال کرتی رہو۔''

کیرآل پتھرا کر رہ گئی۔

سنا ہے کسی کے سر پر بھوت سوار ہو گیا تو بھوت نکالنے والوں نے مار مار کر بھوت کا بھرکس نکال دیا اور پوچھا:

''بتاؤ اب۔ تم کون ہو؟''

''ٹھہرو، مجھے مارنا بند کرو، میں ابھی بتاتا ہوں'

''بتاؤ، جلدی بتاؤ!''

''میں ایک کہانی کار ہوں۔۔۔

ٹھہرو، مجھے مارو نہیں، میں سچ بول رہا ہوں۔۔۔

میں ایک کہانی کار ہوں اور یہ شخص میری ایک کہانی کا کردار ہے۔۔۔ ٹھہرو، مارو نہیں۔

میں ابھی اس کے سر نکل جاتا ہوں۔''

اور سنا ہے جب کہانی کار اپنے کردار کے سر میں سے نکل گیا اور کردار نے آنکھیں کھولیں تو پوچھنے لگا:

''میں کون ہوں؟''

(**جوگندر پال** کے مضمون **نئے افسانے کا تارو پود** سے اقتباس)

شفیق انجم (اسلام آباد)

اُکڑوں بیٹھا وقت

مجھے جُز سے نہیں کُل سے غرض ہے۔تم سمجھتے کیوں نہیں! اپنا آپ سامنے پھیلے ہاتھ کی لکیروں کی طرح سب کا سب میری نظر کے دائروں میں دے مارو۔تشفی کی سیپ کے بند کھل جائیں گے۔ پھر میں تم سے کچھ نہیں مانگوں گا۔خداوند خدا کی قسم۔۔۔ یہ مت کہنا کہ پہلے تم۔ فیصلہ کر دو، بس حکم سنا دو، پھر جو ہوگا یکبارگی۔کیا تم' کیا میں۔ سنتے ہو میں نے کیا کہا؟؟۔۔۔ چپ کا زناٹا ہوا میں لہرایا اور گم ہو گیا۔سامنے پڑی چائے کی دوسری پیالی کے اس پار کا ہیولا کوندے کی طرح لپکا اور ہال کے صدر دروازے سے یہ جا وہ جا۔اب وہ اکیلا تھا۔اپنے آپ کو چائے کے آخری گھونٹ میں اچھی طرح گھول کر حلق میں انڈیلتے ہوئے اس نے سوچا: یقیناً جُز، جُز ہے اور کُل، کُل۔

دوسرے دن فلسفے کے لیکچر میں وہ پھر ساتھ ساتھ تھے۔ پروفیسر نے نصابی گفتگو کے بعد وائٹ بورڈ کے درمیان مارکر سے نقطہ ڈالا اور اوپر سوالیہ نشان کی ٹک بنا دی۔ یہ آج کے لیکچر کا اختتامیہ ہے۔ ہمارا پہلا اور آخری مسئلہ بس یہی ایک منحنی سا نشان۔ ہم اس نشان کو پاٹنے میں لمحہ لمحہ گھلتے ہیں۔ پاٹ چکتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ شاید ہم نے کچھ کسر باقی رکھ چھوڑی۔ سو ہم کھوجتے ہیں، پاٹتے ہیں، تھک کر ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں مگر ازلوں کی رہی کسر ہمیں ہٹنے نہیں دیتی۔ ہم سب اس منحنی صورت والے بُھتنے کی قید میں ہیں۔ ہم جُز جُز کریدنے کے سوا اور کچھ نہیں کرتے۔کیا آپ میری اس بات سے متفق ہیں؟ آئندہ لیکچر میں اس حوالے سے آپ کے خیالات جاننے کا مجھے اشتیاق رہے گا۔ پریڈ ختم ہوا تو وہ دونوں وہاں نہیں تھے۔

جِم میں ورزش سے پہلے وارم اپ ہونے کے لیے دو ہیولے اچھل رہے تھے۔ باقیوں سے زیادہ خوبصورت، زیادہ چاق و چوبند اور زیادہ توانا۔ پھول پنکھڑیوں سے رنگ اور رس ٹپکاتی بھرپور جوانی۔ شارٹ ڈریس پہنے وہ ورزش کرتے رہے اور کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ مسلسل تنتے نرم ہوتے مسلز میں

سورج کا سا جوبن لہریے کھا رہا تھا۔ چہروں پر سرخی اُمڈی پڑی تھی اور عرق عرق ہوتے وجود کا رُواں رُواں گویا تھپیڑے مارتا محسوس ہوتا تھا۔آج رات کھانا اکٹھے کھائیں گے، ٹھیک ہے؟ دوسری طرف ذرا دیر کو چپ اور پھر۔۔ او کے، ٹھیک ہے۔

بات سنو تو سناؤں؟ رات ملاقات پر ایک، دوسرے سے گویا ہوا۔ ہاں سناؤ۔دل کی ورق ورق کتاب پر لکھا ہے کہ وجود کی بھوک لمس کی حدت ہے۔ وجود کو وجود سے مس کرو تو کچھ ہونے کا احساس ہمکتا ہے۔ حاصل اس کا لذت ہے، تشفی ہے۔اخلاق، ضابطے، قانون سب ہیچ ہیں۔اندر کی آواز دھرم ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے بیج کے اندر بالا۔موجود ہوتا ہے مگر دکھائی نہیں پڑتا۔ بیج اس کی پکار سن لے، اس کے لیے اپنا سینہ کھول دے تو دھرتی ایک نئی شے سے آشنا ہو جاتی ہے۔ پکار اندر ہی گھٹ جائے تو سڑاند بن جاتی ہے۔۔تم سمجھ رہے ہو ناں میری بات؟؟۔۔ہاں ہاں، بولو۔۔سنو! میرے اور تمہارے وجود میں، جب سے ہم شناسا ہوئے ہیں، اندر کی آواز ایک ہے۔اسے سڑاندمت بننے دو۔لمس کی حدت سے لذت کی پنکھڑیاں کھلا دینا اب ہمارے ہاتھ میں ہے۔آؤ فیصلے کے اضطراب سے ہاتھ کھینچ کر اندر دھرم کے اندھے دھندلکوں میں کود جائیں۔

دوسرے نے کندھے اچکائے اور بولا۔ اے مجھ جیسے! جو تُو سوچ رہا ہے وہی میں سوچ رہا ہوں لیکن۔۔۔لیکن ہمیں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔تُو تو جانتا ہی ہے کہ ہمارا سماج۔۔ مذہب۔۔اچھا چھوڑو اس ٹاپک کو، بتاؤ کھانے میں کیا لو گے۔فرائیڈ مٹن۔۔مختصر جواب ملا اور اس کے بعد کھانے کے دوران دونوں مسلسل چپ رہے۔سکوت ایک پردا بے دیر تک اپنے اصیل ہونے کا ناٹک کرتا رہا کہ اچانک پہلے نے اس کے سر پر آواز کا مُکا مارا۔۔ مجھے تمہارے سوا کچھ محسوس نہیں ہوتا ڈیئر۔ میں دیکھتا ہوں، سنتا ہوں، بولتا ہوں، ہر بات کی گہرائیوں میں اتر کر کھرچ لینے کی صلاحیت رکھتا ہوں لیکن ہر طرف تم ہی تم ہو۔ جذب کی آخری حدوں کی قسم۔' آئی لو یو۔آئی رئیلی لو یو اینڈ مِس یو ایور'۔کیا کہتے ہو تم۔ پلیز کچھ بولو کہ قرار ملے۔'سَیم ٹو یو'۔ایک جملے میں گویا کہنے والے نے پوری کائنات سمیٹ دی۔مسکراہٹوں نے دھمال ڈالی اور دونوں کے بیچ اکڑوں بیٹھ سلامی لی۔کھانے کے بعد پہلے ایک ہیولا تحلیل ہوا اور پھر دوسرا۔ بڑے ہال میں موجود فانوس نے ادھر ادھر جھانک کر دیکھا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔

سر ہمارا سب سے بڑا مسئلہ سوال نہیں، سوچ ہے۔ ہم سوچتے ہیں تو الجھ جاتے ہیں۔ الجھ جاتے ہیں تو سوال کی بیساکھی سے اپنا آپ سہارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یقیناً میرے ساتھی اس کی تائید کریں گے۔ایک نے کلاس میں بحث کا آغاز کیا اور آنکھ دباتے ہوئے پاس بیٹھے دوسرے کو دیکھا۔ باقی سب ادھر متوجہ ہو گئے۔ جی سر میں اس کی تائید کرتا ہوں اور اضافہ یہ کہ ہم اجزا کو اپنے اوپر اس طور پر اوڑھ لیتے ہیں کہ کُل کا عمل ساکت ہو جاتا ہے۔کُل کیا ہے؟۔ نیچر۔۔نیچر سوچتی نہیں، اپنے آپ کو محسوس کرتی ہے اور بس۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے عمل میں

کوئی الجھاؤ نہیں۔ہم نیچر کا حصہ ہونے کی حیثیت سے اپنے آپ کو محسوس کریں تو یقیناً ہماری روانی میں خلل واقع نہ ہوگا۔اندر کی آواز دھرم ہے۔باقی سب ہیچ ہے۔ بحث اس کے بعد بہت دیر تک جاری رہی لیکن وہ دونوں وہاں نہیں تھے۔

۔۔۔بہار موسم میں شام سہانے سمے،جنگل پرندوں کے جھرمٹ میں بیٹھا چہک رہا تھا۔درختوں کے بیچوں بیچ کھدے رستے پر دو ہیولے رواں دواں تھے۔محو گفتگو۔خراماں خراماں۔ بڑھے چلے جا رہے تھے۔نیچر اچک لیتی ہے،فعلیت کی تمام حسیں بیدار کر دیتی ہے،اپنے گھماؤ میں لا کر ہر شے پر جذب کی چاشنی کا روغن ڈال دیتی ہے۔۔آؤ ڈیئر ذرا پل یہاں بیٹھتے ہیں۔۔خمار کے اندر خمار ہونے کو،سوچ کے کتے کو دھتکار دو۔میرے ہونٹوں پہ ہونٹ رکھ دو کہ بے قراری کی چھاگل چھلکی پڑی ہے۔آؤ فطرت کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر بھولپن کا جھولا جھولو۔رس نچڑنے دو،اتنا کہ پیاس کے کٹورے لبالب بھر جائیں۔قریب آؤ یوں کہ جیسے پھول کے ماتھے پر شبنم نقش ہو جائے۔۔پہلی بار ہونٹوں نے ہونٹوں کو چھوا تو سارے جنگل کو گویا آگ لگ گئی۔لذت بل کھا کھا کر ہلکان ہوئی جاتی تھی مگر دونوں نے تند گھماؤ کی بے بہرہ فعلیت کو کہیں دور ٹھہرائے رکھا۔بس پاکیزہ لمس کی مہک تھی اور وہ۔

برسوں پہلے کسی نے کہا تھا کہ زندگی چپکنے والی غلاظت ہے جو بہتے بہتے جم گئی ہے۔غلاظت کو غلیظ تر کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ عورت کا ہے۔دنیا میں اگر کوئی قابل نفرت شے ہے تو وہ ہے عورت۔دونوں کو وہ شخص پسند تھا۔کیا خوب بات کتنی خوبی سے کہہ گیا۔گھنٹوں بحثتے وہ اکثر اس کو موضوع بناتے لیکن اس کی منحنی صورت۔۔۔دونوں کو تے سی آ جاتی۔ڈیئر اس نے عورت کو خوب لتاڑا ہے بس یہی اس کا احسان کافی ہے،باقی سب باتوں کو چھوڑ دو۔۔۔حرام زادیاں کہیں کی۔اور یہ۔۔یہ سماج اور مذہب کی طوائفیں!!۔کیا کہوں میں ان کو۔کاش کوئی ان کو بھی جذب کی آخری حد تک جا روندے۔۔ہاں ہاں روندا ہے،بہت سوں نے روندا ہے لیکن ڈیئر اب کوئی بُہا تو آنے سے رہا۔لیکن شاید ہم۔۔۔ہاں ہم روندیں گے۔جذب کی آخری حد تک جا روندیں گے۔بس ہمیں فیصلہ کرنا ہے،حکم سنانا ہے،اپنا آپ ایک دوسرے کو سونپنا ہے۔تو کیا تم تیار ہو؟؟ نو نو ڈیئر پلیز جلدی نہ کرو۔آئی ہیو سم کنفیوژن سٹِل نَو۔

کنفیوژن!اف کنفیوژن۔یہ تمہاری خرابی نہیں،یہ سب اس دور کا ابتلا ہے۔لیکن شاید دور تو سب ایک سے ہوتے ہیں اور کنفیوژنز بھی ایک سی۔پھر میں اسے کیا نام دوں۔میں اپنے اور تمہارے اندر کی آواز کو بھی تو کوئی نام نہیں دے سکتا۔نام تو بس طفل تسلیاں ہیں۔شاید تمہارا ذہن فطری اور غیر فطری کی گتھی میں الجھا پڑا ہے۔عورت کا عورت سے تعلق،مرد کا مرد سے تعلق اور مرد اور عورت کا تعلق۔۔سب وجود کی بھوک ہے۔ناموں کے گھماؤ سے ذرا نکل کر دیکھو تو سہی۔تم یہاں مذہب کا نام میرے سامنے مت لینا۔مذہب کی حیثیت میرے نزدیک اس لونڈیا سے زیادہ کچھ نہیں جس پر جو ہاتھ رکھ دے وہ اسی کی ہو جاتی ہے۔فطرت،تشفی کا عمل ہے۔جیسے بھی ملے،جہاں سے ملے،اچک لو۔یہی تشفی ہے،یہی فطرت ہے۔

آخری رات سے ایک دن پہلے کالج لان میں وہ بیٹھے ڈر اور خوف کو موضوع بنائے ہوئے تھے۔یار جو تم چاہتے ہو وہ میں بھی چاہتا ہوں لیکن۔۔لیکن مجھے خوف آ رہا ہے۔تم نے سنا تو ہوگا قصہ ان لوگوں کا جو دھتکارے گئے۔آسمان سے پتھر برسے اور پھر ان میں سے ایک بھی باقی نہ بچا،یا ان کا کہ جنہیں چنگھاڑ نے آ گھیرا اور پھر جو جہاں تھا وہیں جم کے رہ گیا۔خوف کی چادر تلے جذب کی آخری حد تک جانا محال ہے۔کچھ ایسا کہو کہ تشفی ہو۔۔۔دوسرے نے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔یار بودے نہ بنو۔یہ سب واہمے ہیں۔جُز جُز میں بٹ جانے اور بکھر کر رہ جانے والوں کے واہمے۔ہم ایک بڑے کُل کا حصہ ہیں۔جو سب کے ساتھ ہونا ہے وہی ہمارے ساتھ بھی ہوگا۔یہ تو اٹل ہے کہ ہم نے ہمیشہ کو یہاں اسی حالت میں نہیں رہنا۔کوئی چِیں کرے یا مِیں۔تو پھر بھاڑ میں جائے یہ خوف۔سِسک سِسک کر مرنے سے بہتر ہے کہ اپنی مرضی جیو اور سینہ تان چل بسو۔زندگی کون سی ہمارے باوا کی جاگیر ہے۔یا ہم نے اپنی کمائی سے ذرہ ذرہ جمع کی ہے۔جس چیز میں ذرا پل سکون ملے،اچک لو۔اٹھو چلیں۔

جِم میں دونوں کے درمیان اس دن مستی ڈولتی رہی۔آج ادھر خوب دل لگ رہا تھا۔ایک نئی طرز کا احساس ابلا پڑا تھا۔یار ذرا ٹونی کو دیکھو۔۔ایک نے سرگوشی کی۔دوسرا مسکرایا۔ہاں اچھا ہے مگر تم سے اچھا نہیں۔سنا ہے جیکی کے ساتھ اس کی بڑی لگتی ہے۔کوئی۔۔۔دونوں کھکھلا اٹھے۔بھئی تم ٹونی اور جیکی کی بات کرتے ہو یہاں تو سارا شہر پٹا پڑا ہے۔ایک سے ایک ٹونی،ایک سے ایک جیکی کو دبوچے بیٹھا ہے۔شیدے مکینک سے مولوی مستان تک،چاچے نانبائی سے پروفیسر ذاکر تک۔کس کس کا نام گنواؤں۔بس آج ہم بھی فیصلہ سنا دیتے ہیں۔کہو کیا کہتے ہو!۔۔ٹھیک ہے، بلکہ بہت ہی ٹھیک۔دونوں کی باچھیں کھل اٹھیں۔شام کو بازار چلیں گے،کچھ ضروری چیزیں خریدنی ہیں۔رات تم ہوسٹل نہیں جاؤ گے،میرے ساتھ گھر چلو گے،سمجھے؟۔۔بالکل۔کوئی اور حکم!۔۔نہیں نہیں کچھ نہیں،بس ذرا سوچ کو گرہ لگا کر ادھر جِم ہی میں ڈال جانا۔

رات دونوں نے لمس کی حدت تلے پھیلی ملگجی روشنی میں اکڑوں بیٹھے گزار دی۔سامنے پھیلے ہاتھ کی طرح دونوں نے اپنا آپ ایک دوسرے کی نظر کے دائروں میں دے مارا۔لذت اچھل اچھل اپنا رس نچوڑتی رہی اور دونوں اس کے دائروں میں گم ہلکورے کھاتے رہے۔سب کچھ یکبارگی ہوا۔وقت قریب ہو ہو داد دیتا رہا۔تشفی کی سیپ کے سارے بند کھل گئے۔۔۔صبح دم کُل سے واپس پلٹتے ہوئے جُز جُز بکھرے واہموں پر دونوں نے نظر کی تو وہ جوں کے توں تھے۔گمان گزرا کہ اب پتھر برسیں گے یا کہیں سے کوئی چنگھاڑ انہیں آ گھیرے گی۔سو وہ سینہ تانے منتظر رہے۔مگر عجب تھا کہ نہ کوئی چنگھاڑ ابھری اور نہ کہیں سے پتھر برسے۔

شفیع بلوچ (جھنگ)

شاید......!

اس دنیا کے بیشتر انسانوں کے مقدر کی طرح کی وہ بھی ایک گہری سیاہ رات تھی۔ باہر کے اندھیرے نے بلندی اور پستی کے فرق کو مٹا دیا تھا، جب کہ اندر کی روشنی اتنی مدھم تھی کہ اپنا آپ بھی اس میں کم کم سُجھائی دیتا تھا۔ اندھیرا...... جو لمحہ لمحہ روشنی کو قتل کر کے ظلمت کی سلطنت کا بے تاج بادشاہ ٹھہرتا ہے، اسی اندھیرے کی سیاہ دھند میں لپٹا، وہ اپنے آپ کو ٹٹولتا، اِدھر اُدھر دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ اُس نے بھی تو یہی سیاہ چادر اوڑھنے کے لئے دن کے کتنے پہروں کو ہلاک کیا تھا تب جا کے کہیں رات نے اپنی باہیں وا کی تھیں......اور پھر بالآخر وہ اس دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہوا جہاں پہلے سے ہی دو ہیولے کھڑے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

کوئی یونہی کسی در پہ دستک دینے نہیں پہنچ جاتا۔ جذبوں کی کوئی کششِ ثقل، کوئی مقناطیسیت، طالب اور مطلوب کے درمیان ضرور کارفرما ہوتی ہے اور یوں بھی کسی عورت اور مرد کے مابین محبت اور جذباتیت کا جو رشتہ استوار ہوتا ہے اس کے پیچھے دونوں کی معروضی اور داخلی شخصیّت کی ترتیب اور فکری ہم آہنگی کی طاقت ہی تو کام کر رہی ہوتی ہے، یہی طاقت دلچسپی کی راہ سے گزرتی ہوئی تقریبِ ملاقات پہ منتج ہوتی ہے۔ ہجر اور گیان کی ماری دو پیاسی روحیں جب یک جا ہو جائیں تو وہ اپنی تشنگی کی تطہیر کیسے کرتی ہیں؟ بس یہی ایک روشن واقعہ تھا جو اس اندھیری رات کے بطن میں ایک مردہ بچے کی طرح اٹک کر رہ گیا تھا۔

''آ جاؤ!'' دروازے میں کھڑے ایک ہیولے کی سسکی اُبھری۔

''ادھر بیٹھو!'' دوسری سسکی اُبھری۔

وہ خاموش تھا۔ اپنی متاہلانہ زندگی کی طرح۔

''دیکھو کیسا معرکہ سر ہو گیا!'' ایک ہیولے نے دوسرے کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

''اچھا تم دونوں بیٹھو، میں تمہارے لئے پانی وانی لاتی ہوں۔''......اور ایک ہیولا دور ہوتا گیا۔

''یہاں بیٹھو......ادھر......میرے پاس!''

وہ مشینی انسان کی طرح اُٹھا جیسے اس کا ریموٹ کنٹرول اس ہیولے کے ہاتھ میں ہو، اور اس کے قریب جا کے بیٹھ گیا۔ دوسرے کمرے سے معمولی سی روشنی نیم وا دروازے سے چھن کر اندر آ رہی تھی۔ اس نے غور

سے اسے دیکھا۔ ''مونا لیزا......سوہنی......ہیر!!!'' اس نے دل ہی دل میں سوچا اور کمرے کی دیوار کو غور سے دیکھنے لگا۔ دیواری گھڑی پر دس بج رہے تھے۔

''کیا سوچ رہے ہو؟''

''تمہیں......!''

''ڈائیلاگ؟''

''نو......بائی گاڈ نو!''

''کمال ہے!''-----ایک شادی شدہ انٹلیکچول جوڑا ایک دوسرے سے محوِ گفتگو تھا جو یونیورسٹی کے ہم جماعت تھے۔ اتنے میں دوسرا ہیولا کوک لے کر آیا اور ان دونوں کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

''پیو!'' اور وہ ایک ہی سانس میں کوک کی بوتل چڑھا گیا۔

''بہت پیاس تھی کیا؟''

''پیاس؟......بُجھی کب ہے! سمندر بھی اگر میرے اندر گرے تب بھی شاید نہ بُجھے۔''

''بھئی اپنی سمجھ سے تو بالاتر ہے آپ کا یہ عارفانہ کلام۔'' دوسرے ہیولے نے کندھے اچکائے اور خالی بوتل واپس لے کر چلی گئی۔

''کیا فِکر ہے یہ بھی!''

''کون سا؟''

''یہی تمہاری پردہ پوش خاتون، رازدار کا......ہیروئن کا مددگار کریکٹر......!''

''تمہارا اس کریکٹر سے کوئی تعلق نہیں بنتا کیا؟''

''میری تو محسنہ ہے محسنہ! یہ نہ ہوتیں تو جُگنوں پہ یہ بھاری رات کب ہمارے نصیب میں ہوتی۔''

''بڑی شانت قسم کی ہے میری یہ کزن......سہیلی......کچھ بھی سمجھ لو۔''

''یہ رشتوں کو اگر کوئی نام نہ بھی دیا جائے تب بھی وہ اپنی جگہ قائم دائم تو رہتے ہی ہیں۔''

''اچھا تو سنایئے پھر کیسے گزری......ہمارے بعد؟''

''جو ہم پہ گزری سو گزری......''

''......مگر شبِ ہجراں!''-----ہیروئن نے درمیان سے ہی مصرع اچک لیا۔

''تمہیں بھلاتے ہوئے، اپنے آپ کو سمجھاتے ہوئے بالآخر لکھے پہ قانع ہونا ہی پڑا۔''

''قناعت کے لئے ہم تم ہی رہ گئے تھے کیا؟''

''مجھے نہیں معلوم، لیکن کوئی کر بھی کیا سکتا ہے؟''

’’بیوی کیسی ہے، بچے کیسے ہیں اور......اور کیا تم نے ماحول میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرلیا ہے؟‘‘

’’بیوی......؟ جیسی بیویاں ہوا کرتی ہیں ،ارینج میرج والی......اور بچے؟ بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں۔ پھول جہاں بھی کھلیں خوبصورت لگتے ہیں۔ رہا مسئلہ ماحول سے ہم آہنگی کا تو بابا ہم فقیروں کا کیا ہے جہاں بیٹھ گئے سو بیٹھ گئے۔‘‘

’’اچھا فقیر صاحب! یہ بتایئے کہ کوئی دشواری تو نہیں ہوئی یہاں تک پہنچنے میں؟‘‘

’’دشواری؟...... یہ پوچھیے کہ ہجر کے کتنے صحراؤں کو عبور کرنا پڑا۔‘‘

’’یہ رومانیت نہ گئی تم سے۔‘‘

’’رومانیت وومانیت کچھ نہیں، سیدھی سی بات ہے۔‘‘

’’اور میری مشکلوں کو کس کھاتے میں گنو گے۔ کتنے پاپڑ بیلنے پڑے تمہارا نمبر تلاش کرنے میں۔ کتنے عرصے بعد تم سے رابطہ ہوا اور ایک تم تھے کہ مان کے بھی نہیں دیتے تھے کہ یہ میں ہوں......کرن!...... یونیورسٹی کے دنوں میں جس کا نام شمس کے ساتھ لیا جاتا تھا......وہی کرن پورے پانچ سال بعد تمہیں......‘‘

’’کیسے یقین کر لیتا؟ یوں کبھی ہوا نہیں تھا تبھی تو میں حیرتوں کے سمندر میں ڈوبا جا رہا تھا۔‘‘

’’پھر تم نے یقین کیسے کر لیا؟‘‘

’’یقین......! پہلے امپریشن سے ہی میں یقین کے حصار میں آ گیا تھا اور ویسے بھی اولین تاثر ہی حقیقی اور دیرپا ہوتا ہے اور اس پہلی لازوال حقیقت کو میں کیسے فراموش کرسکتا ہوں جب تم نے میرے سامنے لفظوں کو نغمگی بخشی: ’’ایسی بھی کیا جلدی!‘‘ لفظوں کے یہی وہ پہلے پھول تھے جو تم نے مسکراتے ہوئے بکھیرے تھے۔ تمہاری وہ مسکراہٹ!......کلی بھی ویسی کم کم مسکائی ہوگی۔‘‘-- صاحبِ علم مرد کی ذات سے ایک عاشق نے انگڑائی لی۔

’’ہاں! مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا!!...... یونیورسٹی کے گلوں بھرے سبزہ زار میں ہم آخری دن کی افسردگی کی بارش میں بھیگ رہے تھے۔ دو سال کی رفاقت کے حسین لمحات کو گھڑیوں کی گٹھڑی میں سمیٹا جا رہا تھا کہ تم نے ہی رخصت ہونے میں پہل کی تھی۔‘‘---

باذوق خاتون لمحوں کے پھولوں پر یادوں کی قطرہ قطرہ شبنم برسا رہی تھی۔

’’ایک یہی تو بڑا عیب ہے ان چاہنے والوں میں کہ کم بخت بڑے جلد باز ہوتے ہیں۔‘‘

اور دونوں کے دھیمے دھیمے قہقہے کمرے کی دیواروں سے سر پھوڑنے لگے۔

’’کبھی کبھی تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہم کتنے دھوکے باز، مکار، فریبی اور منافق قسم کی مخلوق ہیں!‘‘

’’وہ کیسے؟‘‘

’’وہ ایسے کہ تم اپنی بیوی کے ساتھ اور میں اپنے میاں کے ساتھ دھوکہ کر رہی ہوں، یہ منافقت نہیں تو اور کیا ہے؟‘‘

’’شاید......!‘‘ وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔

’’لیکن محبت......محبت جو دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہے وہ کیا ہوئی؟‘‘

’’یہ سچائی اس وقت تک عظیم ہے جب تک اس میں ہوس، لالچ اور لوبھ کی کھوٹ نہ ہو۔ کیا ہم اس کھوٹ سے پاک ہیں؟ بولو!‘‘

’’ہم بہر حال انسان ہیں۔‘‘

’’اچھا اگر جنس کو محبت سے منہا کر دیا جائے تو پھر اس صورت میں بھی کھوٹ باقی رہے گی؟‘‘

’’اگرچہ یہ ہے بہت مشکل لیکن ناممکن نہیں اور پھر وہ محبت جس میں جنسی آلودگی شامل نہ ہو وہ ہے بہت بالیدہ! لیکن ہم اپنی زندگی کے ساتھیوں کے مجرم تو پھر بھی رہیں گے۔‘‘

’’یہ سب سماجی جبر ہے، کتنا المیہ، کیسا ستم!! کہ ہم زندگی کی روشن روشن باتیں دن کی روشنی میں کہیں بھی نہیں کر سکتے۔‘‘------ کمرہ ہوکے اور آہوں سے گرم ہو رہا تھا۔

’’کب آنا ہے تمہارے ’’اس‘‘ نے کراچی سے؟‘‘

’’شاید......کل پرسوں تک۔‘‘

’’اچھا تم یہ بتاؤ کہ اس کا رویہ تمہارے ساتھ کیسا ہے؟‘‘

’’ایک دم اچھا۔ میں جو کہوں اسے وہ پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔‘‘

’’ویری سَیڈ۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘

’’مطلب یہ کہ ایسے مخلص اور پیارے سے......‘‘

’’یہی تو میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر تم میں ایسی وہ کیا اضافی خوبی ہے جو میرے شوہر میں نہیں۔‘‘

’’اور پھر تمہارے دو ننھے مُنے خوبصورت بچے؟‘‘

’’تمہارے بھی تو ہیں۔‘‘

’’پھر......پھر یہ سب کچھ کیوں کر ہوا؟‘‘

’’جسے ہم محبت کہتے ہیں، وہ بہت سفّاک جذبہ ہے، بہت وحشی، بہت شہ زور!! تم جو مجھے اپنی آرزو کہتے تھے تو میں تمہارے وجود میں یا پھر اپنے آپ میں اک حسرت بن کر دفن ہوگئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کب میں نے شوہر کے اعتماد اور ممتا کو جفا کا نشہ پلا کر سلا دیا؟ کب مجھ میں یونیورسٹی کی ادب کی طالبہ بیدار ہوگئی؟ ویسے میں اب تک سوچتی

ہوں کہ کوئی قیامت تو نہیں آ جانی تھی اگر تمہارے معاملے میں میرے والدین اثبات کا رویہ اختیار کرتے۔لیکن شاید انہیں کوئی انٹلکچول اور مفکر قسم کا داماد نہیں چاہیے تھا۔وہ تو چاہتے تھے کوئی بیورو کریٹ،کوئی سہگل ٹائپ بزنس مین اور بس......!بزنس مین......؟......ہونہہ!ہر جذبے اور ہر سوچ کو اشرفیوں میں تولنے والا پتھر آدمی......!''

''تم اپنے شوہر کی توہین کر رہی ہو۔''

''اور جو میری توہین کی گئی مجھ پہ بھروسہ نہ کر کے؟۔میں اکثر سوچتی ہوں شمس کہ ہمارے معاشرتی رویوں میں اور کہیں استقلال ہو نہ ہو لیکن عورت کے معاملے میں شاید ہمارے تمام مکاتیبِ فکر کا اس سوچ پہ اجماع ہے کہ عورت بھروسے کے،اعتماد کے لائق نہیں اور پھر عورت سے فہم و ادراک اور علم و حکمت کی توقع تو کی ہی نہیں جا سکتی۔''

''ہاں کرن سچ کہتی ہو تم......یہ معاشرہ مردوں کا معاشرہ ہے۔اگر عورت کو چیزے دیگر نہ سمجھا جائے تو وہ ہر میدان میں معرکے سر کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔''

''ایسا ہو تب ہے ناں۔''

''دنیا میں صرف دو المیے ہوتے ہیں کرن......!''

''کون سے؟''

''ایک یہ کہ آدمی کو وہ نہ ملے جو وہ چاہتا ہے اور دوسرا یہ کہ وہ مل جائے۔''

''اُف......دو بج گئے۔''

''کہاں؟''

''ادھر دیواری گھڑی پر۔''

''نو......!یار یہ وقت کی نبض اتنی تیز کیوں چل رہی ہے؟''

''اسے بھی محبت کا بخار چڑھا ہوا ہے۔''

''ہماری زندگیوں کا دارومدار وقت کی رحم دلی پر ہے۔کوئی نہیں جو وقت کی باگیں کھینچے،کوئی نہیں جو اِسے کہے یار ذرا آہستہ......!''

اچھا تم کوئی اور بات کرو۔''

''کیا؟''

''وہ محبت اور ادب سے ہٹ کر ہونی چاہیے۔''

''اچھا......اوں......ہوں......نہیں یار......ایسا نہیں ہو سکتا۔ہم محبت اور ادب کے بغیر صفر ہیں۔''

''چلو یوں ہی سہی۔تم کوئی شعر ویر سناؤ۔''

''شعروں ویروں کو چھوڑو۔میں تمہیں ایک گیت سناتا ہوں۔ایک نغمہ......!''

''نغمہ......!یاد ہے تمہیں شمس کہ پروفیسر سارنگ نے ہمیں موسیقی اور شاعری پر ایک خصوصی لیکچر دیا تھا۔پتہ نہیں کس کا حوالہ تھا؟شاید......مولانا ابوالکلام آزاد کا......!''

''جن کا پورے بتیس چونتیس صفحات کا ایک خط موسیقی کے بارے میں ہے......غبارِ خاطر کا آخری خط......!''

''ہاں،ہاں......اسی خط میں مولانا نے کہیں یہ بات لکھی کہ طبیعت کا توازن اور فکر کی لطافت بغیر موسیقی کی ممارست کے حاصل نہیں ہو سکتی......''

''کیا وہ فی الواقع مولوی تھے؟''

''پتہ نہیں تھے یا نہیں پر انہوں نے خدا لگتی باتیں کہی تھیں کہ نغمہ بھی ایک شعر ہے لیکن اسے حرف و لفظ کا بھیس نہیں ملا،اس نے اپنی روحِ معنی کے لئے نواؤں کا بھیس تیا کر لیا......''

''یار......یہ مولانا آزاد کہاں سے ٹپک پڑے؟ چلو تم گیت سنو......وہ والا نہیں کہ کون سا گیت سنو گی انجم......بلکہ یہ تو نصرت فتح علی نے گایا ہے،بھئی کمال کی کمپوزنگ ہے!

سانوں اک پل چین نہ آوے سجناں تیرے بناں
دل کملا ڈُب ڈُب جاوے سجناں تیرے بناں
ہوکے ہاڑے ہجر تے اتھرو دے گیا یار سوغاتاں
مُڑ نہ آئے دل دے محرم بیت گیاں برساتاں

''اور وہ سلمان شاہ کی گائی ہوئی بابا بلھے شاہ کی وہ کافی تم نے نہیں سنی:

اساں کو عشق مریندا ڈھولن ول ول قتل کریندا

''بھئی مجھے تو وہ بہت پسند ہے......وہ......یار......کیا ہے......ہاں:

یار ڈاہڈھی آتش عشق نے لائی ہے
اساں کوں ہو گئی بے اختیاری
سینے دے وچ نہ سمائی ہے

''ہر لے کا اپنا ایک حُسن اور ابلاغ ہوتا ہے۔''----وہ دونوں اپنی اپنی پسند سے اپنی شدت کا اظہار کر رہے تھے۔ایک سراپا ہجر......ایک سراپا سوز......!!

''اللہ اکبر......اللہ اکبر!!''----دور پار سے آواز آئی۔

''زندگی صبح کی اذاں تک ہے......''

’’کبھی کسی کو مکمل زندگی ملی بھی ہے......زندگی تو رہی ایک طرف مکمل خوشی بلکہ مکمل غم بھی کسی کو نہیں ملا اور یہ زندگی......ہم نے اپنے اپنے روز وشب کو زندگی سمجھ رکھا ہے۔ ہماری سوئی اپنی ذات کے ریکارڈ پلے پر ہی اٹکی رہتی ہے۔ہم اپنی ذات کے حصار سے نکل کر دیکھیں تو یہ کائنات بہت وسیع لگے، جہاں ایک طرف انسان مختلف سیاسی، سماجی، معاشی اور روحانی مسائل سے دوچار ہے تو دوسری طرف سائنس اور ٹیکنالوجی سورج کو کھینچ کر فرش نشیں کرنے میں جُتی ہوئی ہے اور پھر یہ الیکٹرانک میڈیا......؟ دنیا سمٹ کر ڈرائنگ روم، بلکہ انسانی آنکھ کی دو پُتلیوں میں آبسی ہے۔اس کے باوجود انسان کتنا تنہا ہوتا جا رہا ہے۔

’’کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں......!‘‘

’’جتنا کسی نے اپنے آپ سمجھا ہے، جانا ہے، جتنی خود آگاہی حاصل کی ہے اتنا ہی وہ یکّا و تنہا ہوا ہے۔‘‘

’’گویا آگہی سب سے بڑا عذاب ہے۔‘‘

’’یقیناً......لیکن اس عذاب سے گزرنا ضروری ہوتا ہے اور یہ عذاب وہ عظیم روحانی تجربہ ہے جس سے گزر کر انسان صحیح معنوں میں کندن بنتا ہے......ایک کھرا انسان......سب آلائشوں سے پاک!!‘‘

’’لا اِلہ الا اللہ......!‘‘

’’لگتا ہے ہمارا وقت پورا ہو گیا ہے۔‘‘

’’ہاں......شاید......ہماری حالت اس بوڑھے غبی طالب علم کی سی ہے جو معلمِ عصر کے ہاتھوں طمانچے کھا کھا کر ڈھیٹ بن جاتا ہے اور پھر کتابِ زندگی سے جہالت، کینہ، بُغض، عناد، لُوٹ کھسوٹ، ریاکاری جیسے الفاظ کے معنی و مطالب جاننے کی کوشش میں انہیں دانتوں میں چباتا رہتا ہے، پیتا رہتا ہے اور اپنی مُٹھیاں بھینچ بھینچ کر ہوا میں لہراتا رہتا ہے۔ محض خالی خولی وقت پر غصہ نکالتا رہتا ہے۔ وقت......؟ اے وقت، اے یارِ مہربان!! ہم ایسے محبت زدہ ’’بوڑھوں‘‘ پر تیرا یہ احسان کیا کم ہے کہ تُو نے اپنے لمحوں کے خزانوں میں سے قرنوں پہ بھاری ایک رات ہمیں بھی تحفے کے طور پر بخش دی۔ ہم نے یہ خزانہ، یہ تحفہ ضائع تو نہیں کیا۔ اے وقت۔ اے یارِ مہربان!!......پھر کب؟......کبھی تو پھر مہربان ہونا۔‘‘ ہوکے، آہوں اور حسرتوں سے اب کمرہ ناک ناک ڈوب چلا تھا۔

’’اچھا تو میں چلتا ہوں......لیکن وہ ایک بات......جو ابھی باقی ہے......ہزار باتوں پہ بھاری ایک بات!......اس کے کہنے کے لیے تو صدیاں درکار ہیں......اے زمانے......اے وقت......اے عصر......تو کیا کوئی امید رکھوں......شاید......شاید......اچھا خدا حافظ......‘‘

وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا۔’’خدا ہی حافظ!!‘‘ لفظ لرز رہے تھے۔وہی دروازہ تھا۔ دروازے پر اسی طرح اندھیرے کا پہرہ تھا پر اب اس دروازے میں اسے الوداع کہنے کے لیے صرف ایک ہیولا کھڑا تھا......باہر ابھی تک سنّاٹا تھا......دور پار کہیں روشنی کے آثار نظر آ رہے تھے۔

جان عالم (مانسہرہ)

ڈر

الائی سے اُوپر سات گھنٹے مسلسل پیدل سفر اور پیٹھ پر لدے سامان نے ہم چاروں کو تقریباً نڈھال کر دیا تھا۔سردی اور گھٹن ہمارے ساتھ ساتھ بڑھ رہی تھی۔ ہم نہ چاہتے ہوئے بھی آگے بڑھنے پر مجبور تھے۔الائی سے نکلتے وقت ہمیں لوگوں نے یہی بتایا تھا کہ اس طرف سے آگے جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ سردی اور بلندی کی وجہ سے یہاں شکار بھی کم ملتا ہے اور پھر اس راستے میں صرف ایک ہی ریسٹ ہاؤس ہے۔اور وہ ریسٹ ہاؤس بہت دُور ہے۔

اس علاقے سے عجیب عجیب روایات منسوب تھیں۔بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ کوہستان کے اس ویران علاقے میں ابوجہل کے بیٹے کو ایک بڑے پرندے نے آکر اتارا تھا۔ پھر اس نے ایک پری سے شادی کی اور یہاں کی آبادی اسی کی نسل ہے۔بعض لوگ کہتے کہ یہ علاقہ دیو پریوں کا علاقہ ہے۔اس طرف آنے والوں کو عجیب قسم کے حالات وواقعات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

میں نے اس علاقے کی اسی الف لیلوی پراسراریت سے متاثر ہو کر اپنے دوستوں کو آمادہ کیا تھا کہ اس دفعہ ہم اس علاقے کی سیر کو جائیں گے۔اور اب اُن سے زیادہ میں خود پشیمان تھا۔

عجیب خاموش سی فضا تھی۔ ہم چاروں تقریباً ایک گھنٹے سے بغیر کچھ کہے سنے چل رہے تھے۔ ہمارے درمیان ایسی خاموشی صرف اسی وقت حائل رہا کرتی جب کسی موضوع پر دو دوست آپس میں لڑ پڑتے اور باقی دو کھل کر کسی کی طرفداری نہ کر سکتے۔ ورنہ اتنی دیر کی خاموشی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔لیکن اُس دن نجانے ایسا کیا تھا کہ ہم ایک گھنٹے سے چل رہے تھے اور کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔

سورج پہاڑ کی چوٹی سے دوسری طرف اترا تو شام کے سائے ہماری طرف بڑھنے لگے۔ ہم ایک دوسرے کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ایک انجانا سا خوف تھا۔ جب انسان ایک دوسرے سے ڈرنے لگے تو ڈر کتنا طاقتور ہو جاتا ہے۔ ہمارے چاروں طرف ڈر نے مضبوط گھیرا ڈال رکھا تھا۔ جیسے کوئی ہمیں گن پوائنٹ پر آگے بڑھنے پر مجبور کر رہا تھا۔

’’کیا بات ہے؟ اگر تھک گئے ہو تو تھوڑا بیٹھ جاتے ہیں۔‘‘ میں نے اچانک پیچھے مڑ کر اُن پر آواز پھینکی تو وہ تینوں

ڈری ہوئی بکریوں کی طرح میری آواز سے بچے اور کوئی جواب دئے بغیر آگے بڑھنے لگے۔

ٹارچ سب سے پیچھے والے کے ہاتھ میں تھی اور میں سب سے آگے تھا۔ درخت عجیب عجیب شکلیں بنا رہے تھے۔ اور میرے دوستوں کے ہیولے بھی جیسے مجھ پر جھپٹ رہے تھے۔ میں نے اچانک مڑ کر سب کو روک دیا؛

''ٹھیک ہے....ٹھیک ہے۔ سب میری غلطی ہے۔ میری ضد تھی کہ اس طرف جائیں گے۔ میری ہی ضد تھی کہ راستے میں نہیں رکیں گے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم لوگ احتجاجاً چلتے ہی رہو۔ اگر تم رکنا چاہتے ہو تو بتاؤ......!'' کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر تیمور نے ناراض سے لہجے میں کہا؛

''نہ تو ہمیں ریسٹ ہاؤس کا پتا ہے اور نہ ہی یہ کہ ابھی اور کتنا چلنا پڑے گا۔''

''شاہ! تم بھی کچھ کہو۔'' میں نے نصیر شاہ کو بھی گفتگو کے الاؤ میں پھینک دیا۔ تا کہ کچھ آگ بھڑکے اور ڈر جلے۔ نصیر شاہ درویش بندہ تھا۔ اُس نے کبھی کچھ کہا ہی نہیں۔ بس جہاں جانا ہے تو جانا ہے، جو کرنا ہے تو کرنا ہے...دوستوں کے لئے اُس نے ہمیشہ اپنی رائے اور وقت کی قربانی دی ہے۔

''اگر رکنا ہے تو رک لیتے ہیں۔ ویسے ابھی چل سکتے ہیں ہم۔'' شاہ نے گویا آگے چلنے کا مشورہ بھی دے دیا۔ دوسرے دونوں ساتھی خاموشی سے چلتے رہے۔ ڈر اب بھی ساتھ تھا لیکن ہماری پیٹھ پر لدے سامان سے اتر گیا تھا۔ ہم بڑے بڑے قدم اٹھاتے آگے بڑھ رہے تھے۔

''نو بج چکے ہیں۔ تھوڑا رکتے ہیں اور کچھ کھا لیتے ہیں۔'' تیمور نے اچانک رک کر فیصلہ کن انداز میں اپنی پیٹھ سے ڈر سمیت سامان اتار پھینکا۔ ہم سب بھی بیٹھ گئے۔ ہوا چیخ رہی تھی۔ ہم نے کچھ سینڈوچ وغیرہ لئے، پانی پیا اور سامان اٹھا کر دوبارہ آگے بڑھنے لگے۔ ہوا کی نمی اور کہر میں رات بھیگنے لگی۔

''وہ........! وہ سامنے دیکھو.......!!'' چوتھے کی آواز پہلی دفعہ سنائی دی۔ وہ تقریباً چیخا تھا۔

پہاڑ کی چوٹی پر لکڑی کا بنا ہوا چھوٹا سا ہٹ دیکھ کر سب کی آنکھیں حیرت اور خوشی سے پھیل گئیں۔

''یہ........!! یہ........ریسٹ ہاؤس ہے؟''

''ہاں ہاں! ریسٹ ہاؤس ہی ہوگا۔''

''یہاں کون ہوگا؟''

''چلو دیکھتے ہیں جا کر۔ اگر کوئی نہ ہوا تو بھی ہم یہیں رہیں گے۔'' میں نے اُن کے سوالوں کا ایک ہی جواب دیا۔ اور ہم سب ریسٹ ہاؤس کی جانب بڑھنے لگے۔

دروازے پر دستک دیتے ہوئے مجھے عجیب سا خوف محسوس ہوا۔ کہیں اندر سے میری آواز نکلی اور بند دروازے کے اندر دھنستی چلی گئی۔

''کوئی ہے....!! کوئی ہے....؟ ہے....ہے....!! دروازہ کھولو...!! کھولو..کھولو...!'' پہلے روشنی دروازے کی درزوں

سے جھانکی اور پھر ایک کراہ کے ساتھ بوڑھا دروازہ کھلا۔ سب کی سانسیں رک گئیں۔ دروازے میں ڈر کھڑا تھا۔ میلی شاڑھی میں اُس کی سفید داڑھی پر جب چراغ کی روشنی کے چھینٹے پڑے تو اُس کی ایک آنکھ نے ہم چاروں کو ایک ساتھ دیکھا۔

''کون ہو تم.....؟ کہاں سے آئے ہو...؟ اور یہ کوئی وقت ہے آنے کا؟''

''مسافر......!''

''یہاں کیوں آئے ہو؟''

''بابا! ہم تھک گئے ہیں۔ رات گزارنی ہے۔ کیا جگہ مل جائے گی؟''

میں نے اس کے سوالوں پر اپنے سوال کا عصا پھینکا۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے...آ جاؤ۔ لیکن رات جاگ کر گزارنی ہوگی۔ میرے پاس صرف ایک چارپائی ہے اور وہ میری ہے۔'' اُس کا لہجہ عجیب سا تھا۔

''یہ ریسٹ ہاؤس ہے کیا؟'' تیمور نے بابا سے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں.....! لیکن یہاں ریسٹ نہیں ملتا۔'' بابا کے معنی خیز لہجے نے سب کو ڈرا دیا۔

ہم نے اپنا سامان رکھا، جوتے اتارے اور لپٹے ہوئے ٹاٹ کو زمین پر بچھا دیا۔ ہم سردی سے کانپ رہے تھے۔

''آگ جلا دو بابا!......اور کیا چائے ملے گی...؟ صبح ہم تمہیں خوش..........!!''

''تم مجھے کیا خوش کرو گے؟ تمہارے پاس ہے ہی کیا۔ اگر میں تمہیں جگہ نہ دیتا؟'' وہ اچانک مسکرایا اور ہماری جان میں جان آئی۔ وہ اٹھ کر اکلوتے کمرے کے عقبی دروازے میں غائب ہو گیا۔ ہم چاروں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ لیکن کوئی بولا نہیں۔ وہ واپس آیا تو اُس کے ہاتھوں میں لکڑیوں کا ایک گٹھا تھا۔ اُسے دیکھ کر مجھے وہ کہانی یاد آنے لگی جس میں بوڑھا باپ اپنے چاروں بیٹوں کو بلا کر لکڑی کا گٹھا دیتا ہے اور کہتا ہے اسے توڑو۔ پھر وہ جب نہیں توڑ سکتے تو وہ لکڑی کے گٹھے کو کھول کر ایک ایک لکڑی توڑنے کا کہتا ہے ...تو وہ آسانی سے توڑ دیتے ہیں.......!!

بابا انگیٹھی میں ایک ایک لکڑی ڈال کر انہیں جلانے کی کوشش کرنے لگا۔ کمرے میں دھواں بھر گیا۔ آنکھیں جلنے لگیں اور ....پھر سارا کمرہ روشن ہو گیا۔ سب کو آگ نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ بابا کا چہرہ اب اجنبی نہ رہا۔ اور نہ ہی اُس کی اکلوتی آنکھ سے اب ڈر لگتا تھا۔ چائے پیتے ہوئے میں نے بابا سے بے تکلف ہوتے ہوئے پوچھا؛ ''بابا! آپ کی عمر کیا ہے اور آپ کب سے ادھر ہیں؟''

''پتا نہیں۔ تاریخ تو یاد نہیں لیکن میں ایک زمانے سے ادھر ہی ہوں۔ تم اس طرف کیوں آئے ہو کیا لینا ہے تمہیں؟ ادھر تو کچھ بھی نہیں ہے.......تمہیں کسی نے روکا نہیں تھا کہ اس طرف آنا ٹھیک نہیں؟''

''بابا! تم اکیلے اس جگہ رہ سکتے ہو تو ہمارا آنا کیوں ٹھیک نہیں؟'' تیمور نے اپنی وکالت جھاڑی۔

بابا مسکرایا........ ''ہاں ٹھیک کہتے ہو۔ تمہیں اس طرف آنا چاہیے تھا۔ تم بے چین روحوں کو ایسی جگہ سے کچھ نہ کچھ مل سکتا ہے۔ میں بھی تمہاری ہی طرح کا جوان تھا.....!''

''بابا! اپنی زندگی کے بارے میں کچھ سناؤ۔ رات کا باقی حصہ ہمارے ساتھ تم بھی جاگ کر گزارو۔'' میں نے بابا کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تھوڑی بے تکلفی سے کہا تو بابا کی جھریوں نے اُس کے چہرے پر اور لکیریں ماردیں۔ بابا مسکرارہا تھا۔

''میں الائی گاؤں میں رہتا تھا۔ میرے باپ نے اپنے باپ کی دشمنی نبھاتے ہوئے تین قتل کئے تھے۔ اور میرا باپ خود بھی اسی دشمنی میں مارا گیا۔ مجھے اپنے باپ کے قاتلوں کو مارنا تھا اور خود کو اُن سے بچانا بھی تھا۔ اس لئے میں بہت محتاط رہا کرتا تھا۔ اسلحہ تو ویسے بھی اس علاقے والوں کا زیور ہے۔ میرے پاس ہر وقت بھرا ہوا طمنچہ رہتا۔'' بابا سانس لینے کے لئے رکا تو چوتھے نے بے چین ہو کر پوچھا: ''پھر کیا ہوا بابا!''

''میں اُن دنوں بے روزگار تھا۔ آٹھ جماعت تک پڑھایا تھا مجھے میرے باپ نے۔ گاؤں میں مجھ سے زیادہ پڑھا لکھا کوئی نہ تھا۔ دشمنوں کے ڈر کی وجہ سے میرے باپ نے مجھے مانسہرہ بھجوادیا۔ اور مجھے ایک کوہستانی مہاجر خاندان کے ہاں رہنا پڑا۔ میں بھی اُن دنوں تمہاری طرح ہر اُس چیز کی کھوج میں لگا رہتا تھا جو عجیب ہوتی یا جسے ذہن تسلیم نہ کرتا۔''

''پھر...؟'' چوتھے ساتھی کی بے قراری دوبارہ اُبلی۔

''بتاتا ہوں۔ مجھے ایک سگریٹ دو۔'' میں نے دہکتے ہوئے انگارے سے سگریٹ سلگایا اور دھویں کے بھبکے کے ساتھ اُسے دیا تو وہ ایک گہرا کش لگا کر بولا۔

''وہ تمہاری ہی طرح چار تھے۔ الائی میں جب اُن کی ملاقات مجھ سے ہوئی تو انہوں نے کہا کہ وہ اوپر جانا چاہتے ہیں اور انہیں اس علاقے کا کوئی بندہ گائیڈ چاہیے۔ انہوں نے بھی مجھے تمہاری ہی طرح خوش کرنے کا لالچ دیا تھا''

''پھر۔۔۔۔۔۔۔۔؟''

پھر میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ راستے میں انہوں نے بہت سی جگہ پڑاؤ ڈالا۔ وہ جہاں رُکتے کام کرتے۔''

''کیا۔۔۔۔؟'' تیمور بے صبری سے بولا۔

ان میں سے ایک شخص کسی سفوف کو جلاتا۔ ایک عجیب سی بو پھیلتی اور پھر۔۔۔پھر۔۔۔''

''پھر کیا۔۔۔؟''

''پھر ہر طرف سانپ نکل آتے۔ حالانکہ اس علاقے میں سانپ نہیں پائے جاتے۔''

''وہ ان سانپوں کو پکڑتے تھے؟'' تیمور نے پوچھا۔

''نہیں۔ وہ صرف ایک خاص قسم کے نیلے سانپ کو ہی پکڑتے تھے۔ اس کی آنکھیں بھی نیلی ہوتی تھیں۔ وہ اسی راستے میں سفوف جلاتے اور نیلے سانپ کو پکڑتے۔ پھر وہ اس سانپ کی آنکھیں نکال کر اس کا سُرما بناتے اور پھر اپنی آنکھوں میں لگاتے۔ میں نے کئی بار انہیں ایسا کرتے دیکھا تو تجسس پیدا ہوا کہ یہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ میرے استفسار پر انہوں نے کہا کہ تم اپنے کام سے کام رکھو۔ پھر ایک دن مجھے غصہ آیا اور میں نے اُن پر پستول تان لیا اور انہیں کہا کہ میری آنکھ میں یہ سرمہ لگاؤ۔ انہوں نے مجبوراً میری ایک آنکھ میں سلائی پھیر دی۔ مجھے اس آنکھ سے زمین کے اندر بھی سب کچھ نظر آنے لگا۔''

''پھر۔۔۔۔۔۔؟؟''

''پھر۔۔۔بابا! پھر کیا ہوا۔۔۔؟؟''

''پھر جب صبح اُٹھا تو وہاں وہ چاروں نہیں تھے اور میری وہ آنکھ بھی نہیں تھی جس میں سرمہ لگایا تھا۔''

تیز ہوا کے جھونکے نے اچانک آگ بجھا دی۔ کمرے میں اندھیرا بھر گیا۔ میں نے اوورکوٹ کی جیب سے ٹارچ نکال کر جلائی تو حیرت سے چاروں کی آنکھیں اُبل پڑیں۔ پہاڑ کی چوٹی پر ہم چاروں بیٹھے تھے۔ وہاں ریسٹ ہاؤس تھا، نہ ایک آنکھ والا بابا۔

☆☆☆

بیاکل من اور دُکھی آتما کے ساتھ وہ دیر تک آنکھیں موندے گم سم بیٹھا رہا۔ اس سمے جنم کے دھیان نے اسے بہت دکھی اور بیاکل کر دیا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کا دھیان پچھلے جنموں کی اور ہو گیا۔ دھیرے دھیرے اسے لگا کہ لاکھ برس سامنے آ کھڑے ہوئے ہیں، اپنے ان گنت جنموں کے سنگ، دھیان ہی دھیان میں وہ الٹے پاؤں چلنے لگا۔ اس جنم سے پچھلے جنم میں، پچھلے جنم سے اور پچھلے جنم میں، پھر اور پچھلے جنم میں۔ دھیان ہی دھیان میں اس پر سارے جنم بیت گئے اور اس نے دیکھا کہ وہ بنارس کے مرگھٹ کی چوکھٹ پہ کھڑا ہے۔ وہ چونک پڑا۔

(**انتظار حسین** کے افسانہ **واپس** سے اقتباس)

چھٹی پر گھر آیا تو تایا جان کہنے لگے بیٹے تمہارے پھوپھا نے تمہیں کہاں جھونک دیا۔ وہ تو سارا ہندوؤں کا علاقہ ہے۔ اوپر سے گونڈ بھیل اور جنگل کی نوکری۔ تمہیں ڈر نہیں لگتا۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ واقعی اُن دنوں مجھے ڈر نہیں لگتا تھا۔ اس کے باوجود کہ میں وہاں اکیلا مسلمان تھا، یقین جانو مجھے بالکل ڈر نہیں لگتا تھا۔ مگر اب لگتا ہے۔۔۔۔۔ اور مسلمانوں سے۔

چپ ہوئے، ٹھنڈا سانس بھرا ''کیا زمانہ آیا ہے، مسلمان۔ مسلمان سے ڈرتا ہے''۔

(**انتظار حسین** کے افسانہ **گونڈوں کا جنگل** سے اقتباس)

ڈاکٹر بلند اقبال (امریکہ)

پُراسرار مسکراہٹ

بس آنکھیں بند ہونے کی بات تو تھی کچھ ہی دیر میں گھپ تاریکی چھٹنے لگی۔ رقیہ کو یوں لگا جیسے اُس کی سیڈول بانہوں پر سرکتے ہوئے ہاتھوں کا لمس اچانک ایک انجانے مرد کی شکل میں ڈھلنے لگا۔ پہلے پہل تو آنکھیں بنی، نیم دراز گھنی پلکوں کے پیچھے چُھپی ہوئی کنچی سی آنکھیں، جن کی شربتی رنگوں کی جھیل میں رقیہ کے سُلگتے ہوئے ارمانوں کی ناؤ ہچکولے کھاتے ہوئے ڈوبنے لگی، پھر جلد ہی ستواں سی ناک، ٹھوڑی پر چراغ، ہونٹوں پر دبیز مسکراہٹ اور گالوں پر چھوٹا گُم سم سا گڑھا، جو رقیہ کے سلگتے ہوئے ارمانوں کو خود میں سمیٹ کر اُس کی اُدھوری خواہشوں سے بھرنے لگا۔ گرم ہونٹوں کی تمازت سے جب رقیہ کے ہونٹ جلنے لگے تو اُس کا خوابوں کا شہزادہ ایک نئے روپ میں اُس کے سامنے اُبھرنے لگا، وہ کبھی کسی یونانی دیوتا کی مردانہ حُسن کی خیالی شکل میں ڈھل کر اُس کے پیاسے ہونٹوں کو بے تحاشہ چومنے لگتا تو کبھی کسی دیومالائی کہانی کا لافانی کردار بن کر اُس کے چہرے کو اپنے گرم بوسوں سے گُل گُلنار کرنے لگتا۔ گھنی زلفوں میں جو انگلیاں سرکنے لگتیں تو رقیہ کا خیال رنگوں کی دھنک بن کر اُس کو ایک اَن دیکھی دنیا میں لے آتا جہاں اُس کے خوابوں کا حسین شہزادہ اپنی دونوں بانہیں دراز کیے اُس کی بکھری ہوئی زلفوں کو اُس کے سارے بدن کے ساتھ خود میں سمیٹ لیتا۔ حسن و عشق کی یہ مدہوش کیفیت رقیہ کے بدن میں کبھی آگ بن کر جلنے لگتی تو کبھی ٹھنڈک بن کر اُس کی روح میں اُترنے لگتی۔۔۔اور پھر اک نشہ سا رقیہ کے سارے بدن میں اُترنے لگتاااور وہ دھیمے دھیمے اپنے اَن دیکھے محبوب کے بازوؤں میں کانپنے لگتی۔

رقیہ تو کبھی بھی نہیں چاہتی تھی کہ وہ رنگ و بُو کی اس مدہوش کیفیت سے باہر آئے مگر قیوم میاں کی رات بھر کی منہ کی بِساند اور جلے ہوئے تمباکو کے بھبکوں سے اُسکے خوابیدہ احساس متلانے لگے اور وہ شدید کرب سے اپنے پاس پڑے ہوئے اُس بے ہنگم شخص کو نیم بند آنکھوں سے بیزاری کے ساتھ تکنے لگی جس کے ساتھ وہ ساری رات حُسن و عشق کی ہولی کھلیتی رہی تھی۔۔قیوم میاں۔۔اُس کے شوہر۔۔۔اُس کے یونانی دیوتا۔۔جن کا قد ساڑھے پانچ فٹ اور پیٹ سوا تین فٹ تھا۔ جن کا رنگ اُس کی دیومالائی کہانی کے کسی بھیانک جن کی طرح تھا جو اندھیرے میں نظر نہیں آتا تھا۔ جن کی زُلفیں اس کے خوابوں کے حسین شہزادے کی طرح نہیں بلکہ کسی اُجڑے ہوئے کھلیان کی طرح تھیں جہاں برسوں سے سوکھا پڑا تھا۔ جن کے رومانی چہرے کو چیچک کے داغوں نے اور بھی بدشکل بنا دیا تھا۔۔۔قیوم میاں۔۔۔اُس کے سرتاج۔۔جن کے ساتھ وہ اپنی بھری جوانی کی مہکتی ہوئی روشن

راتیں کالی کر رہی تھی۔ اونہہ۔۔رقیہ نے کوفت سے آنکھیں بند کر لی اور پھر سے اپنے کھوئے ہوئے خوابوں کے شہزادے کو اندھیرے میں ٹٹولنے کی کوشش کی مگر قیوم میاں کا غلیظ سراپا اُس کے سامنے بے ہنگم انداز میں ناچنے لگا۔ رقیہ نے تھک ہار کر آنکھیں کھول دیں اور پھر لحاف چھوڑ کر کچھ دیر تو بستر پر بیٹھے بیٹھے بیڈروم کی دیواروں کو تکتی رہی مگر پھر بیزارگی کے ساتھ بیڈروم سے نکل گئی اور دالان میں چلی آئی۔

چڑیوں کی چہچہاہٹ سے فضا میں خوشگوار سی موسیقیت رچی ہوئی تھی۔ سورج کی پہلی کرن صحن سے چوری چوری اندھیرا چُرا رہی تھی۔ رات کی رانی کی خوشبو ابھی تک صحن سے دالان تک بسی ہوئی تھی۔ رقیہ نے دونوں ہاتھ پھیلا کر ایک لمبی سی جمائی لی اور پھر قریب ہی تپائی پر پڑے ہوئے بے ترتیب اخبار سمیٹنے لگی۔۔اچانک رقیہ کی نظر ایک باسی خبر پر لمحے بھر کے لیے اٹکی۔۔تھانہ شہزاد پور کے علاقہ میں اکیس سالہ تاج بی بی کو اُس کے خاوند خدا بخش نے اُس وقت موت کے گھاٹ اُتار دیا جب وہ اپنے آشنا معشوق علی کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑی گئی۔۔ رقیہ نے ایک پُر سرار مسکراہٹ کے ساتھ پرانے اخبار تپائی کے نیچے کھسکا دیے اور پھر آنکھیں بند کر کے رات کی رانی کی خوشبو کو اپنی گہری سانسوں میں اُتارنے لگی۔

اُس رات بجلی کڑاکے سے گرج رہی تھی، منان دفتر سے آئے، عفت کے ساتھ چائے پی اور پھر شرافت بھائی کے گھر کیرم کی بازی جمانے چلے گئے۔ عفت کو نہ جانے کیوں صبح ہی سے عجیب عجیب سے ہول سے اُٹھ رہے تھے، کئی بار سوچا آج منان کو گھر پہ ہی روک لیں، بچپن ہی سے اُس کا بجلی کے کڑاکوں سے دل دہلنے لگتا تھا۔ دو سے جب تین گھنٹے ہو گئے تو چھاتا لیا اور شرافت بھائی کے گھر کے لیے نکل کھڑی ہوئی، گیٹ بجانے سے پہلے ہی کیا دیکھتی ہے کہ محلے کے دو چار بچے ایک دوسرے کے کندھوں پہ چڑھے، شرافت بھائی کے کمرے کی کھڑکی سے کمرے کے اندر جمی کیرم کی بازی دیکھنے میں مگن تھے، اُس کو اچانک دیکھا تو ایک دوسرے کے پیچھے کودتے پھلانگتے ہوئے بھاگ گئے۔ اُس نے جو پیروں کے بل کھڑے ہو کر کمرے میں جھانکا تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

شرافت بھائی اور منان کچھ اس طرح سے ایک دوسرے میں مشغول تھے کہ کیا کوئی نو بیاہتا شادی شدہ جوڑا آپس میں مصروف ہو۔۔۔اُسے ایسا لگا کہ جیسے آسمان کی ساری ہی گرجتی ہوئی بجلیاں اُس پہ ایک ساتھ گر رہی ہوں اور ہر کڑکڑاہٹ میں اماں جی کی آواز گونج رہی ہو۔۔'یہ مرد ذات بڑی بے وفا ہوئے ہے'۔۔
ہائے اماں جی۔۔مگر یہ کیا۔۔اچانک عفت کے منہ سے نکلا۔۔یہ کیسی بے وفائی ہے؟

(**ڈاکٹر بلند اقبال** کے افسانہ **یہ کیسی بے وفائی** کا اختتامی اقتباس)

سمیرا نقوی (فیصل آباد)

گرداب

وہ خاموشی سے پُل پر آ کر بیٹھ گیا۔۔۔ پکی ہوئی گندم کی باس اُس کی سانسوں میں تحلیل ہو رہی تھی۔۔۔ چند روز، فقط چند روز اور پھر گندم کٹ جائے گی اور اُس کا سنہرا پن زمین پر باقی رہ جائے گا۔ اُس نے نظر بھر کر سر اُٹھاتی سونے جیسی گندم کی بالیوں کو دیکھا جو دانوں کے بوجھ سے دُہری ہو رہی تھیں۔

فضا خاموشی کا سرنامہ تحریر کر رہی تھی۔ اُس سے چند قدم کے فاصلے پہ چلتا ٹیوب ویل بھی جب اچانک بند ہو گیا تو ایک پل کو اُسے اپنی سانسوں کی آواز بھی بوجھ محسوس ہونے لگی۔ بلند پروازوں سے تھکے پرندے اُس کے سر کے قریب سے بغیر شور کیے گزر گئے۔

سورج چوری چوری درختوں کے پیچھے جا چھپا تھا۔۔۔ مگر روشنی ابھی باقی تھی۔ شام ڈھلی نہیں تھی پر ڈھلنے والی تھی۔۔۔ یہی وقت مقرر تھا۔۔۔ اب تک اُنھیں آ جانا چاہیے۔۔۔ یہ سوچ کر اُس نے اپنا رُخ گاؤں سے آنے والے رستے کی طرف پھیر لیا۔۔۔ کسی بھی چہرے پہ جب اُسے شناسائی کی جھلک دِکھائی نہ دی تو وہ اُکتا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

پُل سے ٹیوب ویل تک راستے میں آنے والے درخت گننے لگا۔ کہنہ سال شجر جن پہ بہار میں بھی روئیدگی نہ ہونے کے برابر ہوتی تھی۔ اِن بوڑھے درختوں کے ہر تنے کی چھال چوکور کٹی ہوتی تھی اور کالے رنگ سے اُن پر نمبر تحریر تھے، جیسے جیل میں قیدیوں کے لباس پر ہوتے ہیں 436-915۔ جب چار چکر کاٹ لینے پر وہ درختوں کی گنتی بار بار بھولنے لگا تو تھک کر بیٹھ گیا۔ اب اُس نے آنکھیں موند لیں اور انتظار کے لیے ساعتوں کو بیدار کر دیا۔

دُور دُور تک کوئی چاپ نہیں تھی۔ وہ کچھ دیر یونہی آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔ پاس سے کوئی سائیکل سوار گزرا تو اُس کی شکستہ سائیکل کی کھڑ، کھڑ نے اُس کی آنکھیں کھول دیں۔ ایک بار پھر اُس نے بڑی آس سے اُس رستے کو دیکھا جہاں سے وہ آنے والے تھے۔ ہر چہرے کو دیکھ کر اب وہ التباس کا شکار ہو رہا تھا۔

اُفق پر سرخی سی گھل گئی تھی، پھر اِسی سرخی کو دھیرے دھیرے اندھیرے نے نگل لیا۔ اِکا دُکا آنے

والے کسانوں کی آمد و رفت بھی ختم ہو گئی۔ اب پیڈل پر پیڈل مارتے سائیکل سوار تھے جو قریبی شہر سے محنت مزدوری کر کے لوٹ رہے تھے یا پھر خاموش ہوا تھی اور پتوں کے اشارے تھے۔

''وہ آج بھی نہیں آئے۔۔۔''

وہ آس کا دَر بند نہیں کرنا چاہتا تھا پر جب دُور اُفق پر ایک ستارہ ٹمٹمایا تو اِس کے انتظار نے بھی پر سمیٹ لیے۔

○○○

وہ تعداد میں چار تھے، مگر اُن کے دِل ایک ہی لے میں دھڑکتے تھے۔ ذات پات، برادری کے دائروں میں سمٹے اِس گاؤں میں وہ یک جہتی کی انوکھی مثال تھے۔ اگر ایک چھٹی کرتا تو باقیوں کے بستے بھی سرہانے دھرے رہتے۔۔۔ ماں کا پیار اور باپ کی ڈانٹ بھی اُنھیں سکول جانے پر راضی نہ کر پاتی۔

پھر جیسے ہی سکول کا وقت بیت جاتا تو وہ چاروں گاؤں کی چاروں سمتوں کو ایک کر دیتے۔۔۔ نہر کے پانیوں سے لے کر امرودوں کے باغ تک۔۔۔ وہ کوئی جگہ نہ چھوڑتے۔ جہاں اُن کے چھوٹے چھوٹے پاؤں پیوست نہ ہوتے۔ کچھ بچے شرارتیں پالنوں میں چھوڑ دیتے ہیں اور کچھ بستوں میں ساتھ لیے پھرتے ہیں۔

سکول کی چار دیواری نے کئی سال تک اِن کی شرارتوں کے قصے محفوظ رکھے اور آنے والوں کو سنائے۔

پرائمری پاس کر کے وہ تحصیل کے ہائی سکول میں داخل ہو گئے۔ اب زندگی تھوڑی سی بدل گئی۔ سارا دِن کھیتوں کو پھلانگتے اِن بچوں کے لیے دو میل کا فاصلہ زیادہ تو نہ تھا۔ پر اب اُنھیں صبح سویرے اُٹھنا پڑتا، جب روشنیاں دُھند میں راستہ تلاش کر رہی ہوتیں تب وہ چاروں پل پر اکٹھے ہو کر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے سکول جاتے۔

ایک ہی سکول، ایک ہی بنچ، قربتیں خون کے ساتھ پروان چڑھنے لگیں۔ مڈل کا امتحان پاس کر کے وہ ہائی سکول چلے گئے۔، پہ شرارتیں نہ گئیں، راستے کے سارے درخت اور سنگ ریزے اُن سے پناہ مانگتے۔ نہر کا پانی اُن کی تختیوں کی اُتری ہوئی سیاہیوں سے گدلا رہنے لگا تھا، جب سے ہائی سکول گئے تھے۔ تختیاں اُٹھانے کی مشقت ختم ہو گئی تھی۔

صبح کے وقت وہ سکول جانے والے رستے کے تنہا مسافر تھے۔ واپسی پر تو کافی لوگ اُن کے ساتھ مِل جاتے۔۔۔ پہ وہ چاروں تو خود ہی قافلہ تھے۔ آگے پیچھے چلتے، خود ہی ایک دوسرے کے رہبر تھے۔ اِس ترتیب میں فرق تب آیا جب روز پو پھٹے اُن سے پہلے اپنی ماں کے ساتھ ایک لڑکی پل پر کھڑی ہوتی، جیسے ہی وہ چاروں پُل کے قریب پہنچتے ماں بیٹی کو خدا حافظ کہہ کر گاؤں لوٹ جاتی۔ وہ شاید گاؤں کے سکول سے مڈل پاس کر کے آئی تھی۔ وہ اُن سے دس پندرہ قدم کے فاصلے پر اُن سے آگے چلتی رہتی، وہ پیچھے۔

کچھ روز وہ اُس موضوع پر بات کرنے سے کتراتے رہے، پھر ایک دِن اُس کے منہ سے نکل گیا ''وہ لڑکی!''

بس اِتنا کہنے کی دیر تھی کہ تینوں اُس کے گرد گھیرا ڈال کے بیٹھ گئے اور سوال پر سوال پوچھنے لگے۔

''کون ہے؟
کہاں سے آتی ہے؟
کس کی بیٹی ہے؟''

اور وہ بیچارہ ایک لفظ منہ سے نکال کر پچھتا رہا تھا۔ ڈور کی طرح اُس لمحے کو واپس لپیٹنا چاہ رہا تھا، جب اُس نے کہا! ''وہ لڑکی''۔ جانتا وہ بھی کچھ نہ تھا۔۔۔ وہ تو پوچھنا چاہتا تھا مگر ساروں نے اُس کے گرد سوالوں کی فصیل کھڑی کر دی تو وہ چپ رہا۔۔۔ آتے سمے وہ اُن سے آگے چلتی رہتی۔ وہ اُس کے پیچھے، جب سے وہ اُن کی راہ میں آن کھڑی ہوتی تھی وہ بھی سرگوشیوں میں گفتگو کرنا سیکھ گئے تھے۔ سکول سے چھٹی ہو جاتی وہ چاروں ایک دوسرے سے نظریں چراتے وہیں کھڑے رہتے۔۔۔ کوئی گھر جانے کی جلدی نہ مچاتا، جیسے طے شدہ تھا کہ گھر تاخیر سے جانا ہے۔ جونہی وہ لڑکی سکول سے نکل کر گاؤں جانے والے رستے کی طرف مڑتی وہ چاروں بھی دھیرے دھیرے گھر جانے کے لیے پَر تولنے لگتے۔

نویں جماعت کا سارا سال یونہی بیت گیا۔ وہ لڑکی چپ چاپ، پکی سڑک چھوڑ کر کچے رستے پہ جہاں خودرو گھاس اُگی ہوتی، درختوں سے لپٹی دھیرے دھیرے چلتی رہتی۔ ایک دِن تینوں نے اُسے اُکسایا کہ وہ اُس سے بات کرے، رسم و راہ بڑھائے۔ اُن کی بات سن کر وہ نو بیاہتا لڑکیوں کی طرح شرمانے لگا۔ وہ اُسے حوصلہ دیتے رہے۔ پورا ہفتہ بیٹھ کر اُنھوں نے سکھایا کہ اُس نے بات کیسے شروع کرنی ہے؟

''اندازِ گفتگو کیسا ہونا چاہیے؟''

اُوپر سے تو وہ نہ، نہ کرتا رہا۔ پر اندر سے وہ گفتگو کے تمام ہنر سیکھتا رہا کہ جب اُس سے گفتگو ہو تو کوئی لکنت نہ رہے۔ ہفتہ کا دِن مقرر ہوا۔ تاکہ اِس پیش قدمی کا انجام اگر بُرا ہو تو گھر بیٹھ کر شرمندگی کو مٹایا جا سکے۔ سکول سے چھٹی ہو گئی۔ چاروں بستہ اُٹھائے سکول سے باہر آ کر بیٹھ گئے۔ وہ شاگرد بن گیا اور وہ تینوں اُستاد۔۔۔ جیسے ہی لڑکی گاؤں جانے والے رستے کی طرف مڑی وہ چاروں بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کچھ دیر تو وہ معمول کے مطابق چلتے رہے تاکہ آس پاس سے گزرنے والوں کو شک نہ ہو جائے، جونہی وہ سڑک پر اکیلے رہ گئے تو اُس نے اُن تینوں سے سبقت کی اور لڑکی کے برابر چلنے لگا۔

چاروں میں فاصلہ ضرور تھا مگر گردش کرتے خون کی رفتار میں کوئی فرق نہیں تھا۔ خوف ایک، ایک خلیے میں جا گزیں تھا کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے؟۔۔۔ ہوا کچھ بھی نہ تھا۔۔۔ سوائے اُن کی حیرت میں اضافہ ہونے کے۔ نہ لڑکی نے آنکھ اُٹھا کے دیکھا۔ نہ وہ رُکی۔ وہ اُس کے برابر، اُس کے قدم سے قدم مِلا کے چلتا رہا۔ اُس کے حوصلے بس یہیں تک تھے۔ حلق خشک ہو گیا اور جرأتِ گفتار دم توڑ گئی۔

اگلے کئی روز تک یہ سلسلہ اِسی طرح خاموشی سے جاری رہا۔ اُس کو لگا کہ اُس کی زندگی کا مقصد صرف

اور صرف اُس سے قدم مِلا کے چلنا ہے اور بس! اِس سے زیادہ کی اُس میں طلب تھی اور نہ جرأت۔ دوستوں کے اُکسانے پر اُس نے پھر ہمت کی۔ ایک روز چلتے چلتے بولا:

''میرا نام نیاز ہے۔ میں۔۔۔!''

وہ اٹک گیا۔ ''میں'' سے آگے کے لفظ ٹوٹ گئے، وہ جوڑ جوڑ تا رہا۔ اِتنے میں گاؤں کے در و دیوار نظر آنے لگے۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ پر ایک فیصلہ کر کے بڑھا کہ کل آر یا پار۔ کل وہ سب کہہ دے گا جو وہ اِتنے دِن سے کہنا چاہتا ہے۔ نئے سرے سے لفظ ترتیب دیئے گئے۔ پر جب گفتگو کی باری آئی اُس کے وجود میں زلزلہ سا آ گیا۔ قرینے سے سجے حرفِ آرزو در ہم برہم ہو گئے۔ زبان لڑکھڑا گئی۔ اُس نے سنا وہ کہہ رہا تھا۔

''میرا نام نیاز ہے۔ دسویں جماعت میں پڑھتا ہوں اور آپ سے محبت۔۔۔'' یہ جملہ پورا کرنے کے لیے اُس نے پوری قوت گویائی صرف کر دی لیکن ''محبت'' پہ آ کے اُس کا سانس ٹوٹ گیا۔

اِس ادھورے جملے پہ لڑکی کے چہرے پر پہلی مرتبہ کسی تاثر کی جھلک نظر آئی اور وہ تاثر تھا حیرت کا۔۔۔ اُس کے قدم رُک گئے۔۔۔ اِس سارے عرصے میں یہ اُس کے قدموں میں پہلا تعطل تھا۔۔۔ مگر یہ تعطل اور تاثر لمحاتی تھے۔ اُس کے قدم فوراً حرکت میں آئے اور چہرے سے تاثر بھی یوں غائب ہو گیا جیسے سیاہ سلیٹ پہ سفید چاک سے لکھے حروف کو کوئی گیلے کپڑے سے صاف کر دے تو حرفوں کا ہلکا سا نقش بھی باقی نہیں رہتا۔ صاف اور سپاٹ۔ جب لڑکی نے اُسی طرح چلنا شروع کر دیا تو وہ دوبارہ بولا:

''کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟''

اب نہ تو لڑکی نے سر اُٹھایا اور نہ سوال کا جواب دینے کے لیے لب کھولے وہ چادر سنبھالے اُسی طرح چلتی رہی، جیسے چلنے کے سوا اُسے کوئی کام نہیں۔ نہ کوئی منظر راہ میں اِس قابل ہے کہ وہ اُس پر نگاہ ڈالنے کی زحمت گوارا کرے۔ چلتے چلتے نہر کا پُل آ گیا۔ پُل سے اُترتے ہی گاؤں نظر آنے لگتا تھا۔ فاصلہ تو کافی تھا پر لگتا یونہی تھا جیسے بالکل سامنے ہے۔ وہ ایک، دو تین کہہ کر بھاگیں گے اور اُسے چھُو لیں گے۔

گاؤں نظر آتے ہی اُن کی ترتیب پھر بدل گئی۔ افراد کا دائرہ ختم ہو گیا۔ وہ پُل پر بیٹھ کر رواں پانی کو دیکھنے لگے۔ لڑکی خاموشی سے گزر گئی، جب درمیانی فاصلہ کافی ہو گیا تو وہ بھی بیگ اُٹھا کر چل دیئے۔ سب سے پہلے اماں سردار بیگم کا ڈیرہ تھا۔ بڑا سا لمبا کمرہ، جس کی پچھلی دیوار ہمیشہ اُپلوں سے بھری رہتی۔ کبھی سارے گیلے ہوتے، کبھی آدھے خشک، آدھے گیلے، کمرہ کے سامنے بھینس، گائے اور بکریاں بندھی ہوتیں۔ ایک خشک سا درخت تھا جسے اُوپر سے کاٹ دیا گیا تھا۔ اُسی کی تین موٹی شاخوں پر ہمیشہ سلور کے برتن اوندھے پڑے ہوتے، جن میں شام کو جاتے ہوئے اماں اور اُس کا شوہر دُودھ بھر کر لے جاتے۔

اگلا دِن اتوار تھا۔ سارا دِن وہ ڈرتے رہے۔ ہر بار دروازہ کھلنے پر اُنھیں لگتا کہ لڑکی کی ماں آئی ہے، پھر

اُن چاروں کی خیر نہیں۔ نیاز نے تو سارا دِن کمرے میں گزارا۔ ابا جی کے سامنے آنے سے بھی گریز کیا۔ شام ڈھلتے ہی وہ چاروں پُل پر آ کر بیٹھ گئے اور نیاز پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ اُس سے بہت کچھ پوچھ رہے تھے۔ پر اُس کے پاس بتانے کے لیے کچھ نہ تھا۔ صرف ایک تاثر۔۔۔ ایک تعطل۔۔۔ وہ اُس پہ پوری کہانی کی بنیاد نہیں رکھ سکتا تھا۔ اُس نے خاموشی کو اپنا پردہ بنایا۔ یہ کہہ کر اُن کا دھیان بدل دیا کہ ''اب آگے بتاؤ کیا کرنا ہے؟''

نئی دریافت۔۔۔ نیا تجربہ۔۔۔

شوق کی زمین سے پھوٹتا پہلا جذبہ۔۔۔ کوئی پاس ہوتا تو وہ سونگھتا۔ اِن کی باتوں میں وہی مہک تھی جیسی بارش کا پہلا قطرہ گرنے کے بعد زمین سے اُٹھتی ہے۔۔۔ یا پھر کچی مٹی سے بنا برتن جب بھٹی سے پک کر باہر نکلتا ہے تو اُس کے کورے وجود سے بھی ایسی ہی مہک اُٹھتی ہے۔ اُس کے سوال کرنے کی دیر تھی۔ چاروں نے پھر سر جوڑ لیے۔ رنگ، رنگ کے مشورے آنے لگے۔ اطہر بولا ''کسی فلم سے ڈائیلاگ چرائے جائیں۔''

محمود نے کہا ''کوئی گیت۔۔۔''

احسن نے مشورہ دیا ''اچھے سے اشعار یاد کر لو۔''

نیاز نے کہا ''اب مجھ میں گفتگو کی تاب نہیں کوئی اور ذریعہ تلاش کرو۔ پتہ نہیں وہ سنتی بھی ہے یا نہیں۔ کیونکہ وہ سر جھکائے خاموشی سے چلتی رہتی۔ اب کیا پتہ جو کہا جا رہا ہے وہ سُن بھی رہی ہے۔

''اچھا یوں کرتے ہیں، خوبصورت اشعار لکھ لیتے ہیں۔ نہ مخاطب کا نام لکھا جائے گا اور نہ مخاطب کرنے والا کا۔'' یہ احسن تھا۔

اِس کا مشورہ پسند کیا گیا۔ نیاز کی بھابھی شہر سے بیاہ کر آئی تھی۔ اُس کے پاس بہت سی علمی اور ادبی کتابوں کا ڈھیر تھا۔ وہ گھر گیا چوری چھپے دو رسالے اُٹھا لایا۔ اُس میں سے اشعار کا انتخاب کیا گیا۔ نویں جماعت پاس کرنے کا ایک فائدہ ہوا تھا کہ وہ غزل، شعر اور نظم کا فرق جان گئے تھے۔ چار صفحات پر اشعار لکھے گئے۔ پرچیاں بنا کر نیاز کو دیں۔ اُس نے پڑھے بغیر جیب میں رکھ لیں۔ وہ سارے صبح سکول جانے کے عہد کے ساتھ پُل پر سے اُٹھ آئے۔ رات کو جب سارے گھر والے سو گئے۔ نیاز چپکے سے اُٹھا۔ پرچیاں کھول کر پڑھنے لگا۔

؎ کیسی محبت، کیسی چاہت، سب کچھ ہم پر روشن تھا
یونہی ذرا سا شوق ہوا تھا آؤ! دِل برباد کریں

دوسری پرچی کھولی تو لکھا تھا:

؎ اُس نے جب پلکوں کو جنبش دی عدمؔ
رائیگاں سب گفتگو کے فن گئے

وہ ایک، ایک کر کے پرچیاں کھولتا گیا۔ تیسری پرچی پر ایک نظم تھی:

''آؤ اُس جہاں میں چلیں
جہاں محبت زمین ہو
محبت آسمان ہو
جو سود و زیاں کا حساب کرے
وہ شیطان ہو۔''

جب آخری پرچی کانپتے ہاتھوں سے کھولی تو اُس پہ لکھا تھا۔

؎ ہم خوشبو کے سوداگر ہیں اور سودا سچا کرتے ہیں
جو گاہک پھولوں جیسا ہو ہم بن داموں بک جاتے ہیں

اِن میں سے اکثر اشعار کے معنی سے وہ خود بھی آشنا نہیں تھے، جس میں محبت اور حسن کا ذِکر آیا، بغیر سوچے سمجھے لکھ ڈالے۔ نیاز کے سامنے ایک نیا مسئلہ تھا۔ کل کونسی پرچی لے کر جائے۔ سوچ، سوچ کر اُس کی کن پٹی میں درد سا ہونے لگا۔ آنکھیں دُکھنے لگیں۔ اُس نے ساری پرچیاں پھر تہہ کیں۔ مٹھیوں میں گھمایا اور میز پر پھینکی، پھر آنکھیں بند کر کے پرچی اُٹھائی۔

؎ کیسی محبت، کیسی چاہت۔۔۔

بقیہ تین اُٹھا کر بستے کی اندرونی جیب میں رکھ لیں اور یہ پرچی جیب میں رکھ لی۔ ساری رات خواب میں اشعار اُلٹ پلٹ ہوتے رہے۔ خلافِ معمول وہ پُل پر بھی تاخیر سے پہنچا۔ اِدھر اُدھر کے قصے سناتے وہ سکول پہنچے۔ آج سب کو چھٹی کا شدت سے انتظار تھا۔ وہ اپنے نئے تجربے کا نتیجہ دیکھنا چاہتے تھے۔ آج اُن کا ارادہ آگے پیچھے چلنے کا نہ تھا۔ آج وہ خاموشی سے سڑک کے سنسان ہونے کا انتظار کرتے رہے، جب سڑک پر لڑکی اکیلی رہ گئی تو وہ پرچی اُس کے پیروں میں پھینک کر آگے بڑھ گئے یہ دیکھے بغیر کہ وہ اُٹھاتی ہے یا نہیں۔

لڑکی کے پیروں سے جب پرچی ٹکرائی تو اُسے یوں لگا جیسے اُس کے پیروں میں بے جان کاغذ کا ٹکڑا نہیں بلکہ کسی کا جیتا جاگتا، سانس لیتا لمس ہے۔ سارے جسم کا خون اُس کے پیروں میں اکٹھا ہو کر شدت سے اُوپر کی طرف بہنے لگا۔ گردش کرتے خون میں چھوٹی چھوٹی پھلجھڑیاں سی چُھوٹ رہی تھیں۔ وہ ٹھہر گئی۔۔۔ ہوا، پھول، رستے اور بیلیں سب شور مچا رہے تھے کہ ''رُکنا نہیں، اگر رُک گئی تو تُو یہیں گڑ جائے گی۔'' وہ دو قدم چلی۔ اُس نے زیرِ لب کہا ''نیاز۔۔۔'' پھر پلٹ آئی۔۔۔ پلٹنے والے اپنے کب رہتے ہیں وہ تو پتھر کے ہو جاتے ہیں۔ وہ پلٹ کر جھکی اور سبز گھاس میں اٹکے اُس کاغذ کو اُٹھانے لگی۔ اُس کا ہاتھ کاغذ سے پہلے خشک گھاس سے ٹکرایا۔۔۔ تو گویا وہ نیند سے چونکی ماں کا آنسوؤں سے تر چہرہ۔۔۔ بندھے ہوئے ہاتھ۔ کاغذ پس منظر میں چلا گیا۔ ماں کہہ رہی تھی:

''عورت تو اُس ظرف کی طرح ہے جسے نرم مٹی سے بھر دیا گیا ہے کیونکہ اِس میں نسلوں کا بیج بویا جاتا ہے۔''

اتنا کہہ کر ماں رُک گئی۔ بیٹی کا چہرہ اپنے بوڑھے ہاتھوں میں سما کر کہنے لگی ''بیٹی سن! تن اور مَن کا برتن پاک رکھنا ورنہ نسل بھی عیب دار ہوگی۔''

بڑھے ہوئے ہاتھ رُک گئے۔

پر وہ کیا کرتی؟ بیج تو بویا گیا۔۔۔

درخت سے لپٹی اَمر بیل اُس کے وجود سے لپٹ گئی۔ سارے وجود پہ مکڑی کا جالا سا تن گیا۔ سوالوں کی دُھند سی تھی جو چاروں طرف پھیل رہی تھی۔

کیا بیج گرنے کے بعد بیل نہیں اُگے گی؟

بیل پھیلے گی تو کیا پھول نہیں کھلیں گے؟

پھول کھلیں گے تو کیا خوشبو نہیں پھیلے گی؟

پھر وہ خوشبو کو کیسے روکے گی؟

وہ کانپنے لگی۔۔۔ جذبوں کی پہلی وحی اُتر رہی تھی۔۔۔ لرزنا تو تھا۔۔۔ ایسے میں تو ضرورت تھی، کسی دستِ مہربان کی۔۔۔ کسی آشنائے راز کی۔۔۔ کسی محرمِ حال کی۔۔۔ پر وہ سڑک پر تنہا تھی۔۔۔ اور کانپ رہی تھی۔ جیسے بخار چڑھنے سے پہلے سردی سے وجود کانپتا ہے۔ اُسے اپنے ہڈیوں کا ساز بجتا سنائی دے رہا تھا۔ کچھ دیر وہ یونہی درخت کو آسرا بنائے اَمر بیل کے زرد لچھوں سے اُلجھتی رہی۔۔۔

پھر اُسے گھر کی دہلیز پر دو بوڑھی آنکھیں نظر آئیں، جو گزرتے لمحوں کے ساتھ خوف سے پھیلتی جا رہی تھیں۔

وجود کی لرزتی عمارت کو سمیٹا کہ اُسے گھر پہنچنا تھا۔۔۔ ماں کے خدشوں کو زبان ملنے سے پہلے گھر کے آنگن میں کھڑے ہو کر ماں کو آواز دینی تھی۔ سو وہ چل پڑی۔ قدم رکھتی کہیں تھیں۔ پڑتے کہیں اور تھے۔۔۔ نظر کہیں تھی، پر وہ دیکھتی کچھ اور تھی۔۔۔ دھیان کہیں تھا پر وہ سوچتی کچھ اور تھی۔ لرزتی، کانپتی وہ گھر کی دہلیز پر آ کر ڈھے گئی۔

''امّاں!'' کونسی کہانی اِس پکار میں چھُپی تھی کہ کھانا پکاتی ماں تڑپ کر اُٹھی۔ وہ دُھوپ سے سائے میں آ گئی۔ بوڑھا وجود اُسے سمیٹ کر اندر لے گیا۔ ماں کے لب پر تو کوئی سوال نہ تھا پر نظریں کھوج رہی تھیں۔۔۔ ٹٹول رہی تھیں، جیسے پوچھ رہی ہوں ''کچھ کھو تو نہیں گیا۔''

پر آج تو چڑھتے بخار نے سارا بھرم رکھ لیا۔ کسی سوال، جواب کی نوبت ہی نہ آئی۔ بخار تو جیسے ہڈیوں کے اندر اُتر گیا تھا۔ کئی دِن اُسے چارپائی سے اُٹھنے نہ دیا، پھر بخار تو اُتر گیا مگر جاتے جاتے اُس کے سارے حوصلے بھی سمیٹ کر لے گیا۔ ماں روز بازو تھام کر اُٹھاتی کہ ''آ تجھے پُل پر چھوڑ آؤں۔'' تو وہ رونے لگتی۔

بالآخر اُس نے کہا! ''امّاں مجھ سے نہ اِتنا چلا جاتا ہے، نہ موسم کی سختیاں برداشت ہوتی ہیں، تو مجھے شہر لے جا۔ میں وہیں پڑھوں گی۔ خالہ کے گھر جہاں میں پہلے رہتی تھی۔'' کچھ روز تو ماں اُس کی خواہش کو تولتی

رہی، پھر اُس نے بھی ارادہ باندھ لیا۔ گھر کو تالا لگایا۔ تھوڑی سی زمین تھی اُسے ٹھیکے پر دے کر وہ شہر آ گئی، جو اثاثہ تھا اُسے دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک بہن بہنوئی کو دیا کہ اُسے بوجھ بننا گوارا نہ تھا اور ایک اپنے پاس محفوظ کر لیا۔

اُدھر وہ روز پُل پر اُس کا انتظار کرتے رہے۔ وہ پرچی تو اُنھیں اگلے ہی دِن اوس سے بھیگی، گھاس سے چپکی، اُسی طرح تہہ شدہ مِل گئی۔ مگر لڑکی دوبارہ نظر نہ آئی۔ دو، چار دِن وہ اُن کی باتوں میں رہی۔ دو، چار ماہ ذہنوں میں۔۔۔ مگر نیاز کئی دِن اِس خلش میں جیتا رہا کہ ایک لڑکی اُس کی وجہ سے اپنا رستہ چھوڑ گئی۔ اُسے لگتا اُس نے کسی کی راہ کھوٹی کر دی ہے۔ اِتنی جرأت بھی نہ تھی کہ وہ پتہ کرتے کہ وہ گاؤں کی کس گلی کی، کس نکڑ سے آتی ہے؟ اور اب کیوں نہیں آئی؟

پھر جس طرح موسم بدلنے پر سوکھی ٹہنیوں پر نئے پتے آتے ہیں تو پرانے کہیں غبار آلود، گستاخ ہواؤں کی زد میں ہوتے ہیں۔ اِسی طرح وہ بھی غبار آلود خیال بن گئی۔ کبھی کبھی احساس تازیانہ بن کر سوچ کو زخمی کرتا۔۔۔ مگر بس ذرا دیر کو۔۔۔ رفتہ رفتہ یہ بھی ختم ہو گیا۔

سکول کا زمانہ ختم ہوا۔ کالج کی وسیع اور مصروف زندگی نے شوق کے نئے راستے متعین کر دیئے۔ پر یہ چاروں سارے رستے گھوم کر بھی قربت کے ایک ہی رستے پر تھے۔ زندگی قدم بہ قدم آگے بڑھتی رہی۔۔۔ نوکریاں۔۔۔ مصروفیات۔۔۔ ذمہ داریاں۔۔۔ انھوں نے روز، روز کا ملنا مشکل کر دیا۔۔۔ پر اتوار کو شام ڈھلے جب سب گھروں کو لوٹ رہے ہوتے تو وہ چاروں پُل پر اکٹھے ہوتے، پھر باتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگتیں، پر خلوص کی بساط پر بچھی اِس محفل کو چھوڑ کر جانے کو دِل کسی کا بھی نہ کرتا۔

چاندنی راتوں میں تو خیر روشنی واپسی کے رستوں کو آسان کر دیتی مگر اماوس کی راتیں بھی وہ اِسی پُل پر گزارتے اور گرتے پڑتے دیواریں ٹٹول، ٹٹول کر گھر پہنچتے۔

سب سے پہلے اطہر نے اِس محفل سے غیر حاضر ہونا شروع کیا۔ شروع شروع میں تو انھوں نے نظر انداز کیا کہ نئی نئی شادی ہے، مصروف ہوگا، مگر جب وہ ہر اتوار کو بہانے بنانے لگا تو انھوں نے گاؤں کی اُس نکڑ کی طرف دیکھنا چھوڑ دیا جہاں سے وہ آتا تھا۔ پر کن اکھیوں سے کبھی کبھی وہ اِس آس سے اُدھر دیکھ لیتے کہ شاید وہ آتا ہو۔۔۔ انتظار نہیں کرتے تھے، پھر بھی کان اُس کی چاپ کے منتظر رہتے۔

ابھی پُل پر وہ اطہر کے بیٹھنے کے انداز، اُس کی آواز کی بازگشت کو نہیں بھولے تھے کہ محمود بھی ہاتھ چھڑانے لگا۔ دوستی کی مثلث رہ گئی تھی۔ وہ بھی ٹوٹ گئی۔ اب نیاز اور احسن آدھا وقت اُن رستوں کو تکتے جن سے اُن کی آمد کے آثار ہو سکتے تھے۔ آدھا وقت ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے اُن لمحوں کو یاد کرتے جب نہر کے پانیوں میں ایک دوسرے کا تعاقب کرتے چار پتھر گرتے تھے۔ یہ پتھر نہیں گرتے تھے بلکہ یہ پُل پر اُن کی کلاس کی حاضری تھی، جب پتھر گر کر نہر کے پانیوں میں گول دائرہ بناتے اور ہلکی سی آواز اُبھرتی اُسے وہ ''حاضر جناب'' کی آواز کہتے۔

اب چار کی جگہ جب دو پتھر گرتے تو اُنھیں لگتا نہر کا' رواں پانی بھی اُن کی غیر حاضری پر اُداس ہے، جس دِن وہ دونوں گھر کی چار دیواری سے بھاگ کر پُل پر آ جاتے اُس دِن نیاز اور احسن کی خوشی چھپائے نہ چھپتی۔ اُن کا بس نہ چلتا کہ وہ وقت کو ساکن کر دیں۔قربت کے اِن لمحات کو سانسیں دے کر طویل کر دیں۔ وہ بھی جب آتے احسن اور نیاز سے شرمندہ، شرمندہ نظر آتے۔ حالانکہ انھوں نے غیر حاضری کا سبب کبھی نہیں پوچھا تھا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے اُن کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی درخواست ضرور ہوگی۔۔۔ بیماری کی یا پھر ضروری کام کی۔۔۔

پھر احسن کی شادی کی تاریخ بھی طے ہوگئی۔ صرف گندم کے کٹنے کا انتظار تھا۔ وہ جانتا تھا اب تنہائی اُس کا مقدر بننے والی ہے۔ اطہر اور محمود کے بعد اب احسن بھی پُل سے غیر حاضر ہوگا۔

شادی اُن کو پھر ایک دوسرے کے قریب لے آئی۔ تینوں احسن کی بیٹھک میں آ جاتے۔ ڈھولک بجائی جاتی، آنے والے خوبصورت دِنوں کا ذِکر کر کے احسن کو چھیڑا جاتا۔ کبھی اُس کے سامنے گھریلو زندگی کا خوفناک نقشہ کھینچا جاتا۔ ایک دِن باتوں باتوں میں اطہر کہنے لگا!

''احسن اب نیاز کا نمبر لگانا۔ اپنی بچی ہوئی مٹھائی اِس کو کھلانا۔ اب اِس کو بھی چار دیواری میں قید کرنا ہے۔''

پھر نیاز کو مخاطب کر کے بولا! ''ہمارا خیال تھا تیری شادی پہلے ہوگی؟''

''کیوں؟''

''تو ہم سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔ نوکری سب سے پہلے تجھے ملی اور محبت بھی سب سے پہلے تو نے کی۔'' بڑے عرصے کے بعد آج اوس میں بھیگی پرچی کی تہیں کھل گئیں۔

''میں نے محبت کی نہیں تھی، تم لوگوں نے مِل کر کروائی تھی۔''

''بہر حال تو آگے تو بڑھا تھا۔''

آج اِتنے سال گزر جانے کے بعد وہ اُسے وہاں لے جانا چاہ رہے تھے جن راہوں کی دھول بھی اب اُس کے لیے اجنبی تھی۔ پچھتاووں کے چھوٹے چھوٹے ناگ اُس کے وجود میں سرسرانے لگے۔ وہ بوجھل دِل کے ساتھ وہاں سے اُٹھ آیا۔ رات کافی بیت گئی تھی۔ پر اُس کی ماں اُس کے انتظار میں جاگ رہی تھی، جیسے ہی اُس نے قدم رکھا۔ بیٹے کے درد میں ڈوبی آواز آئی۔

''نیاز!'' اُس کے اپنے کمرے کی طرف بڑھتے قدم رُک گئے۔ وہ ماں کی چارپائی پہ آ کے بیٹھ گیا۔ ماں نے تکیے کے نیچے ہاتھ پھیرا اور سیاہ دھاگے میں لپیٹا ایک تعویذ اُس کے ہاتھ میں تھما کر کہا۔

''میرے لال اِسے بازو سے باندھ لے۔ ساتھ والے گاؤں میں بڑے پہنچے ہوئے پیر جی آئے تھے۔ اُن سے تعویذ لے کر آئی ہوں۔ وہ بتا رہے تھے کہ بڑا سخت وار کیا ہے۔ کسی کی بددُعا کا اثر ہے۔ یہ تعویذ سارے وار کاٹ دے گا۔ لا بازو بڑھا۔ میں باندھ دوں۔''

''امّاں! میرا تکیہ رنگ برنگ تعویذوں سے بھر گیا ہے۔ یہ میرا بازو ہے کسی دربار پہ اُگا منت کا درخت نہیں، جسے رنگ برنگ دھاگوں سے بھر دیا جائے، مجھ پہ کوئی جادو نہیں ہوا۔ کوئی وار نہیں۔ یہ تقدیر ہے، جو صرف دُعا سے بدل سکتی ہے تو بس میرے لیے دُعا کر۔

اُس کا یہ اُکتایا ہوا لہجہ بھی ماں کی ممتا کو کم نہ کر سکا۔

''تو یہ پہن لے، پھر اِس کا اثر دیکھ۔ اب جو رشتہ آئے گا۔ دیکھنا بات بن جائے گی۔ ورنہ میرے لال میں کوئی خامی ہے۔ پورے گاؤں میں میرے بیٹے جیسا سوہنا کوئی نہیں۔ لا بازو ادھر کر۔''

اُس نے خاموشی سے بازو بڑھا دیا۔ وہ ماں کو سمجھا سکتا تھا مگر اُس کی ممتا کو سمجھانا اُس کے بس کا روگ نہ تھا، جب سے احسن کی شادی کا شور اُٹھا تھا۔ سارا گھر اُس کے لیے پریشان ہو گیا تھا۔ ہر کوئی اُس کے لیے کوشش کر رہا تھا۔ بہن تو کوئی تھی نہیں مگر بھابھیاں بھی اُسے بیاہنے کے لیے یہ ہنر آزما رہی تھیں۔ بھائی اپنے تعلقات استعمال کر رہے تھے، مگر نتیجہ۔۔۔ وہی تنہائی۔

احسن دُلہا بن گیا۔ وہ تینوں خصوصی باراتی تھے۔ دُلہن گھر آ گئی۔ اطہر اور محمود تو خوش تھے اب ملاقات یونہی گلیوں میں آتے جاتے ہوگی۔۔۔ کبھی دروازے سے نکلتے ہوئے۔۔۔ کبھی بازار آتے جاتے۔۔۔ مگر وہ پُل پر چھا جانے والی خاموشی سے خوفزدہ تھا۔ پھر وہی ہوا کہ جس کا ڈر تھا۔۔۔ کبھی احسن آ جاتا، کبھی اطہر اور کبھی محمود۔۔۔ وہ چاروں کبھی ایک ساتھ اکٹھے نہ ہو پاتے۔۔۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ وہ اکیلا ہی نہر میں چار پتھر پھینکتا۔ یہ پتھر کے بعد بننے والا حیرت کا گرداب بن جاتا۔ وہ اِس گرداب میں ڈوب ڈوب جاتا۔

وقت اِسی طرح آنکھ مچولی کھیلتے آگے بڑھتا رہا۔ اطہر اور محمود کے بچے سکول جانے لگے۔ احسن بھی صاحبِ اولاد ہو گیا۔ ماں اُس کو آباد دیکھنے کی خواہش میں کسی دوسرے دیس جا آباد ہوئی۔ اُس کے مٹی میں جانے کی دیر تھی۔ اُس کی ذات بھی دوسروں کے لیے مٹی ہوگئی۔ وہ بے نیازیوں کی گرد میں دبتا چلا گیا۔ لاپرواہیوں کی بے تحاشا سوئیاں اُس کے وجود میں چبھتیں۔ اِن سوئیوں کے چُبھنے پر شروع شروع میں وہ چیختا رہا، احتجاج کرتا رہا، پھر یہ احتجاج ایک ہلکی سی ''سی'' تک محدود ہو کر رہ گیا۔

وہ بھی کیا کرتا۔ اُسے انھی لوگوں کے ساتھ رہنا تھا۔ اُس کے ساتھ رہنے کے لیے آسمان سے فرشتے تو آنے سے رہے۔ وہ بھی بدصورت رویوں میں جینے کا عادی ہو گیا۔ خواب اُس کی واحد پناہ گاہ تھے، جو گزرتے وقت کے ساتھ تیز دُھوپ کی زد میں آتے جا رہے تھے۔ کبھی وہ یونہی بے سبب تلخ ہو جاتا۔ اُس کی تلخی کو کم کرنے کے لیے نہ تو ماں کی نرم آغوش تھی اور نہ کسی کا اعجاز مسیحا لمس۔۔۔ نہ دوستوں کی قربت۔

وہ بکھرتا گیا۔ اُسے سمیٹنے والا کوئی نہ تھا۔ نوکری اُس کے ذہنی توازن کو برقرار رکھنے کا سب سے بڑا وسیلہ تھا۔ پیسہ ہاتھ میں ہو تو بہت سے بے نیاز لوگ بھی نیازمند ہو جاتے ہیں، یا پھر وہ پُل اور اُس پُل سے وابستہ

یادیں، جہاں جا کر وہ اُن خواب آسا لمحوں کو یاد کرتا، جب اُس کے گرد اُس جیسے تین ہمزاد اُس کی یادوں میں نہیں ہاتھوں میں بستے تھے۔آج بھی وہ اُن تینوں کے بے ثمر انتظار کے بعد گھر لوٹ آیا۔

''نیاز!''اس کی بڑی بھابی نے اسے پکارا

''جی''وہ کھلی ہوا میں لیٹنے کے ارادہ سے چھت پہ جا رہا تھا کہ رُک گیا۔

''نیاز!انعم کو اپنی اُستانی سے کچھ پوچھنا ہے۔تم اِسے ساتھ لے جاؤ۔''

''بھابھی رات کافی ہوگئی ہے۔اندھیرا پھیل رہا ہے۔''

انکار سن کر انعم کے چہرے پہ سیاہ رات سے بھی زیادہ اندھیرا پھیل گیا۔۔۔مایوسی کا۔۔۔

''اچھا ٹھیک ہے۔فوراً چلو۔''

وہ بھاگ کر گئی۔کمرے سے ایک پلیٹ جسے سفید رومال سے ڈھانپا گیا تھا۔ پلیٹ کے نیچے ایک کتاب تھی، جو وہ صرف اُسے دِکھانے کے لیے لے جا رہی تھی۔اصل مُدّعا تو سفید رومال کے نیچے تھا۔

اُس کی معصوم رہبر اُس کی اُنگلی تھامے مانوس اور نامانوس گلیوں میں لے کر پھرتی رہی۔گاؤں کی آخری نکڑ پر ایک گھر تھا جس کے دروازے پہ اُس نے دستک دی۔کچھ دیر خاموش رہی، پھر کُنڈی ہلنے کی آواز آئی۔وہ دروازے سے چند قدم کے فاصلے پہ کھڑا تھا۔دروازہ دھیرے سے کھلا انعم اندر چلی گئی۔دو چار منٹ تو وہ وہیں دروازہ کے سامنے کھڑا رہا پھر چلتا ہوا گلی کی نکڑ تک آ گیا۔وہاں چھوٹی سی کریانہ کی دُکان تھی۔دُھندلا سا بلب دُکان کی خستہ حالی پہ نوحہ کناں تھا۔دُکان کے باہر دو بنچ رکھے تھے۔وہ انھی میں سے ایک پر بیٹھ گیا، لیکن نگاہ اُسی دروازے پہ رکھی جہاں سے اُس کی بھتیجی باہر آنے والی تھی۔

زنجیر پھر ہلی۔وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔اِتنے میں انعم کی آواز آئی۔

''مس! میرے چچا نظر نہیں آ رہے۔پتہ نہیں کہاں گئے۔''

وہ جلدی جلدی قدم اُٹھانے لگا۔

اِتنی دیر میں دونوں گھر سے نکل کر گلی میں آ کر اُسے تلاش کر رہی تھیں۔

چاند اچانک اُن دونوں کے سر پہ آ پہنچا۔

ساری گلی دُودھیا روشنی میں نہا گئی۔کھٹ! کھٹ! کھٹ کئی کیمروں کے فلش بہ یک وقت چمکے۔

ساری روشنی کا مرکز وہ چہرہ تھا۔

یادداشت کے پرت کھلنے لگے۔

بستے کی جیب میں رکھی پرچیاں اُڑنے لگیں۔۔۔

ن ۔م ۔راشد

ابولہب کی شادی

شبِ زفافِ ابولہب تھی، مگر خدایا وہ کیسی شب تھی
ابولہب کی دلہن جب آئی، تو سر پہ ایندھن، گلے میں
سانپوں کے ہار لائی، نہ اُس کو مشاطگی سے مطلب
نہ مانگ غازہ، نہ رنگ روغن، گلے میں سانپوں
کے ہار اس کے، تو سر پہ ایندھن!
خدایا کیسی شبِ زفافِ ابولہب تھی!

یہ دیکھتے ہی ہجوم بپھرا، بھڑک اُٹھے یوں غضب
کے شعلے، کہ جیسے ننگے بدن پہ جابر کے تازیانے!
جوان لڑکوں کی تالیاں تھیں، نہ صحن میں شوخ
لڑکیوں کے تھرکتے پاؤں تھرک رہے تھے،

ابولہب نے یہ رنگ دیکھا، لگام تھامی، لگائی
مہمیز، ابولہب کی خبر نہ آئی!

ابولہب کی خبر جو آئی، تو سالہا سال کا زمانہ
غبار بن کے بکھر چکا تھا!

ابولہب اجنبی سرزمینوں کے لعل و گہر سمیٹ کر
پھر وطن کو لوٹا، ہزار طرار و تیز آنکھیں، پرانے
غرفوں سے جھانک اٹھیں، ہجوم، پیر و جواں کا
گہرا ہجوم، اپنے گھروں سے نکلا، ابولہب کے جلوس
کو دیکھنے کو لپکا!

''ابولہب! ''اک شبِ زفافِ ابولہب کا جلا
پھپھولا، خیال کی ریت کا بگولا، وہ عشقِ برباد
کا ہیولا، ہجوم میں سے پکار اُٹھی! ''ابولہب!
تُو وہی ہے جس کی دلہن جب آئی، تو سر پہ ایندھن
گلے میں سانپوں کے ہار لائی؟ ''

ابولہب ایک لمحہ ٹھٹکا، لگام تھامی، لگائی
مہمیز، ابولہب کی خبر نہ آئی!

ستیہ پال آنند (کینڈا)

اپنی آنکھیں کھول دوں یا بند رکھوں؟

جب بھی آنکھیں کھولتا ہوں
جانی پہچانی یہی دنیا نظر آتی ہے مجھ کو
جب بھی آنکھیں بند کر کے اپنے اندر جھانکتا ہوں
اور ہی دنیا کا نقشہ دیکھتا ہوں!

کچھ عجب منظر ہے اندر
گندگی اک عمر کی ۔۔اک لاکھ صدیوں کی غلاظت!
جانتا ہوں، آدمی کی نسل کا ماضی یہی تھا
اجتماعی، لاشعوری ذہن کی 'diskett' میں رکھی
ایک chip سا
جس کے کمپیوٹر میں چلنے پر میں اپنی
بند آنکھوں سے برابر دیکھتا ہوں
لڑتے بھڑتے جنگلی، وحشی قبیلے
ارتقا کی دوسری منزل پہ تہذیب و تمدن کا ابھرنا
نیست و نابود ہونا
مذہبوں کے نام پر لشکر کشی، خلقت کا قتل عام، شہروں کی
تباہی
حملہ آور فوجیوں کی بربریت
آمروں کی، بادشاہوں کی ہوس ملک گیری
نوجوانوں، عورتوں، بچوں کو جیسے ریوڑوں سا ہانک کر
نیلام گھر میں ان کی بولی!
تیز رو میں آگے بڑھتے chip کے ان سارے مناظر پر
لہو بکھرا ہوا ہے!

آدمی کی نسل کا ماضی بہت مکروہ ہے، اب آنکھیں
کھولوں
chip کو diskett میں مقفل چھوڑ دوں ۔۔
یہ سوچ کر جب اپنی آنکھیں کھولتا ہوں
چونک کر کیا دیکھتا ہوں
chip تو چلتی جا رہی ہے، آج کی دنیا کی تصویریں
دکھاتی!
سب طرف وحشت وہی ہے
بربریت، جارحیت کا وہی نقشہ ہے ہر سو
کچھ بھی تو بدلا نہیں ہے!

اپنی آنکھیں کھول دوں یا بند رکھوں؟

شاہد ماہلی (دہلی)

نذرِ فیض

اس کی ہر ایک تخلیقِ نو
مسکراتی رہی
اس کے نغمے فضا گنگناتی رہی
اُس کے الفاظ دل میں اُترتے رہے
اک زمانے کو گرویدہ کرتے رہے
اُس کی دنیا نے سب کچھ دیا تھا اُسے
دادو تحسین بھی، عزت و پیار بھی
بامِ شہرت بھی، عظمت کا اقرار بھی
کوئے جاناں بھی، زنجیر بھی دار بھی
گلشنِ درد بھی، تلخیِ جام بھی
صبحِ زنداں بھی، رنگوں بھری شام بھی
لطفِ یاراں بھی اور سنگِ دشنام بھی
اور وہ نو بہ نوا اپنے افکار سے
ساغرِ وقت لبریز کرتا رہا
اس کی ہر ایک تخلیقِ نو
مسکراتی رہی۔

فرحت نواز (رحیم یار خان)

ہجرت

سرداروں کی یورش ہر پل بڑھتی جائے
میرے چاہنے والے!
سب ہی تیری جان کے دشمن ٹھہرے
میری مانو
میری من بستی سے تم ہجرت کر جاؤ
خدا کرے کوئی امن محبت کی دھرتی تم کو مل جائے
ساتھ تمہارے کیسے ہولوں
بعد میں آنے کا وعدہ بھی کر نہیں سکتی
میرے پاس امانتیں ہیں جو
کس کو سونپوں؟
کوئی بھی ذمہ لے نہیں سکتا
ظاہر ہے اپنے بستر پر
مجھ کو خود ہی سونا ہوگا!

عبداللہ جاوید (کینڈا)

تہمت ہے مختاری کی

دریا میں رہنا بھی ہے
بہنا بھی ہے
پل پل کچھ کرنا بھی ہے
بھرنا بھی ہے
فصلِ غم بونا بھی ہے
ڈھونا بھی ہے
مرنے سے ڈرنا بھی ہے
مرنا بھی ہے

بھیگنا بارش میں تھا

بھیگنا-----
بارش میں تھا
لیکن
گذشتہ رات کو
آسماں سے عشق برسا
اور ہم
بھیگے بہت---!

عبداللہ جاوید

ہوا میں اُڑتی ہوئی وہ لڑکی

ہوا میں اُڑتی ہوئی وہ لڑکی
ملی تو دل نے
ہوا کو روکا
ہوا رُکی بھی
ہوا رُکی بھی
مگر وہ لڑکی
ہوا میں تحلیل ہوگئی

خلیق الرحمٰن (اسلام آباد)

محبت نہیں سوچتی!

سنا ہے
محبت کبھی موت کی سوگواری کی بارے میں
گھمبیر عجلت زدہ راستوں میں ٹھہر کر نہیں سوچتی
کیا محبت کبھی آنسوؤں کو
جُدائی کی خنجر زدہ ساعتوں کو
کسی چاندنی رات میں ایک لمحے کو رُک کر نہیں سوچتی؟
خوش گمانی کے بازار کی سمت جاتے ہوئے
ذیلی رستوں کے اندر کسی بدشگونی کسی بدگمانی کی بابت
ذرا دیر کو بھی نہیں سوچتی؟
یہ محبت ہری ٹہنیوں کے کنارے لرزتے ہوئے
زرد ہوتے ہوئے... برگ ریزی کے اندر
بکھرتے ہوئے
اُڑتے پتوں کی بابت نہیں سوچتی؟
کیا محبت کبھی نوحہ خوانی کی بابت نہیں سوچتی؟

ہاں...جُدائی میں گھرتے ہوئے
ناشگفتہ دنوں میں اُترتی...کسی خشمگیں دُھوپ کی
سرد ہوتی تپش کو محبت نہیں سوچتی...
کیا محبت کبھی بھی چمکتی ہوئی پندرھواڑے کی
راتوں میں اوجھل
کسی بھی اماوس کی بابت نہیں سوچتی؟
ہاں...محبت کبھی زود رنجی کی بابت نہیں سوچتی
یہ فراموش ہوتی ہوئی ساعتوں
دُکھ میں ڈوبی ہوئی گہری پوشیدہ راتوں کی
بابت نہیں سوچتی
یہ محبت کبھی بھی اُداسین لمحوں...
اسنتوش ہوتے دنوں کے لئے
رُک کے اِک بار بھی تو نہیں سوچتی!

خورشید اقبال (جگتدل، مغربی بنگال)

تم بِن

سات دن ہو گئے تھے تم کو گئے
سات دن سے عجیب عالم تھا
بکھرے بکھرے سے اپنے کمرے میں
سگرٹوں کے دھوئیں میں خاموشی
یوں گھلی تھی کہ دم گھٹے جس میں
فوم کے نرم نرم بستر میں
فصل جیسے اگی تھی کانٹوں کی
کتنی بوجھل فضا تھی مت پوچھو
دفعتاً فون کی بجی گھنٹی
''آپ کیسے ہیں؟'' تم نے پوچھا تھا
اور مجھ کو لگا تھا اک پل میں
سارا عالم بدل گیا جیسے
کرب خوشیوں میں ڈھل گیا جیسے

پروین شیر (کینیڈا)

Disposable

منقش گلبدن تھا کاغذی ساغر
جسے دیکھیں تو آنکھوں کو سرور آئے
کسی شوکیس میں رکھا ہوا دیکھا
جو اُس نے، تو خریدا۔۔گھر اُٹھا لایا
سجایا میز پر تو سارا کمرہ جگمگا اُٹھا
محبت کی سرور انگیز مے سے بھر دیا اس کو
اُٹھایا اپنے ہاتھوں میں
اُسے چوما
بڑے ہی پیار سے ساغر کو
ہونٹوں سے لگایا
اور پھر بے حد مزے سے چسکیاں لیتے ہوئے
مشروب پی کر کر دیا خالی
مگر وہ گلبدن ساغر تو اب
پچکا ہوا خالی پیالہ تھا
تو کیا مصرف تھا اب اس کا؟
بڑے بیدرد ہاتھوں سے
اُٹھایا اور کوڑے دان میں پھینکا
گیا وہ پھر۔۔۔۔
نیا ساغر اُٹھا لانے!

فیصل عظیم (کینڈا)

خدا کی زمین

کس قدر دلکش ہے منظر
ان پہاڑوں کا، جہاں
سبزے کو پانی دینے کوئی بھی نہیں آتا، مگر
اُگتا بھی ہے، جلتا بھی ہے
اور وادیوں کی گود میں
وہ خود بخود پلتا بھی ہے
میں بھی کبھی، ان دیکھی زنجیریں سبھی
توڑوں اور ان خاموش ٹیلوں اور پہاڑوں میں کہیں
خود ہی سما جاؤں
اسی سبزے کی صورت
اس زمیں پر آ کے بس جاؤں
جہاں جینا، جہاں مرنا
اور ان دونوں کی جبری ہر روایت، رسمِ دنیا کو ادا کرنا
ضروری ہی نہ ہو، لیکن
یہ ویرانہ خدا جانے،
کسی کی ملکیت ہو گا
خدا کی بھی زمیں مل جائے
تو میں اُس کا ہو جاؤں
اور اس دنیا سے بیگانہ
سکوں سے اُس پہ سو جاؤں

فیصل عظیم

کوہ پیمائی

ایک اونچے پہاڑ کے نیچے
ایک مجمع تھا، جس میں اپنے بھی،
اور بیگانے، سب ہی شامل تھے
سب کے سب
اس پہاڑ کے تنگ راستوں پر رواں دواں دیکھے
کوئی جلدی، کوئی ذرا دھیرے
اور میں بھاگتا ہوا گویا
ان درختوں کے اور چٹانوں کے درمیاں سے
گیا بہت آگے
سانس پھولی، تھکا بدن، لیکن
مجھ کو اُونچائی بھی تو چھونا تھی
سب کو آخر وہیں تو جانا تھا
سارے اپنوں کا وہ ٹھکانہ تھا
پر اچانک کہیں بلندی پر
میں جو پلٹا، تو میں نے کیا دیکھا
دُور تک کوئی بھی نہیں اپنا

کاوش عباسی (کراچی)

مانگے کی محبت

محبت تھی مجھ کو نہ جانے ضرورت تھی
میں نے بہت کچھ چھپا کے
بہت کچھ کو ''اس'' کے مطابق بنا کے
زمانے کے معیار و انداز سے
جھوٹ سچ سچ سجا کے
اپنا آپ، اپنا دل پیش اس کو کیا

وہ مسکرایا
شاید مرا کوئی انگ اس کو بھایا
مری پیش کش کو سراہا
اسے اپنے خوابوں میں پرکھا
کوئی دیر خوابوں میں سمٹا
پھر آخر مجھے اپنے دل سے لگایا

مگر جب جو کچھ میں نے اس سے چھپایا
جس ان بن کو، اس کے مطابق بنایا
اب وجد کے تہذیب و درجہ کے
جس فرق کو جھوٹ سچ سے مٹایا
وہ سب جب کھلا، سامنے اُس کے آیا
تو وہ زہر سا مسکرایا
بہ حسرت کہا
''مجھے چوری سے ہیرا پھیری سے تم نے اُٹھایا ہے، جیتا
نہیں ہے، کوئی اس طرح مردہ خوری تو کرتا، لہو زندگی کا
تو پیتا نہیں ہے''
یہ الفاظ تھے
یا نہ جانے کوئی بم پھٹا تھا
کہ جس کے دھماکوں میں
میں ٹکڑے ٹکڑے ہوا میں بکھرتا گیا تھا

کاوش عباسی

وہ بھی جھوٹ تھا

وہ بھی جھوٹ تھا
تو پھر اس کو چھوڑ دو
دوسرے جھوٹ سے ہاتھ ملاؤ
جو پہلے جھوٹ سے کچھ تو زیادہ مہذب'
کچھ تو زیادہ انسانی ہے
اپنے کتنے ٹکڑے کرواؤ گے
خود کو کتنا کھپواؤ گے
زہر تو زہر ہے
تمہارا وجودی مادہ اس میں ضم نہیں ہوگا
اپنے مہر کو اپنے سبھاؤ کو
اپنے وجود کو کتنا گھٹاؤ گے
کتنا نظر انداز کرو گے، کتنا نظر انداز کراؤ گے
دُوسرے جھوٹ سے ہاتھ ملاؤ
لیکن یاد رکھو
اس میں بھی کھب نہیں جانا
اُس کو خود میں کھبو نہیں لینا
پہلے جھوٹ کو چھوڑ دو
دوسرے جھوٹ کو گلے لگاؤ
اُس سے کھیلو
لیکن جھوٹ کو جھوٹ ہی سمجھو
اُس کو اپنا سچ نہ بتاؤ

کاوش عباسی

تمنا

تمنا'
تمنا کی طاقت
تو اندھی تڑپ ہے
مگر

یاد
چشمِ تخیل کے
صد تار پردوں سے
سب دیکھتی ہے
وہ جو فاصلوں کے
اندھیروں میں کھویا ہے
اُس کے لیے
سازِ دل کو دُکھاتی ہے

دل کیا کرے
یاد بھی دل / تمنا بھی دل
آگے بھی آپ / پیچھے بھی آپ
تیر کے مُونہہ دو
دونوں کے ہم ہدف
دونوں سے چھلنی ہوتے رہے
ہم تڑپتے رہے / ہم سسکتے رہے
ہم بکھرتے رہے

ماہیا نظم: فراز حامدی (جے پور)

بہتر ہے یہی جانم

آ دور نکل جائیں
اپنے شہروں کی
گنجان فضاؤں میں
ہر شہر کے رستوں میں
ظلم و تعصب کی
اب آندھیاں چلتی ہیں
ہر شہر کی جگہوں میں
خوف و دہشت کے
اب سائے لرزتے ہیں
ہر شہر کی رونق کو
چاٹتے رہتے ہیں
اب خطرے فسادوں کے
لیکن یہ حقیقت ہے
ملک کی سرحد کو
ہم چھوڑ نہیں سکتے
آ! یوں کریں اے جانم
چھوڑ کے شہروں کو
صحراؤں کی جانب ہم
چپ چاپ نکل جائیں
اپنے پرکھوں کی
تاریخ کو دہرائیں

پرویز مظفر (برمنگھم)

قیدی

تنہائی کی دلائی اوڑھے ہوئے
صبح سے منہ موڑے ہوئے
اپنی قسمت کو / کوستے ہوئے
آدھی سے زیادہ زندگی کاٹ دی سوچتے ہوئے
قدم تھے کہ بڑھ نہ پائے
ہاتھ اس کے روشنی کر نہ پائے
بیٹھے ہیں اسی جگہ
ارادے، سگریٹ کے دھوئیں میں لپٹے ہوئے
جو اَب جگہ جگہ دیواروں پر چپک گئے ہیں!

تہذیب کے دائرے

ہم سوال پوچھتے ہیں اپنے آپ سے
کیوں ہماری تہذیب نے
شرم و احترام کے اتنے پردے
ڈال رکھے ہیں؟
کہ کبھی کبھی تو
اپنے آپ میں ہی
گھٹ کر رہ جاتا ہے انسان!

سیّد تحسین گیلانی (بورے والا)

ایسا ہو بھی سکتا ہے

لرزتی، ڈولتی آواز کے پیچھے چھپے لوگو.....
کبھی سہمے ہوئے چہرے بھی جیتے ہیں
کبھی یہ کانچ کے ٹکڑے کہیں لوہے کی دیواروں
سے اُلجھ کے جیت پائے ہیں
کہیں ایسا ہوا ہے کہ کسی نے یہ سمندر
مٹھیوں سے ڈھولیا ہو اور
اِس دھرتی کے نیچے کالا پانی
بھر دیا ہو__ یہ بتاؤ کیا ہوا ایسے __؟

کیا ہوا ایسے..... کبھی
نومولود بچے سے زمیں کہہ دے...
بہت کچھ سہہ لیا میں نے
چلو نکلو فضا میں گھر بناؤ __یا.. رہو تم
آسماں میں... یا کسی پاتال میں جا کر رہو
چھوڑو مرا پیچھا....!
کبھی ایسا ہوا لوگو؟

ہاں، سُنو.... سُن لو !
اگر یہ اک عمل جس کو "محبت" نام دیتے ہیں
اگر دُنیا سے مٹ جائے__ تو
ایسا ہو بھی سکتا ہے !

ارشد خالد (اسلام آباد)

ماضی

ہاتھ نہ رکھ تو دکھتی رگ پر
ناچ اُٹھے گی تیری پائل
اور میں تیرا ازلی گھائل
پھر سے بے کل ہو جاؤں گا

سیاست اور محبت

آج کی دنیا کو اتنے نزدیک سے
اور پھر اتنے غور سے مت دیکھو
اس دنیا کو اتنا غور سے دیکھنے والوں کی
آنکھیں جل جاتی ہیں
میری مانو
اپنی آنکھ میں مجھ کو رکھ لو،
میں دنیا کی آگ میں خود ہی جلتا رہوں گا
پھر تم دنیا کو جتنا جی چاہے غور سے دیکھو، سمجھو
اور پھر جو جی چاہے لکھو!

شبانہ یوسف (برطانیہ)

لمحہ

اَنا کے حصار سے
کبھی نکلو تو مُڑ کے اک بار تم دیکھنا
نفرتوں سے پرے، درد کے ریگ زار میں
جُدائی کی تپتی ہوئی رُت میں
یادوں کے گرداب کی ناچتی ان تہوں میں کہیں
راکھ سا کوئی لمحہ
کسی دیپ کے داغ سا کوئی لمحہ
نظر آئے تو تم سمجھنا ابھی زندہ ہوں مَیں
تمھاری رفاقت کا لمحہ سنبھالے ہوئے
جو ٹھہر سا گیا ہے
مری آنکھ کے صحرا میں دکھ کی اک جھیل بن کر
شبِ یخ کے آنچل میں قندیل بن کر
دنوں کی ہتھیلی پہ رکّھا ہوا ہے سلگتے شرار سا
جو دل کے نگر میں بھٹکتا ہے کچھ بے قرار سا
وہ دل کہ جہاں آج بھی خواہشیں بین کرتی ہیں
فرصت ملے تو کبھی مُڑ کے تم دیکھنا
جو مہکتا تھا دل میں کسی ادھ کُھلے سے گلاب ایسا لمحہ
وہی بن گیا ہے عذاب ایسا لمحہ
جو ہر شب مری آنکھ میں ڈُھل کے ڈھلتا ہے اور
جس کی آغوش میں آج بھی جسم میرا پگھلتا ہے

جمیل الرحمٰن (ہالینڈ)

میں۔ جو کہیں رکتا نہ تھا

اپنی ہی پلکوں تلے ----------پھیلے ہوئے
صحرائے خود آزار کی ------آتش نگاہی جھیلتے
پیاس کی خندق کو پاٹا ---دھوپ سے آگے چلے
زندگی تھی جب سراپا عشق ------کیا تھے حوصلے
اسباب جاں تھا دوش پر۔ ---تھا وہم ناکامی نہ ڈر
لیکن تھکن کا ایک پل ---غافل --غنودہ --مختصر
کوندا لہو میں اس طرح میرے جنوں کو---ڈس گیا
میں جو کہیں رکتا نہ تھا---اک دن کھنڈر میں بس گیا!

جمیل الرحمٰن

۔۔اے زندہ آدمی

دہشت اور تباہی کے اس پل
جب گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے
فاتح نیزہ بازوں کی آوازیں
ہاری ہوئی بستی میں گونج رہی ہیں
ٹوٹے ہوئے مکانوں کی اکھڑی دہلیزوں پر
اپنے ہی لہو میں لتھڑی عورتیں
اپنے سروں میں خاک بکھیرے
اجڑے ہوئے برہنہ پیڑوں کی تمثیل بنی
خاموش کھڑی ہیں
دھوپ میں کھلتی تاریکی سے لپٹے چاند کی آنکھوں میں
ان سورماؤں کے عکس اتر آئے ہیں
جن کے وجود اپنی کم حوصلہ زندگیوں کے ساتھ
وہ قول بھی ہار گئے ہیں
جن کی گواہی کی بنیاد پر ان کے گھروں میں
سکھ اور آسائش کے دیپ جلے
جن کے بخشے ہوئے یقین کی شہ پر
وصل و وفا کے پھول کھلے
اور ان کے سروں پر آسمان نے
اپنی رحمت کی ہر چادر تانی

اپنی آخری سانس سمیٹ کے چلتے ہوئے
اے زندہ آدمی

اس جانب مت دیکھ
کہ تیری موت مری زمیں کی موت ہے
کیونکہ تیرے بعد یہاں پانی برسے گا
پھول کھلیں گے
فصل اگے گی اور نہ کوئی قول دیا جائے گا

سو۔۔اب جیسے بھی ممکن ہے
اپنی ہتھیلیاں پھیلا کر
تُو سر پر گرتے آسمان کو ان پر روکنے کی کوشش کر
اور ہوا پر اپنے قدم جمانے کی تمہید اٹھا
کیونکہ دہشت اور تباہی کے
اس پل
جب گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے
نیزہ بازوں کی آوازیں
ہاری ہوئی بستی میں گونج رہی ہیں
صرف ہوا کو اپنے بس میں لا کر ہی۔۔تُو
جی سکتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!!!

جمیل الرحمٰن

سوبات ٹھہری یہی عرصہ گاہ الفت میں!

دل تباہ کی تسکیں، فضائے جاں کے لئے
نشاطِ فردا کی خاطر۔۔غمِ جہاں کے لئے
وہ سارے خواب مہ و سال کی امانت ہیں
وہ سارے خواب جو دیکھے ہیں تیری نسبت سے
وطن سے دور۔۔۔۔بہت دور دشتِ غربت میں
بھٹکتے قدموں پہ جن کی بنت کی راہ کھلی
خمارِ بادہ و آغوشِ مہ وشاں میں جنہیں
جنم جنم کی اذیت سے۔۔کچھ نجات ملی

وہ سارے خواب جو دیکھے تھے تیری نسبت سے
وہ سارے خواب سرِ لحظہ قیامت ہیں
فضا میں گونج رہی ہے کوئی صدائے بگل
نکل گئی ہے بدوشِ ہوا نجانے کدھر
وہ رہ جو روٹھے ہوئے وحشیوں کو گھر لائے۔۔۔!

سو بات ٹھہری یہی عرصہ گاہ الفت میں
کہ ترکِ خود کا ہنر ہو کہ ہو وہ کوئی چلن
ہر ایک لمحہ نئے خواب بنتے رہنے کا
کوئی ضرور نہیں سب کو راس آ جائے۔۔۔۔۔!

جمیل الرحمٰن

جہاں انا کی کوکھ سے خوف جنم لے

ہوا نے۔۔۔۔۔۔۔۔۔جتنے دائرے کھینچ دئے ہیں
ان میں رہنا ہی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔بہتر ہے
ظاہر اور باطن کی گونجتی لے پر۔۔۔۔۔۔۔۔اٹھتے
تیز قدم پر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گھوم کے دیکھو
آدمی۔۔۔۔۔۔۔۔سب کچھ اپنے لئے ہی کرتا ہے
کوئی بھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔خاکہ کھینچے
اسے۔۔۔۔۔۔۔ وہ اپنے ہی رنگوں سے بھرتا ہے
میرے لئے تو ظاہر اور باطن میں کوئی فرق نہیں ہے
ہاں۔۔۔۔۔۔۔۔ ۔۔اک خوف کا خوف ہے
جس کے سبب ۔۔۔دونوں ہی دھندلا جاتے ہیں
اسی لئے تو میں نے تمہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کہا نا!
ہوا نے جتنے دائرے ۔۔۔۔۔۔۔کھینچ دئے ہیں
ان کی گرفت میں رہنا ہی ۔۔۔۔۔۔ بہتر ہے
جب تک ہوا کے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ساتھ اٹھیں
اس کے دامن میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ٹھہریں
بادل ۔۔۔۔۔۔۔۔روئے خاک پہ لہراتے ہیں
جہاں انا کی کوکھ سے۔۔۔۔۔۔۔۔۔خوف جنم لے
ہوا کا دامن چھوڑ کے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔بادل
سب کچھ کھو کر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔پانی ہو کر
بہہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جاتے ہیں!!

جمیل الرحمٰن (ہالینڈ)

خاموشی کا سچ

اب مرے ہاتھ --------
ترے جسم کے مابین وہ دیوار ہے خاموشی کی
ساعتِ قرب جسے توڑنے کی کوشش میں
خود سے بیزار ہوئی جاتی ہے------!

لمحہء وصل ہی سب کچھ تھا اگر
پھر یہ تماشہ کیا ہے----------؟
روح میں ایسا تو سناٹا نہیں تھا پہلے
اب یہ خاموشی -- یہ قصہ کیا ہے---؟

یہ عجب خامشی ہے
جس کی دہلیز پہ تم
غیر سے وصلِ گذشتہ کے سبھی رنگ نظر میں بھر کر
وصل آمادہ ہو مجھ سے کہ نیا کوئی گلِ خواب کھلے
زندگی جس میں دھڑکتی ہو
وہ اک گوہرِ نایاب ملے
اور ہوا ہے کہ سسکتے ہوئے چلاتی ہے،
سر پٹختی ہے، فضا روندتی ہے،
شورِ قیامت میں بدل جاتی ہے----!

میں کہ اس شور میں جو حاصلِ خاموشی ہے
کھوج میں سچ کی،
ترے اور مرے سچ کی
بہت دیر، بہت دور، لئے دیدہء نم
تیز قدم چلتا ہوں
تا کہ اس خامشی کا بعد کہیں تو طے ہو---!

لیکن ایسے میں فقط اپنے لہو میں غلطاں
خواب آنکھوں میں ابھر آتے ہیں
اور مرے ہاتھ، ترے جسم کے مابین اتر آتی ہے
سرد دیوار اسی خامشی کی
ساعتِ قرب جسے توڑنے کی کوشش میں
خود سے بیزار ہوئی جاتی ہے------!!!!!!

اقبال نوید (برطانیہ)

ایک بے کار آنسو کی صورت گرے

ہم نے دل سے محبت کو رخصت کیا
اور بارود کی دھڑکنوں کے سہارے جئے
خود کو نفرت کے چشموں سے سیراب کرتے رہے
ایک شعلہ بنے
تا کہ آرام گاہوں میں پلتے ہوئے
بے حسوں کی حفاظت رہے
خواب گاہوں میں پردے لٹکتے رہیں
رقص جاری رہے
تا کہ محلوں کے آقا کے دربار میں
ایک تالی سے سب کچھ بدلتا رہے
جتنے ایوان ہیں
دوسروں کے اشاروں کی تعظیم میں
سر ہلاتے رہیں

ہم نے دل سے محبت کو رخصت کیا
ایک شعلہ بنے
تا کہ بیٹوں کے لاشے تڑپتے رہیں
بین کرتی ہوئی بیٹیوں سے پرے
اپنے کشکول ہاتھوں سے لکھے ہوئے
عہد ناموں کی تحریر پڑھتے رہیں
ہم سے بہتر تھے وہ
جن کے ٹکڑے ہوئے
جو جنازوں کی صورت اٹھائے گئے
ایک بیکار آنسو کی صورت گرے
ہم وہ تلوار تھے
جو عجائب گھروں کے لئے رہ گئی
ایسی بندوق تھے
جس کو مفلوج ہاتھوں میں سونپا گیا

اقبال نوید

رُت بدلنے لگے

کتنی عمریں ترے راستے میں کٹیں
تیرے آنے کی امید دل میں لئے
جس نے جو بھی کہا
اس کو سچ جان کر
ہر صدا کے تعاقب میں چلتے رہے
ہر کسی عکس کو ہم مسیحا سمجھتے رہے
روشنی کی کرن ڈھونڈتے ڈھونڈتے
پاؤں چھالے ہوئے
تیرے رستوں میں ہاتھوں کے بینر لئے
تیری چاہت کے ہم گیت گاتے رہے
جو بھی آیا------
اسے دیوتا جان کر
خشک ہونٹوں سے نعرے لگاتے رہے
آنکھ مایوس تھی
پر دل منتظر کو یہ امید تھی
ایک دن وہ زمیں پر اتر آئے گا
وہ مسیحا-----
کہ جس کے لئے لوگ ہر مرتبہ
اپنے خوابوں کی تعبیر لکھتے رہے
اپنے حالات کے کوہساروں سے لڑتے رہے

تیرے آنے سے پہلے یہاں کچھ نہ تھا
صرف امید کا ایک چشمہ-----
جسے دیکھ کر پیاس بڑھتی رہی

لہلہاتے ہوئے کھیت بنجر ہوئے
آنگنوں سے چمکتی ہوئی دھوپ ڈھلنے لگی
لوگ بیمار آنکھوں سے تیرے لئے
راستوں میں محبت بچھاتے رہے
اب بھی امید ہے
تو کبھی خاک زادوں کی صف سے نکل آئے گا
تو جو آ جائے
نغمے بکھرنے لگیں
رت بدلنے لگے------پھول کھلنے لگیں
زخم مرہم بنیں
اب امید ہے
لوگ خوش ہیں مگر چوٹ ہی چوٹ ہیں
وہ بھلا کیا کہیں
وہ تو بس ووٹ ہیں!

اقبال نوید

تاریخ کا چہرہ نہیں بدلا

زمیں قدموں کے نیچے رینگتے کیڑے مکوڑوں کی
سسکتی زندگی کو موت میں تبدیل ہوتے دیکھتی ہے
اور خاموشی سے اپنی گردشِ پیہم میں رہتی ہے
نگاہیں راستوں میں نصب بارودی سرنگوں،
کٹ چکے جسموں، پھٹی آنکھوں،
ڈھلکتی گردنوں میں جھولتے پھندوں کی شاہد ہیں
فضا نوحہ کناں گیتوں سے افسردہ
عزاداروں کی چیخیں آسمانوں سے الجھ کر لوٹ آتی ہیں
محافظ اور لٹیروں کی ابھی پہچان مشکل ہے
زمانہ امن کا پیغام لے کر تیل کے چشموں پہ بیٹھا ہے
کہ جب تک اونگھتی مخلوق غفلت کی مسلسل نیند سے
بیدار ہو جائے
یہ استحصال ان کی آنکھ کو جھنجھوڑ کر رکھ دے
گلوبل جتنے منصوبے ابھی تکمیل کی سیڑھی پہ رکھے ہیں
وہ سب انجام دینے ہیں

ابھی تاریخ کا چہرہ نہیں بدلا
کبھی تاجر مہذب بھیس میں آتا ہے،
صدیوں تک نہیں جاتا
کہیں خوش حالیاں وحشی درندے کھینچ لاتی ہیں
کبھی قرضوں کی زنجیروں سے فصلیں سوکھ جاتی ہیں
ضرورت جب تلک باقی ہے----
محتاجی بھی باقی ہے
وسائل کا خزانہ، ناتواں قوموں کا ایسا جرم ہے
جس کی سزا طاقت کی مستی میں فقط لشکر کشی ہے
اور دنیا کے بڑوں کی گود میں بیچارگی ہے
جو اگر چاہیں کسی کو بھی ہلاکت خیزیوں کی نذر کر ڈالیں
جو اپنے فیصلوں سے پستیاں تقسیم کرتے ہیں
کہ جن کی روشنی قوموں کو تاریکی میں رکھتی ہے
جو اپنی بالادستی کے لئے چالیں بدلتے ہیں
جنہیں خدشہ ہے ان کی دسترس کمزور پڑنے سے
مقید رینگتی دہشت زدہ نسلیں
معیشت کی غلامی توڑ سکتی ہیں
یہ اپنے کھیت کی مٹی سے رشتہ جوڑ سکتی ہیں

جدید ادب شمارہ: ۱۰، جنوری تا جون ۲۰۰۸ء

اقبال نوید

شجر اپنی زمیں جب چھوڑتے ہیں

سبھی کچھ تھا
جسے ہم چھوڑ کر گھر سے نکلنے کے لئے بیتاب رہتے تھے
سبھی کچھ تھا
مگر ہم یہ سمجھتے تھے
کہ اپنے واسطے اس سرزمیں پر کچھ نہیں رکھا
درو دیوار اندر سے قفس معلوم ہوتے تھے
محبت اور نفرت تھی ۔۔۔۔۔۔ جو اپنی تھی
ہوائیں، بارشیں، خوشبو، سنہری دھوپ کا موسم
سبھی وہ کچھ جو افسانوں میں ہوتا ہے
وہ ہنگامے جنہیں دیکھے ہوئے اک عمر گزری ہے
وہ اپنے لوگ ۔۔۔۔۔۔
جو اب آنسوؤں کے گھر کا مسکن ہیں
مگر اس وقت جب ہم سانس بھی لیتے
گھٹن ایسی کہ جیسے دم نکلتا ہو
یہی لگتا تھا
جیسے اجنبی لوگوں میں زندہ ہیں

ہمیشہ خواب کی دہلیز پر بیٹھے ہوئے یہ سوچتے رہتے
کہ اپنی آنکھ جب کھولیں
تو منظر ہی بدل جائے
کسے معلوم تھا
منظر بدلنے سے وہی کردار رہتے ہیں
وہی دیوار بینائی کو کچھ کرنے نہیں دے گی
وہی زنجیر پاؤں میں
وہی تصویر آنکھوں میں
نگاہوں میں وہ سب کچھ ہے
کہ جب سرسبز شاخوں پر ہمیشہ پھول کھلتے تھے
خزاں کی رت میں بھی اک تازگی محسوس ہوتی تھی
۔۔۔۔۔۔۔
مگر اب زندگی آرائشی پھولوں میں،
خوشبو کانچ کی
بوتل کے اندر قید ہم پر مسکراتی ہے
ہمارے ہاتھ خالی ہیں
مگر ذہنوں میں گزرے روز و شب کی ایک البم ہے
خبر کیا تھی
شجر اپنی زمیں جب چھوڑتے ہیں
سوکھ جاتے ہیں

گوپی چند نارنگ مصنف یا مترجم؟

ادارتی نوٹ: حیدر قریشی

عمران شاہد بھنڈر کا گوپی چند نارنگ کی کتاب ''ساختیات، پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات'' کے اصل مآخذات کے انکشاف کے حوالے سے یہاں دوسرا (جوابی) مضمون دیا جار ہا ہے۔ پہلا مضمون 'جدید ادب' شمارہ نمبر ۹ میں شائع ہو چکا ہے۔ جدید ادب کے گزشتہ شمارہ میں عمران شاہد بھنڈر کا مضمون شائع کرتے ہوئے میں نے بڑی صراحت کے ساتھ لکھا تھا کہ اس مضمون کا جواب گوپی چند نارنگ صاحب کو خود دینا چاہئے۔ کیونکہ عمران شاہد بھنڈر کے ساتھ طے ہوا تھا کہ دوسرے شاعروں، ادیبوں اور قارئین کا ردِعمل تو شائع کیا جائے گا لیکن مضمون کا اصل جواب صرف ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کی طرف سے آنے پر ہی شائع کیا جائے گا۔ نارنگ صاحب نے تا حال جواب دینے کی زحمت نہیں فرمائی۔ عام معترضین کے جواب میں خاموشی شانِ استغناء ہو سکتی ہے لیکن علمی سطح پر سرقہ کا مدلل الزام سر پر پڑا ہو تو ایسی صورت میں خاموشی معنی خیز ہی نہیں بلکہ مجرمانہ ہو جاتی ہے۔

اس دوران برادرِ عزیز جاوید حیدر جوئیہ صاحب نے میری طرف سے رائے پوچھنے پر پورا مضمون عنایت کر دیا۔ اصولاً مجھے صرف نارنگ صاحب کا جواب چھاپنا تھا [اب بھی ان کے ہی جواب کو چھاپنا چاہتا ہوں، جس میں وہ بطور خاص مغربی کتابوں سے بغیر حوالے کے ترجمہ (سرقہ) کرنے کے اپنے فعل کے بارے میں وضاحت فرمائیں]۔ اب جاوید حیدر جوئیہ صاحب کا جواب چھاپنا میرے لئے ذاتی طور پر واجب ہو گیا تو عمران شاہد بھنڈر صاحب سے اس کا جواب مانگنا بھی لازم ہوا۔ سو دونوں ردِعمل قارئین کی خدمت میں پیش ہیں۔

عمران شاہد کے مضمون پر قارئین ادب کا جو مختصر ردِعمل سامنے آیا ہے اسے خطوط کے صفحات میں شامل کیا ہے۔ یہاں ان پانچ مکتوب نگاروں سے معذرت کرنا بھی ضروری ہے جنہوں نے مختصر ردِعمل میں کچھ غیر متعلق باتیں چھیڑ کر نارنگ صاحب کی ذات کو ہدف بنا لیا۔ میں نے وہ پانچ خطوط شائع نہیں کئے۔ ایسے ایک مکتوب میں ''حالی کے بعد والے کی علمی بدحالی'' کے الفاظ نرم ترین الفاظ کہے جا سکتے ہیں۔ اصلاً عمران شاہد نے نارنگ صاحب کو بلا حوالہ ترجمہ کے شائستہ الفاظ سے ملزم کیا تھا لیکن ان کے غیر ضروری دفاع کے نتیجہ میں اب براہ راست سرقہ کی بات ہونے لگی ہے۔ گوپی چند نارنگ کے دفاع سے انکار کرتے ہوئے ان کا دفاع کرنے والے جاوید حیدر جوئیہ صاحب کے مضمون کا مجموعی تاثر میرے نزدیک یہ بنا کہ نارنگ صاحب کی غلطی کا ہلکا سا اقرار کر کے پھر اسے جلدی میں حوالہ نہ دے سکنے اور صفحات کی نمبرنگ نہ دے پانے سے جوڑ کر بے ضرر غلطی بنا دیا۔ اس کے بعد مضمون کی روح اور اصل کو چھوڑ کر فروعات میں بحث کو الجھا دیا، تا کہ نارنگ صاحب کے بلا حوالہ تراجم/سرقہ سے توجہ ہٹ جائے۔ جہاں تک دوسرے اشوز کا تعلق ہے ذاتی طور پر میں عمران شاہد کے مقابلہ میں جاوید حیدر جوئیہ سے زیادہ قریب ہوں۔ لیکن یہاں ان پر ساری توجہ مرکوز کرنا نفسِ مضمون ''بلا حوالہ ترجمہ/سرقہ'' کی طرف سے توجہ ہٹا کر درحقیقت دوسرے مباحث میں الجھا دینا ہے۔ اگر جوئیہ صاحب ایسا کچھ لکھتے کہ **''نارنگ صاحب کے جو اقتباسات دیئے گئے ہیں وہ حیران کن ہیں اور بے شک انہیں ان کے بارے میں وضاحت کرنی چاہئے کہ ایسا کیسے ہو گیا ہے۔ اس سلسلہ میں انہیں کی وضاحت سے ہی اصل معاملہ واضح ہو گا۔ تاہم میں اس مضمون سے قطع نظر کرتے ہوئے عمران شاہد کے دوسرے مندرجات پر توجہ دینا چاہتا ہوں''**، تو ایسے جواب کے لئے عمران شاہد سے جواب حاصل کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ عمران شاہد کے جوابی مضمون کے سلسلہ میں بھی یہ عرض کر دوں کہ میرے نزدیک جاوید حیدر جوئیہ خود پڑھے لکھے آدمی ہیں اور ان کا مشیروں کا کوئی ایسا معاملہ نہیں ہے جیسا عمران شاہد نے لکھا ہے۔ چونکہ دونوں طرف تھوڑا بہت غصہ ظاہر ہوا ہے تو غبار نکالنے کے لئے دونوں تحریریں پیش خدمت ہیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ دونوں طرف سے تلخی تدریجاً کم ہو گی اور نارنگ صاحب کے بلا حوالہ تراجم/سرقہ کے بارے میں غیر ضروری الزام تراشی اور غیر ضروری دفاع دونوں سے گریز کر کے حقیقت کو کھل کر سامنے آنے دیا جائے گا۔ بہر حال یہ بحث اب جس رنگ میں بھی چل نکلی جدید ادب کے صفحات حاضر ہیں۔

عمران شاہد کے بارے میں یہاں بتاتا چلوں کہ انہوں نے ۲۰۰۴ء میں یونیورسٹی آف سینٹرل انگلینڈ، برمنگھم سے ''انٹرنیشنل براڈ کاسٹ جرنلزم'' میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد ۲۰۰۶ء میں انہوں نے اسی یونیورسٹی سے ''انگلش لٹریری سٹڈیز'' میں ایم اے کی دوسری ڈگری حاصل کی۔ عمران بھنڈر نے اپنا مختصر مقالہ جرمن فلسفی عمانوئیل کانٹ کے فلسفہ جمالیات پر تحریر کیا اور فائنل مقالہ بیسویں صدی کی روسی تنقید پر لکھا جس میں انہوں نے لیون ٹراٹسکی کے نظریہ ادب کا ہیئت پسندوں کے نظریات سے تقابلی جائزہ لیا۔ اس وقت وہ پی ایچ ڈی کے مقالے پر کام کر رہے ہیں۔ جدید ادب کے شمارہ نمبر ۹ میں شائع شدہ ان کا مضمون عکاس اسلام آباد شمارہ ۶ میں مزید اقتباسات کے اضافوں کے ساتھ چھپا ہے۔ یہ سارے اضافے مغربی مصنفین کے مزید بلا حوالہ تراجم یا سرقہ (اصل میں دونوں ایک ہیں) کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس شمارہ میں جو اقتباسات شامل ہیں وہ جدید ادب ۹ اور عکاس ۶ والے اقتباسات کے علاوہ ہیں اور ابھی ایسے اقتباسات کی دریافت کا سلسلہ کہیں رکنے کا نام نہیں لے رہا،

عمران شاہد نے اس بار یہ دعویٰ کیا ہے کہ **گوپی چند نارنگ نے ٹیرنس ہاکس کی ساری کتاب کو صرف چند ایک پیراگرافس کی ترتیب بدل کر لفظ بہ لفظ اپنے نام سے اردو میں شائع کرایا ہے۔ یہ محض الزام تراشی نہیں ہے، بلکہ اردو ادب کی اعلیٰ ترین علمی سطح کی افسوسناک صورتحال ہے۔** ڈاکٹر گوپی چند کی شانِ استغناء پر مبنی خاموشی برحق، لیکن اتنا کچھ سامنے آنے کے بعد ترجمہ یا سرقہ کے حوالے سے اپنے کئے کرائے کی انہیں خود ہی وضاحت کرنا ہو گی۔ تمام سابقہ اور موجودہ سرقوں کے ساتھ ٹیرنس ہاکس کی کتاب کے حوالے سے نارنگ صاحب کو اب توجہ فرمانی چاہئے۔ اگر ٹیرنس ہاکس کی کتاب میں سے دو تین پیراگراف ایسے ہوں جنہیں نارنگ صاحب نے اپنی کتاب میں ترجمہ نہ کیا ہو تو وہ یا ان کا کوئی بھی خواہ ان پیراگرافس کی نشاندہی کرے، میں ان پیراگرافس کو شامل نہ کرنے پر ان سے معذرت کروں گا۔ خدا نہ کرے کہ انگلینڈ کے متعلقہ پبلشر کے علم میں یہ ساری داستان آ جائے اور وہ ڈاکٹر نارنگ صاحب کو کاپی رائٹ ایکٹ کی خلاف ورزی کا نوٹس بھیج دے۔

ردِ عمل

جاوید حیدر جوئیہ (بورے والا)

عمران شاہد بھنڈر رشاہد صاحب کا مضمون بہ عُنوان ''گوپی چند نارنگ مترجم ہیں، مصنف نہیں'' مَیں نے پڑھا۔ یہ تحریر اِسی مضمون پر اپنے ذاتی تاثرات کے لیے ہے۔ بات شروع کرنے سے پہلے یہ وضاحت کرنا بھی مَیں ضروری سمجھتا ہوں کہ گوپی چند نارنگ صاحب یا بھنڈر صاحب کی حمایت، تائید، یا پھر ان کی مخالفت میرا مقصد نہیں ہے۔ جہاں نارنگ صاحب نے انگریزی کتابوں کے حوالے نہ دے کر زیادتی رزیادتیاں کی ہیں، وہاں بھنڈر صاحب نے بھی کُچھ زیادتیاں کی ہیں ___ کُچھ نارنگ صاحب کے ساتھ، اور کُچھ خود اپنے ساتھ۔

گوپی چند نارنگ صاحب کے حوالے سے بھنڈر صاحب کی سوچ کے چند زاویے جو اُن کے زیرِ نظر مضمون ''گوپی چند نارنگ مترجم ہیں، مصنف نہیں'' سے سامنے آئے ہیں، یہ ہیں:

۱: نارنگ مصنّف نہیں ہیں

۲: نارنگ محض مترجم اور نقال ہیں۔

۳: نارنگ نے پوسٹ ماڈرن ازم جو مغربی سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی سرگرمیوں کا نتیجہ تھا، کا تعارف اہلِ اُردو سے کرایا۔

۴: سوسئیر کا لسانیاتی نظریہ سائینسی ہونے کا دعویدار تھا۔ اس لیے اس میں معنی کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے ترامیم کی گئیں۔

۵: سائینسی نظریات دنیا کی کسی بھی لیبارٹری میں ایک جیسے نتائج پیدا کرتے ہیں۔

۳: اُردو میں ساختیات کو نئے زاویے سے داخل ہونا چاہیے تھا، اور یہ زاویہ ہندوستانی اور پاکستانی معاشرے کی ضروریات اور ترجیحات کے مطابق دفاعی حربہ ہونا چاہیے تھا۔

۴: ساختیات کے بارے دفاع تو ایک طرف گوپی چند نارنگ کی وضاحتیں بھی مشکوک نکلیں۔

۵: اُردو بھی اپنی ایک ساخت رکھتی ہے، اس میں معنی کو پیدا کرنے والے اصول وقواعد کو سوسئیر کے لسانیاتی نظریے کی رُو سے اخذ کیا جاسکتا ہے۔

۶: یہاں یہ واضح رہے کہ گوپی چند نارنگ نے مصادر میں کُتب کی تفصیل دے رکھی ہے، اور جہاں

انھوں نے ضروری سمجھا، صفحات کی تفصیل بھی رقم کی۔ جو تفصیل اُنھوں نے دے رکھی ہے، اس مضمون میں انھیں فکری دیانت کی بنا پر نظر انداز کیا گیا ہے۔

۷: ۔لیکن اتنی اہم اغلاط کی پردہ پوشی کرنا اردو ادب میں قائم شدہ روایت کو مزید طول دینے کے مترادف ہے، جو یقیناً قابلِ تحسین عمل نہیں ہے۔

۸: کتاب کا وہ حصہ جو مشرقی شعریات پر مبنی ہے، وہ میری تحقیق کا قطعاً موضوع نہیں تھا، اس لیے وہ حصہ اس مضمون کی بحث سے خارج ہے۔

۹: گوپی چند نارنگ کو بھی مغرب میں Jazz کی دھن پر کشش محسوس ہوتی ہے، لیکن ہندوستان میں غیر انسانی جرائم کا ارتکاب متحرک نہیں کرتا۔۔۔۔

۱۰: کتاب (ساختیات، پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات) میں کسی بھی جگہ اور تجنیلیٹی نہیں۔

۱۱: کتاب میں بعض جگہوں پر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گوپی چند نارنگ ارادتاً اپنے مسائل کی پردہ پوشی میں مصروف ہیں۔

۱۲: ۔۔(گوپی چند نارنگ) دیباچہ میں لکھتے ہیں، ''متن ہر گز خود مختار و خود کفیل نہیں ہے کیونکہ اخذِ معنی کا عمل غیر مختتم ہے'' (ص۱۱)۔ نارنگ صاحب سے یہاں یہ غلطی سرزد ہوئی ہے کہ وہ اخذِ معنی کو متن سے باہر دیکھ رہے ہیں۔

۱۳: اسی کتاب کے چوتھے باب میں جو ردِ تشکیل کے نام سے لکھا گیا ہے، اس میں موصوف لکھتے ہیں: ''دریدا کا کہنا ہے معنی کوئی ماورائی موجودگی نہیں ہے جو متن سے ورے، قریب یا دور وجود رکھتی ہو، اور جس کو نقاد ڈھونڈ نکالے۔ معنی متن کے اندر ہے، اور جیسے ہی متن تحریر ہوتا ہے، وہ اپنی ردِ تشکیل کا بیج بو دیتا ہے'' (ص۲۳۲) گوپی چند نارنگ کے مندجہ بالا دونوں بیانوں میں واضح تضاد ہے، جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ انھیں مابعد جدید تھیوری کی تفہیم کی مزید ضرورت ہے۔۔۔

۱۴: گوپی چند نارنگ چونکہ (مغرب سے ہٹ کر) دوسرے تناظر میں ہیں، اس لیے بھی انھیں مابعد جدیدیت کی رو سے اپنا ڈسکورس تشکیل دینا پڑے گا۔

(مضمون کے صفحات نمبرز راقم نے عمداً نہیں دیے، تاکہ ''جدید ادب'' کے قارئین بھنڈر صاحب کے سارے مضمون کو پڑھ کر میری معروضات پر نظر ڈالیں)

بھنڈر صاحب کے مضمون کا عنوان پڑھتے ہی مجھے پہلا یہ خیال آیا کہ انھیں 'مترجم' کہنے سے آخر کیا ثابت کرنا مقصود ہے؟ لیکن سارا مضمون دو تین بار پڑھ چُکا تو جو کُچھ مجھے محسوس ہُوا وہ نہایت دیانت داری سے قارئینِ ''جدید ادب'' کے مطالعہ کے لیے پیش کر رہا ہوں۔

ذرا نیچے نظر گئی تو دِل ذرا مرعوب سا ہُوا کہ حیدؔر قریشی صاحب نے یہ نوٹ بھی دے رکھا تھا کہ بھنڈر صاحب Postmodern literary theory کے موضوع پر برمنگھم یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی بھی کر رہے ہیں۔ مَیں سوچنے لگا کیا پوسٹ ماڈرن ازم ''تھیوری'' ہے؟

اس کے بعد نظریں پڑھتے پڑھتے بھنڈر صاحب کے اس جملے پر آ کر ٹھہر گئیں: ''۔۔۔ساختیات در اصل ایک لسانیاتی تحریک تھی، جسے سوئس ماہرِ لسانیات سوسئیر کے لسانیاتی ماڈل سے اخذ کیا گیا۔ یہ لسانیاتی نظریہ چونکہ سائینسی ہونے کا دعویدار تھا، اس لیے اس ماڈل میں معنی کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے ترامیم کی گئیں۔''

''ترامیم''؟؟ مَیں سوچنے لگا کہ یہ Amendments کس نے کی ہوں گی؟ لاکاںؔ نے Psychoanalysis کی نئی تشریح کے لیے یا دریؔدا نے Differance کے لیے؟ اور یہ ''ترامیم'' تھیں یا سوسئیرؔ کے لسانیاتی ماڈل کی جداگانہ تشریحات اور توسیعات؟ خیر، مَیں نے اَپنے اِس خیال کو بھی جھٹک دِیا کہ جھٹکنے ہی میں عافیت تھی۔

بھنڈر صاحب نے یہ بھی درست لکھا کہ دریؔدا کے بہ قول ''متن سے باہر کُچھ نہیں ہے''۔ لیکن اس ''متن'' کی تشریح یا وضاحت مجھے کہیں دکھائی نہیں دی۔ کیا بھنڈر صاحب کے نزدیک متن محض وہ ہے جو لفظوں پر مشتمل اور قلم سے لکھا جاتا اور چھاپہ خانے میں چھاپا جاتا ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو بھنڈر صاحب کی یہ رائے بالکل درست ہے کہ ''۔۔ جونہی متن وجود میں آتا ہے، اس کی حیثیت خود مختار ہو جاتی ہے''، لیکن نظری سطح پر ہی سہی، معانی کے ''نا مختتم طور پر ملتوی اور فرق پر ہوتے جانے'' سے اُس کی ''خود مختاری'' کس حد تک قائم رہ سکتی ہے؟ مجھے اس کا کوئی جواب بھنڈر صاحب کی تحریر سے نہیں مِلا۔ Differance کا عمل معنی کو defer اور differ کرتا رہے، اور اس کا کوئی انت اور آخری تھاہ نہ ہو، تو ''متن'' کا ''اختیار''، یا اتھارٹی کی کیا حیثیت ہوگی؟ معاملہ لاینحل رہا۔ پھر جب پڑھا:

''۔۔۔اُردو میں ساختیاتی فکر کس طرح داخل ہوئی ہے؟ مجھے اُمید تھی کہ یہ ایک نیا زاویہ ہوگا۔ امید تھی کہ ہندوستانی اور پاکستانی معاشرے کی ضروریات اور ترجیحات کو سامنے رَکھ کر کسی حد تک دفاعی حربہ اِستعمال کیا ہوگا، کیونکہ علوم کے حوالے سے مغرب پر سبقت کا خیال محض اب داستانِ پارینہ بن کر رہ گیا ہے۔ دفاع تو دُور گوپی چند کی وضاحتیں بھی مشکوک نکلیں۔ جوں جوں اُن کی کتاب کا مطالعہ کرتا رہا مایوسی بڑھتی رہی۔ کیونکہ کتاب میں کسی بھی سطح پر اور تجنیلیٹی کا فقدان تھا۔۔۔''

مَیں سوچتا رہا کہ کیا ساختیات ہر مُلک میں الگ الگ ہے؟ الگ الگ ہے تو یہ 'سائینس' کیسے ہو گئی؟ اور سائینس ہے، اور بہ قول بھنڈر صاحب، ''سائینسی نظریات دنیا کی ہر لیبارٹری میں ایک ہی جیسے نتائج پیدا کرتے ہیں''، تو پھر سائینس کا 'دِفاع' کیوں کر ممکن ہے، اور وہ کون کون سی سائینسز ہیں جنھیں ملکی 'معاشروں کی ضروریات اور ترجیحات' کو مدِ نظر رکھ کر ''دفاعی حربہ اختیار'' کیا گیا ہے؟ جملۂ معترضہ کے طور پر عرض ہے کہ 'دفاع' تو نہیں البتہ ڈاکٹر وزیر آؔغا نے ساختیات کے ''مرکزیت'' کے تصوّر کو وحدت الوجود کی فکر کے مماثل کہا ہے، اور بجا

طور پر کہا۔ اس کا احساس مجھے پچھلے دنوں ایک انگریزی کتاب میں دریؔدا کے اُس مقالے کا ایک حصہ پڑھتے ہوئے ہُوا جو اُس نے جان ہاپکنز یونیورسٹی میں ساختیات کے موضوع پر ہونے والے مذاکرے میں پڑھا، اور جس سے پسِ ساختیات کا ایک نیا دَر وَا ہو کر ڈیکنسٹرکشن کے تصوّر پر منتج ہُوا۔ (اس کی تفصیل کتابی سلسلہ '''حریمِ اَدَب'' کتاب۔۲ میں عنقریب شائع ہوگی)

سچ جانیے کہ بھنڈر صاحب کا متذکرہ بالا جملہ پڑھ کر مجھے گوپی چند نارنگؔ پر اور بھی 'تپ چڑھی'۔ مَیں نے سوچا یہ شخص اَدَبی نقّاد ہی کیوں رہا، سیاسی لیڈر یا سوشل مفکر بن کر ''مَیدانِ کارزار'' میں کیوں نہیں آیا؟ اپنی کوئی غریبوں کی پارٹی کیوں تشکیل نہیں دی؟ جب کہ اسے علم ہونا چاہیے تھا کہ برطانیہ میں مقیم 'پوسٹ ماڈرن لٹریری تھیوری' کے پی۔ایچ ڈی کے ایک محترم اُردو محقّق جناب عمران شاہد بھنڈر کی صائب خواہش ہے کہ ساختیات کو پاکستانی اور ہندوستانی معاشروں کی ترجیحات کے مطابق 'نافذ العمل' دِکھایا جائے۔

''اور تجنیلیٹی'' کا لفظ بھی بھنڈر صاحب کا ساختیات کے حق میں ایک بڑا 'دفاعی حربہ' ہے۔ حالانکہ جولیا کرسٹیؔوا کی پیش کردہ Intertextuality کی تھیوری بتاتی ہے کہ کوئی متن ''خود مختار'' نہیں، بلکہ یہ دوسرے متن یا متون کی تقلیب Transformation سے پیدا ہوتا ہے۔ 'اوریجنل' کا کوئی اور بھی مفہوم ہے؟۔ ہاں اِستفادے کی بعض کُتب کے صفحات کے نمبرز اپنی کتاب میں درج نہ کرنا البتہ گوپی چند نارنگؔ صاحب کا 'گناہِ کبیرہ' محسوس ہُوا۔ جس سے اُنھیں توبہ کرنی چاہیے۔ اب ہمیں توقع رکھنی چاہیے کہ بھنڈر صاحب اپنی تحقیق کا دائرہ اُردو میں مارکسزم، جدیدیت، وجودیت وغیرہ کا تعارف کرانے والوں کی کتابوں تک بھی پھیلائیں گے، اور مزید ''مترجمین'' کو آشکار کریں گے، اور اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ انھیں صرف گوپی چند نارنگ کو ''ننگا'' کرنا مقصود تھا۔ انھیں لازماً چاہیے کہ وہ 'اردو میں پہلے سے قائم' اس روائتی حمام کے سب ننگوں کو ننگا دکھائیں۔ زیرِ نظر مضمون سے یہ واضح نہیں ہے کہ بھنڈؔر صاحب کا Origin ہندوستانی ہے یا پاکستانی۔ اگر وہ ان میں سے کسی بھی ملک کے باشندے رہے ہیں، یا اَب بھی ہیں، تو اُن سے یہ بھی اُمید رکھی جا سکتی ہے کہ جب وہ اُردو اَدَب میں Plagiarism کی اپنی تحقیق اور انگریزی اَدَب کی اپنی پی۔ایچ۔ڈی مکمل کر لیں گے تو وہ 'پوسٹ ماڈرن لٹریری تھیوری' کو پاکستانی اور ہندوستانی معاشروں کی 'ضروریات اور ترجیحات کے مطابق' اور ان کا 'دِفاع' کرنے کے بعد، اپنے مقالے کو اردو یا ہندی میں ترجمہ کرنے کے بعد واپس اُسی خطۂ زمین کی طرف لَوٹیں گے، جہاں اُن کے بہ قول: ''برّصغیر کے ساٹھ کروڑ عوام خطِ افلاس سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں''، اور ''دُنیا کا پچاسی فی صد سرمایہ چار سو نوّے خاندانوں کے پاس مرتکز ہے''، ''یہ سب کچھ برصغیر کے دانشور کو آج بھی نظر نہیں آتا۔۔۔۔''

اور امید یہ بھی کی جانی چاہیے کہ وہ اُردو کی ''ترقی پسندی''، ماڈرنزم پر نہیں بلکہ 'پوسٹ ماڈرن لٹریری تھیوری' پر 'اپنا ڈسکورس' قائم کر کے ایسا کریں گے، کیونکہ اُن کے بقول:

''۔۔مغرب کی مرکزیت نہ صرف مابعد جدیدیت کے حوالے سے، بلکہ اُردو میں جدیدیت کی بنا پر بھی مسلّم ہے۔اس طرح ترقی پسندی جس کا مارکسیت کی حقیقی رُوح سے دُور کا بھی واسطہ نہیں تھا، جو صرف کم علمی کا نتیجہ تھی، اِس نے بھی اپنی مرکزیت کو پاک و ہند سے باہر تلاش کیا۔ مابعد جدیدیت ہو، جدیدیت ، یا پھر ترقی پسندی، یہاں پر ان کی مخالفت مقصود نہیں ہے، بلکہ مخالفت کو تخلیقی اور اختراعی جہت پر اُستوار کرنا ہے''

کہیں مجھے یہ بھی نظر آیا:

''پوسٹ ماڈرن ازم عہدِ حاضر کی غالب تحریک ہے، جسے بعض مغربی نظریہ ساز ہائی ماڈرن ازم کا بحران بھی قرار دیتے ہیں، یہی زاویہ فکر میرے مقالے کا موضوع ہے، جس کی تکمیل کے لیے مَیں یونیورسٹی آف سینٹرل انگلینڈ، برمنگھم سے منسلک ہوں۔ پوسٹ ماڈرن ازم میں برپا ہونے والے ادبی وتنقیدی نظریات کی تحقیق کے سلسلے میں، مجھے اُردو میں متعارف کرائے گئے نظریات تک رسائی کا موقع مِلا۔''

مَیں نے سوچا کیا بھنڈؔر صاحب کو اُردو کی طرف اس لیے آنا پڑا کہ پہلے ماڈرن ازم کی کسی انگریزی تحقیق میں اُردو کے Plagiarism کا کوئی حوالہ اُن کے پیشِ نظر تھا؟ یا وہ اُردو میں ہائی ماڈرن ازم کا کرائیسس کہیں دیکھ رہے تھے؟ ہوسکتا ہے! لیکن پھر مَیں نے سوچا یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ انھیں اپنے مقالے کی آسانی کے لیے اُردو بہ طَور ''ذریعہ'' زیادہ سہل ہونے کی اُمید ہو! لیکن اِس مضمون کا جواز تو پھر سمجھ میں آ نہیں رہا تھا۔

مَیں نے سوچا کہ سوچ کو مثبت رکھنا چاہیے۔شاید بھنڈؔر صاحب کو عنوان دینا چاہیے تھا ''گوپی چند نارنگؔ مترجم ہیں، محقّق نہیں'' تب مَیں نے خود سے کہا اِتنا اِختیار تو ہر کسی کو ہے کہ وہ اپنے Message کو جس طرح چاہے 'کوڈ' کرے،اس لیے تُم کون ہوتے ہوا ایسا مشورہ دینے کا سوچنے والے؟ یہی نہیں ہُوا بلکہ مجھے گوپی چند نارنگؔ صاحب پر بھی رہ رہ کر غصّہ آتا رہا کہ وہ جلدی میں کچھ ''اصل'' ماخذات کا حوالہ کیوں نہیں دیتے رہے؟ جبکہ کچھ کا بہ قول بھنڈر صاحب مصادر کی شکل میں دیتے رہے۔صرف اِتنا سا کام اَور کر لیتے تو بھنڈر صاحب کی'' فکری دیانت'' کو کوئی شکایت شاید نہ ہوتی۔

لیکن جب مَیں اس جملے پر پہنچا:

''گوپی چند نارنگؔ کو بھی بہ حیثیت شارح بہت سی مشکلات پیش آئیں۔۔۔''

تو مَیں سمجھا۔اوہو! بھنڈر صاحب دراصل ''مصنّف'' اور'' شارح'' کا سیگنیفائڈ ایک ہی سمجھتے ہیں۔تب تو یہ سب ٹھیک ہے! ذرا آگے بڑھا، تو پھر چونکا:

''۔۔۔اگر چند ایک اقتباسات لفظ بہ لفظ مصادر میں بغیر صفحہ نمبر کی تفصیل کے بیان کیے ہوتے تو تو شک کے فائدے کی بنا پر انھیں یقیناً نظر انداز کر دیا جاتا،لیکن اتنی اہم اغلاط کی پردہ پوشی کرنا اُردو اَدَب میں قائم شدہ روایت کو مزید طُول دینے کے مترادف ہے، جو یقیناً قابلِ تحسین عمل نہیں ہے''

تو یقین جانیے ،میری تو سِٹّی ہی گُم ہوگئی۔مُجھے پہلی بار معلوم ہُوا کہ اُردو اَدَب کی تنقیدی روایت میں صفحہ نمبر درج نہ کرنے کی روایت پہلے سے' قائم' ہے۔اِس لیے بھنڈؔر صاحب کا یہ مغربی جامعات کا اُصول اُردو اَدَب پر بھی لاگو ہونا چاہیے، اور سارے اُردو اَدَب پر Plagiarism کے'' قانون'' کے تحت'' ڈسپلنری ایکشن'' لیا جانا چاہیے، جس کے نتیجے میں بھنڈر صاحب کے الفاظ میں 'یونیورسٹی سے بے دخلی بھی ممکن ہوسکتی ہے'

اور مَیں سوچنے لگا کہ بھنڈؔر صاحب گوپی چند نارنگؔ صاحب سے ہی نہیں، بلکہ اُردو اَدَب کی ساری تنقیدی روایت (کے مصنفین یا شارحین) ہی سے ناراض ہیں۔مجھے یہ ناراضی بھی اچھّی لگی کہ دیکھیے کس خلوص کے ساتھ وہ انگریزی میں پی۔ایچ۔ڈی کے لیے اُردو اَدَب کی کتابوں پر غور وفکر کر رہے ہیں۔اور مَیں نے یہ بھی سوچا کہ اپنے نوٹ میں حیؔدر قریشی صاحب شاید یہ لکھنا بھول گئے ہیں کہ عمران شاہد بھنڈؔر صاحب کی تحقیق کا موضوع Plagiarism in Urdu literature ہے،اور سہواً Postmodern literary theory لِکھ گئے ہیں۔تاہم اگر ایسا نہیں بھی ہے ،اَور میرے فہم وادراک میں یہ خلل یونہی دَر آیا ہے،تو دِل کہنے لگا کہ بھنڈؔر صاحب اگر اَپنے لیے اِس موضوع کا چناؤ کر لیں تو اُنھیں ساری تاریخ ادبِ اُردو کا (صفحہ نمبرز ایڈیشن اور پبلشرز کے حوالوں کے ساتھ) اَنگریزی میں ترجمہ کرنے کا موقع بھی میسّر آجائے گا ،اَور پھر مقالے کے آخر میں وہی جملہ لکھ دینے سے برمنگھم یونیورسٹی سے ڈِگری بھی امتیاز کے ساتھ مِل جائے گی ،جس میں اُنھوں نے اِس ''نقل کے رُجحان'' کو اُردو اَدَب میں پہلے سے قائم ایک روایت کا 'تسلسل' بتایا ہے۔

گوپی چند نارنگ۔۔۔پہلی بار آئے تو جوگندر پال اوران کی بیگم بھی پنڈی میں تھیں اور میرے یہاں مقیم تھیں۔ہم اس فنکشن میں نہ جاسکے جس میں نارنگ نے کلیدی خطبہ پڑھنا تھا،لیکن اس فنکشن کی جو روداد لوگوں سے سنی وہ بڑی دلچسپ تھی۔نارنگ کو دو چار ناموں کے علاوہ کسی سے واقفیت نہ تھی ،انہوں نے اسلام آباد کے افسانہ نگاروں کی جو فہرست پڑھی وہ بہت ہی دلچسپ تھی۔ایک نام دوسرے سے جوڑ دیا گیا تھا۔مثلاً مظہر،اسلام احمد، داؤد جاوید،محمد منشا، یاد مرزا، حامد بیگ وغیرہ۔ظاہر ہے کسی نے انہیں نام لکھ کر دیئے تھے۔نارنگ صاحب نے ان کے غلط ٹکڑے کر دیئے ،آخر اسلوبیاتی نقاد جو ٹھہرے۔فنکشن کے بعد افسانہ نگاروں کا گروپ انہیں ملا، اپنی کتابیں پیش کیں۔نارنگ صاحب نے راتوں رات نام درست کیے،حوالے یاد کئے اور اگلی نشستوں میں یہ تاثر جما دیا کہ وہ فکشن کو با قاعدگی اور ترتیب سے پڑھتے ہیں۔نارنگ بہت اچھے مقرر ہیں۔بات کرنا اور محفل میں رنگ جمانا انہیں خوب آتا ہے۔اس کے بعد وہ دو یا شاید تین بار اور اسلام آباد آئے۔یہاں آتے تو ضیاء الحق سے بھی ضرور ملتے۔

(**ڈاکٹر رشید امجد** کی خودنوشت سوانح **تمنا بے تاب** سے اقتباس ص ۱۴۷،۱۴۸)

عمران شاہد بھنڈر (برمنگھم)

اردو ادب میں سرقہ اور اس کا دفاع کب تک؟

گزشتہ برس میں نے گوپی چند نارنگ کی کتاب ''ساختیات پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات'' میں نقالی کے رجحان کی نشاندہی کرنے کے لئے ایک مضمون بہ عنوان ''گوپی چند نارنگ مترجم ہیں مصنف نہیں'' تحریر کیا، جو پہلی بار ۲۰۰۶ میں ''نیرنگِ خیال'' کے سالنامے میں شائع ہوا۔ اُس کے بعد اس مضمون پر ازسرِ نو نظر ڈالی اور نئے تحقیقی مواد کی بنیاد پر چند اور اقتباسات بشمول تمام تفصیلات ضبطِ تحریر میں لایا، جو ''جدید ادب'' کے شمارہ نمبر ۹، جولائی تا دسمبر ۲۰۰۷ء میں دوبارہ شائع ہوا۔ اس مضمون میں تناظر کے اعتبار سے اپنی ترجیحات متعین کرنے کے سلسلے میں بھی چند حوالے مغربی مابعد جدید مفکروں (لیوٹارڈ، ہیبر ماس، فوکو وغیرہ) کے افکار کے مختصر تنقیدی جائزے کے بعد پیش کیے گئے تھے۔ اس مضمون میں نقالی کے رجحان کو عیاں کرنے کے علاوہ مقصود محض تناظر کی اہمیت کو واضح کرنا تھا تا کہ ادبی و نظریاتی اعتبار سے ''پراسراریت'' کو بنیاد بنا کر اہلِ اُردو جس ''خلائی مشن'' پر رواں دواں ہیں اور تجرید کی مسلسل تبلیغ پر کمر بستہ ہیں وہ زمین پر اُتر کر گرد و پیش کی تفہیم اپنے داخلی و خارجی محرکات کی نوعیت اور ضرورت کے تحت کر کے ادبی یا سماجی سطح پر کوئی اپنا لائحہءِ عمل تیار کریں، بجائے اس کے کہ دوسروں کے نظریات اور اُن نظریات کی باطنی منطق میں ربط بطورِ دلیل تلاش کرتے رہیں۔ ایسا کرنے سے اپنے معاشرے میں ادبی میدان صوفی کی خانقاہ بننے کے علاوہ اور کچھ نہیں بن سکے گا۔ معاشرہ خارجی اثر کے تحت اپنی نامیاتی وحدت سے محروم ہو کر صرف دماغوں کے اندر مابعد جدید منطق کے تابع ہو جائے گا۔

ادبی، سماجی، حتیٰ کہ سیاسی اعتبار سے مغربی فکر پر فیصلہ کن اثر چھوڑنے والی فرانز فینن کی کتاب The Wretched of the Earth کا حوالہ مثال کے طور پر دیا جا سکتا ہے جس نے مغرب میں پوسٹ کالونیل ادبی و سماجی تنقید پر شدید اثرات مرتب کیے تھے۔ کیا اردو ادب یا تنقید میں کوئی ایسی کتاب موجود ہے کہ جو داخلی و خارجی مفادات کی غیر یکسانیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے، تمام معاشرتی مفادات کو اپنے تناظر کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے لکھی گئی ہو اور جس کا انگریزی ترجمہ پڑھنے کے بعد مغربی مفکر اپنی تنقید کے خطوط درست کرنے لگیں اور اپنی جامعات میں اس کو بھی جگہ دیں، جیسا کہ فینن کی کتاب کے بعد ہوا تھا۔ نہ کہ وہ الٹا یہ کہنے لگیں کہ یہ مخلوق تو ہماری ہی تقلید پر کمر بستہ ہے۔ اگر ایڈورڈ سعید ان کے دفاع پر اترتا ہے تو تعریف کا حامل قرار پاتا ہے اور حوالے کے لیے

اس کا نام کئی محفلوں میں سننے کو ملتا ہے۔ اگر مشرق کا کوئی باشندہ ادب و تنقید میں اپنا موقف پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے تو ساتھ ہی ادب میں سماجی مسائل کے آنے سے ادب خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ اگر فینن اپنی تصنیف کے ذریعے نظریاتی اعتبار سے عالمی استحصالی زاویوں پر اثر انداز ہو سکتا ہے تو اہلِ اردو تمام تضادات کے باوجود مغرب کے ساتھ کس اشتراکیت کے خواہاں ہیں؟ مغربی مفکر اگر اپنے داخلی مفادات کے حق میں دلائل تراشتے ہیں تو اردو والوں کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ کیا وہ محض خود کو عالم ثابت کرنے کے چکر میں رہتے ہیں؟ اس میں بھی کوئی حرج نہیں اگر ان کی علمیت کسی تنقیدی سوچ کو پروان چڑھائے، مگر نقل کا رجحان تو خود تنقیدی سوچ کے نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔ اس نکتے کا میں بعد میں تفصیلی جائزہ لوں گا۔

میں اپنے مضمون ''گوپی چند نارنگ مصنف یا مترجم؟'' میں نقالی کے رجحان کو عیاں کرنے کے علاوہ صرف مذکورہ بالا نکتے کی جانب توجہ دلانے کی کوشش کی تھی۔ گوپی چند نارنگ کے کارنامے کے انکشاف کے سلسلے میں تحریر کیے گئے مضمون کے مرکزی نکتے پر کوئی خاص ردِ عمل نہیں ہوا جس کی وجہ شاید یہ تھی کہ بے شمار خود ساختہ ادیبوں، نقادوں اور محققوں نے اپنے اپنے گریبان میں جھانکنا شروع کر دیا ہوگا کہ اسی عمل کی بنا پر تو وہ تنقید کے عالم بنے ہوئے ہیں۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مابعد جدید مباحث ادب سے وابستہ زیادہ تر لوگوں کی فہم سے بالا ہوں، لیکن اس مضمون میں مباحث اور تجزیات پر تو توجہ مرکوز ہی نہیں کی گئی تھی۔ اس کا مرکزی زاویہ تو علمی و فکری بددیانتی کے رجحان کی نشاندہی تھی اور اگر توجہ نقالی سے ذرا ہٹتی تو شاید تناظر کی اہمیت واضح ہونے سے کچھ پیش قدمی داخلی تقاضوں کے تحت بھی ہو جاتی مگر یہاں تو حالات یہ ہیں کہ بلاواسطہ طور پر نقالی کے حق میں دلائل دیے جانے لگے ہیں۔ پاکستان کے علاقے بورے والا سے بہرحال اہلِ اُردو کی جانب سے اختیار کی گئی خاموشی ٹوٹی ہے۔ جاوید حیدر جوئیہ صاحب نے ''جدید ادب'' میں شائع ہونے والے مضمون ''گوپی چند نارنگ مترجم یا مصنف؟'' کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اُنھوں نے گوپی چند نارنگ کے نقالی کے رجحان کو ہدفِ تنقید نہ بنا کر جہاں اس رویے کی حوصلہ افزائی کرنے کی کوشش کی ہے تو دوسری طرف ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے مشیروں کے پیشگی دفاع پر چل نکلے ہیں۔

جوئیہ صاحب کے مضمون یا خط کا میں نے بنظرِ غور جائزہ لیا ہے۔ اس مضمون میں میں نے یہ کوشش کی ہے کہ اُن کے تمام اہم اعتراضات کا اُسی ترتیب سے جواب پیش کروں جو اُنھوں نے اپنی تحریر میں اختیار کی ہے۔ ان کے کئی ایک نکات کو میں نے غیر ضروری اور انتہائی ابتدائی نوعیت کے سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہے۔ یہاں پر یہ ذہن نشین رہنا چاہیے کہ جوئیہ صاحب نے میرے مضمون کا مطالعہ بقول اُن کے 'دو تین بار' کیا ہے اور جس نتیجے پر وہ پہنچے ہیں وہ مضمون کو 'دو تین' بار پڑھنے کے بعد ہی پہنچے ہیں یہ امر بھی قابلِ غور ہے انہیں اس بات کا بھی پوری طرح یقین نہیں ہے کہ انہوں نے مضمون کو کتنی بار پڑھا ہے؟ بہرحال اُن کے اعتراضات کا جائزہ لیتے وقت اس مضمون کے قاری کو

اصل مضمون کے حوالے سے جوئیہ صاحب کے بھرپور مطالعے کا خیال اپنے ذہن میں رکھنا چاہیے۔اس کے علاوہ **میرا یہ دعویٰ ہے کہ گوپی چند نارنگ نے ٹیرنس ہاکس کی کتاب Structuralism and Semiotics کو چند ایک پیراگراف کی ترتیب کو تبدیل کر کے ساری کی ساری کتاب ترجمہ کر کے اپنے نام سے شائع کرادی ہے۔** پہلے ہم جوئیہ صاحب سے بات شروع کرتے ہیں۔

جناب جوئیہ صاحب فرماتے ہیں کہ ''میں سوچتا رہا کہ کیا ساختیات ہر ملک میں الگ الگ ہے؟ الگ الگ ہے تو یہ ''سائنس'' کیسے ہوگئی؟ اور سائنس ہے، اور بقول بھنڈر صاحب ''سائنسی نظریات'' دنیا کی ہر لیبارٹری میں ایک ہی جیسے نتائج پیدا کرتے ہیں''، تو پھر سائنس کا 'دفاع' کیونکر ممکن ہے، اور وہ کونسی ''سائنسز'' ہیں جنھیں ملکی معاشروں کی ضروریات اور ترجیحات کو مدِنظر رکھ کر ''دفاعی حربہ اختیار'' کیا گیا ہے؟''

اس سے قبل کہ اس پیراگراف پر بات شروع کی جائے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے گزشتہ مضمون سے ایک اقتباس دیا جائے جس میں میں نے مختلف سائنسز میں حدِ امتیاز کھینچنے کی کوشش کی تھی، ملاحظہ فرمائیں، ''اس مثال سے یہ نتیجہ اخذ کرنا عبث ہوگا کہ ان دونوں سائنسی نظریات کو ایک ہی کلیے کے تحت جانچا جائے، مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ سائنسی نظریات کی قبولیت یا استرداد کا عمل ہر طرح کے تعصب سے بالا معروضی قوانین کے تابع ہونا چاہیے۔'' ۔۔۔۔اس مضمون میں جوئیہ صاحب کو نارنگ صاحب کا دفاع مقصود تھا اس لیے انہوں نے بیشتر حوالوں کو غلط پیرائے میں استعمال کر کے اپنی جانب داری کا ثبوت دیا ہے۔اگر اس مضمون سے جوئیہ صاحب کا نام حذف کر دیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مضمون کو گوپی چند نارنگ نے خود تحریر کیا ہے کیونکہ اس سے زیادہ دفاع کرنے میں نارنگ صاحب خود بھی ناکام رہتے۔

مندرجہ بالا نکتے کی بحث کو سمجھنے کے لیے یہ ذہن میں رہنا ضروری ہے کہ میں اس بحث میں سیوسیئر کی لسانیاتی تھیوری کا مفصل جائزہ نہیں لوں گا اور نہ ہی سیوسیئر کی تھیوری کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کروں گا کیونکہ اس کے لیے موضوع سے ہٹنا پڑے گا۔ میں صرف معنی آفرینی کے لیے سیوسیئر کی تھیوری میں معروضی عنصر کے نہ ہونے سے جنم لینے والے قضیوں کا ذکر کروں گا جو معنی کی نوعیت کو یکسر تبدیل کر دیتے ہیں۔مختصر یہ کہ صرف 'لفظ' کو معروضی تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ یا یوں کہیں کہ لفظ کی ''میٹیریل'' حیثیت پر توجہ مرکوز کروں گا۔

جہاں تک لسانیاتی ساختیات کا تعلق ہے تو وہ سیوسیئر کے نظریے کے مطابق اپنی ہی باطنی منطق کے تحت معنی کو وجود میں لاتی ہے، جس میں افتراق، اضافیت، خودمختار، (Arbitrary)، لونگ اور پارول وغیرہ جیسے عناصر شامل ہوتے ہیں۔سیوسیئر زبان کو معنی آفرینی کے لئے معروضایہ (Objectified) ہوا نہیں سمجھتا۔اس کے نزدیک لفظ یا سائن self referential ہے۔اس طرح وہ 'لفظ' کو اس کے مادی پہلو سے محروم کر کے محض تجرید کی سطح تک لے جاتا ہے، جبکہ مادی نقطہ نظر سے ہم جانتے ہیں کہ معنی آفرینی کے لئے 'لفظ' کو تناظر عطا کرنا ضروری ہے اور یہ

ثابت کرنا انتہائی مشکل ہے کہ 'لفظ' میں معروضیت کا کوئی بھی پہلو شامل نہیں ہے۔زبان معنی آفرینی کے لئے اپنے ہی باطنی رشتوں (افتراق، اضافیت، خودمختار، لونگ اور پارول) کی محتاج ضرور ہوسکتی ہے، لیکن یہ عمل کسی نہ کسی تناظر میں طے پانا چاہیے۔فرض کریں کہ کوئی ب شخص کہتا ہے کہ ''غریب کا استحصال ہورہا ہے'' یقیناً یہ فقرہ موضوعیت کے برعکس معروضی اہمیت کا حامل ہے اور بغیر تناظر کے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوسکتی۔

مزید وضاحت کے لئے اپنے ہی مضمون ''گوپی چند نارنگ مترجم یا مصنف'' سے کیتھرین بیلسی کا ایک اقتباس دے رہا ہوں جسے جوئیہ صاحب پہلے ہی دو یا تین بار پڑھ چکے ہیں۔بیلسی کے مطابق ''**زبان اور سوچ کا تعلق نئے معنی اور دنیا کے تجزیے کے نئے طریقوں کی وضاحت کرتا ہے، جو طریقہ ہائے کار وضع ہوجاتا ہے معنی اُسی کے اندر قائم ہوتا ہے۔ نئے معنی قائم کرنے کے لئے زبان اور سوچ کے تعلق کو تبدیل کرنا ہوگا۔**'' زبان اور سوچ کا تعلق دو سطحوں پر عمل آراء ہوتا ہے، ایک داخلی اور دوسری خارجی۔ داخلی اور خارجی کے درمیان رشتہ انتہائی پیچیدہ، متضاد اور مبہم ہے۔ یہ بہرحال طے ہے کہ سوچ کی تشکیل میں خارجی عناصر فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں۔اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ شعور کی نوعیت داخلی بھی ہوسکتی ہے اور خارجی بھی تو پھر ہمیں بڑی باریکی سے ان دونوں کے مابین افتراق کی نشاندہی کرنی ہوگی۔آیئے عمانوئیل کانٹ کی کتاب The Critique of Pure Reasons میں بیان کیے گئے فرد کے داخلی و خارجی شعور پر غور کرتے ہیں۔اس کے بعد میں اسی تصور کی روشنی میں ہیگل کے فلسفے کا مختصر جائزہ لے کر دریدا کے Differance کے بارے میں پراسرار تھیوری پر تنقیدی نظر ڈالوں گا۔ژاک دریدا کے بارے میں میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس نے مغربی دنیا کے سب سے عظیم فلسفی عمانوئیل کانٹ کے خیالات کو ہیگل، فختے اور شیلنگ کے ذریعے جان کر ان کی اہم فلسفیانہ اصطلاحات کو لسانیات پر لاگو کر دیا۔اس نے عقلیت، شعور، سیلف، افترق وغیرہ جیسی اصطلاحوں کا مفہوم سمیٹ کر مختلف ناموں سے لسانیات کی مناسبت سے اصطلاحات وضع کیں (Differance, Trace, Supplement, etc,) اور زبان کے اندر سے معنی کی تلاش شروع کردی۔ یہاں پر جو کچھ دریدا کہتا ہے اسے آنکھیں بند کر کے تسلیم کرنا قابلِ قبول نہیں ہے۔ دریدا کے فلسفے کے مآخذات کا سراغ لگانا اور ان کی سچائی کو جاننے کی کوشش کرنا بھی مقصود ہے۔ یہ دسویں جماعت کا امتحان نہیں جس میں صرف سوالات کا جواب دینا ہی کافی ہوتا ہے۔ یہ آزادانہ تحقیق کا اپنے موقف کی روشنی میں تجزیہ کرنے کا سوال ہے۔ ہمارا اپنا ایک موقف ہے جس کے مطابق سچائی زبان کے اندر ہی نہیں پائی جاتی بلکہ ہماری تمناؤں کے برعکس خارجی دنیا میں بھی موجود ہے جس کا انسان اپنی ہی سرگرمی کے ذریعے شعور حاصل کر کے اسے تبدیل کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔

عمانوئیل کانٹ کے فلسفے کے سکالرز کو اس کے فلسفے میں شامل تصورِ بدیہیت اور خارجی اعتبار سے اس کے تفاعل سے پوری طرح آگاہ ہونا چاہیے۔ کانٹ کے فلسفے میں 'بدیہی' (a Priori) کا استعمال 'فوق تجربی جمالیات' (Transacendental Aesthetic) میں فطرت کو بحیثیت وجدانی مظہر کے طور پر کیا جاتا ہے، جس میں فطرت کا

ادراک ہمیں حسیات کے ذریعے ہوتا ہے، اس میں کوئی بھی خارجی طریقہ ہائے کار وضع نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ ہر طرح کے معروض، دلچسپی، خواہش اور تصور سے بالاتر ہے۔ اس میں صرف اور صرف فوق تجربی سیلف باطنی طور پر تفکراتی عمل سے گزرتا ہے۔ کانٹ نے واضح کیا تھا کہ شعور کی منطقی اہلیت دراصل سیلف کی موجودگی بطورِ سوچنے والے فرد کی حیثیت سے کرتی ہے۔ ایسا فرد اپنی ہی منطق کے تحت تشکیل پاتا ہے۔ اس طرح کے فرد کو کانٹ کے فلسفے کی رو سے Noumenal I کہا جاتا ہے۔ کانٹ کا ''نومینل سیلف'' زمان اور ہر طرح کی ترکیبی وحدت سے آزاد ہے لیکن مکان سے آزاد نہیں ہے۔ جبکہ دوسرا 'سیلف' زمان و مکان میں موجود ہوتا ہے۔ گو کہ خارجی عوامل کی شمولیت سے متشکل ہوتا ہے مگر خارج کے تمام مقولات پہلے ہی سے دیے گئے ہوتے ہیں، جنہیں سبجیکٹ اپنی ہی داخلی حس سے جانتا ہے، یعنی جب فرد یہ کہتا ہے کہ وہ ترکیبی وحدت سے قبل از ادراک کی خصوصیت کو جانتا ہے تو وہ دراصل خود کے شعور ہونے کا پتہ دیتا ہے۔ ایک طرف وہ خود کے شعور ہونے کا پتہ دیتا ہے اور دوسری طرف اسے شعوری سرگرمی کا بھی شعور ہوتا ہے۔ یعنی یہ شناخت وہ اپنے شعور سے جو اس کا ''دوسرا'' ہے، سے قائم کرتا ہے۔ یہاں پر افتراق تو ہے لیکن شناخت کا لمحہ بھی آتا ہے۔ اس طرح کانٹ نے فرد کی دوئی کا تصور پیش کیا تھا جس نے ایک طرف تو ڈیکارٹ کے تصورِ فرد کی دھجیاں بکھیر دیں، کیونکہ ڈیکارٹ کا فرد مطلق حیثیت کا مالک تھا، جبکہ دوسری طرف سیلف کو دولخت (Decentered) کر کے بعد کے تمام فلسفے کے لیے راستہ ہموار کیا۔

کانٹ کے مطابق دوسرے فرد کی نوعیت پر مزید غور کرتے ہیں جو مظہراتی دنیا سے وابستہ ہوتا ہے جسے Phenomenal I کہا جا سکتا ہے کیونکہ یہ ظاہر سے تشکیل پاتا ہے۔ ''فوق تجربی فرد'' کی وضاحت کرنے کے بعد کانٹ واضح کرتا ہے کہ 'استخراجی منطق' (Deductive Logic) فطرت کو 'تصوراتی مظہر' (Conceptual Representation) کے طور پر دیکھتی ہے، یعنی مظہراتی فطرت 'ترکیبی وحدت' (Synthetic Unity) کے طور پر شامل ہوتی ہے۔ جسے فہم کے اشتراک سے تصور کی صورت دی جاتی ہے۔ اس عمل میں کانٹ کے مطابق مادہ فرد کے اندر بھی موجود ہوتا ہے جو حسیات کی بنیاد پر خارجی مادے پر ردِ عمل کرتا ہے، لیکن اس میں فہم شامل ہوتی ہے۔ جہاں تک فطرت (خارجی دنیا) کا تعلق ہے تو اس کی حیثیت وجدانی ہوتی ہے جس میں 'زمان و مکان' مادی صورتوں میں موجود ہوتے ہیں۔

زمان و مکاں میں مادیت کے عنصر کا مطلب یہ ہے کہ اسے سوچ کے ذریعے تشکیل دیا جا سکتا ہے۔ اس میں داخلیت اور خارجیت دونوں عناصر شامل ہیں۔ اس طرح کانٹ نیا ایک طرف ''مخفی سیلف'' اور ''مظہراتی سیلف'' کے درمیان یہ حدِ فاصل کھینچی تھی کہ علم کے حصول اور اس میں اضافے کے لیے ''مظہراتی سیلف'' کو ہی متحرک ہونا پڑتا ہے کیونکہ اس میں فرد معروض سے برسرِ پیکار رہتا ہے، دوسری طرف اس نے ''نومینل سیلف'' کو اس کے تفاعل کے اعتبار سے الگ کر دیا۔ کانٹ کا Transcendental subject سماجی عمل میں شریک نہیں ہو سکتا

مگر وہ اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ دوسری طرف مظہراتی سبجیکٹ ہے جو سماجی عمل میں شریک تو ہوتا ہے لیکن سچائی کو نہیں پا سکتا کیونکہ بقول کانٹ ''شے بالذات'' خود کو مخفی رکھتی ہے۔ یہی نکات ہیں جنہوں نے ہیگل کو اپنا الگ فلسفہ تشکیل دینے کے لیے بنیادی مواد مہیا کیا۔ ہیگل ایک طرف تو کانٹ کی ''شے بالذات'' کو تسلیم نہیں کرتا اور دوسری طرف کانٹ کے Trancsendental subject کے عدم شمولیت کے کردار کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔

کانٹ کے ''نومینل سیلف'' کی حیثیت قبل از تاریخ کی ہے، یعنی اس کا مآخذ تاریخ کے ہر مآخذ سے قبل ہے، جو وجدان کی a Priori حیثیت کا قائل ہے اور جو تمام انسانی تجربے کی لازمی شرط بھی ہے۔ اسے دنیا میں تلاش کرنا اور اس میں سے تجربے کے تمام عناصر کو دریافت کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ دریدا کا Differance یا Trace بھی بقول اس کے 'مآخذ' سے قبل کا 'مآخذ' ہے۔ دریدا نے Differance کے بارے میں کئی بار کہا ہے کہ اس کا مآخذ ہر طرح کی 'موجودگی' اور 'شناخت' سے قبل دریافت کیا جا سکتا ہے۔ کانٹ کے مفہوم میں دریدا کا پراسرار عنصر معنی خیزی کو تو ممکن بناتا ہے لیکن خود اپنے مآخذ کی کوئی خبر نہیں دیتا۔ یعنی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ Differance کی حیثیت Objectified نہیں ہے۔ اس طرح دریدا کانٹ کے 'نومینل سیلف' کے قریب چلا جاتا ہے جو خود Objectified نہ ہوتے ہوئے بھی معنی خیزی کا سبب بنتا ہے۔ دریدا کے نزدیک Differance and Trace اس طرح کا پراسرار عنصر ہے جو معنی خیزی کے عمل کو ممکن بناتا ہے، اگر

each so-called present element, each element appearing on the scene of presence, is related to some thing other than itself. (SP, p,142-143).

لیکن اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ خود کو مخفی رکھے۔ دریدا چونکہ systematic مفکر نہیں تھا اس لیے اس نے ایک ہی تھیم کی وضاحت کے لیے مختلف اصطلاحات بغیر کسی ربط کے استعمال کر کے نقادوں کے ڈیکنسٹرکشن سے مختلف نتائج اخذ کرنے کے لیے راستہ کھول دیا۔ اب یہاں پر ایک طرف تو دریدا معنی کی تلاش میں ہیگل کی The science of Logic کے سب سے بنیادی تھیم 'افتراق و اپوزیشن' کی بنیاد پر معنی خیزی کے عمل کو مستعار لیتا ہے اور دوسری جانب کانٹ کے 'نومینل سیلف' کے مماثل ہو جاتا ہے۔ کانٹ نے اس تصور کو ادھورا چھوڑ دیا جسے بعد ازاں اس کے پیش رو جرمن فلسفی شیلنگ نے واضح طور پر تشکیل دیا۔ پیٹر ڈیوز نے ثابت کیا ہے کہ دریدا کا تصورِ Differance حقیقت میں شیلنگ کے ''سبجیکٹ'' کے تصور کے مشابہ ہے، جو اپنی عدم شمولیت کے بغیر معنی کو متعین کرتا ہے۔ ہیگل کے دریدا پر اثر کا جائزہ لینے کے لیے دریدا کے مضمون Differance کا مطالعہ بہت ضروری ہے جس میں اس نے واضح طور پر ہیگل کے اثر کو تسلیم کیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جس سوچ اور زبان کے تعلق کی ہم وضاحت کرنا چاہتے ہیں وہ تو یقیناً خارج سے ہی تشکیل پائی ہوئی ہونی چاہیے، خارج سے تشکیل ہونے والی زبان کی نوعیت کیا ہوگی؟ اور اس زبان اور باطنی زبان

میں حدِ امتیاز کس طرح قائم کیا جاسکتا ہے؟ اگر خارج میں زمان و مکان کے تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھا جانا چاہیے تو بے شک زبان اپنی ہی باطنی منطق کے تحت عمل کرے، لیکن اس کے باوجود خارجی عوامل معنی کے اعتبار سے زمان و مکان کے تقاضوں کے تحت مختلف معنی کی تشکیل کریں گے۔ خارج ہی وہ لیبارٹری ہے جو زبان کے اپنے معنیاتی رشتوں کے باوجود تناظر کو ملحوظِ خاطر رکھے گی اور ایک تناظر کو دوسرے تناظر سے خارجی منطق کے تحت جدا کرے گی۔ جن کے حوالے سے داخلیت کی اپنی زبان ہوسکتی ہے جیسا کہ کانٹ نے The Critique of Pure Judgement میں واضح کیا تھا۔ مارکسی نقطہ نظر سے اس پہلو سے بھی اختلاف کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس میں حیاتیاتی نقطہ نظر سے آغاز سے ہی ماحولیاتی عوامل کی شمولیت ہو جاتی ہے۔ یہاں چونکہ دونوں ''سیلف'' کے امتیاز کو واضح کرنا ہے اس لیے داخلی و خارجی زبان کو الگ الگ کیا جا رہا ہے۔ مارکسی لسانیات کی وضاحت کے لیے یہ مناسب موقع نہیں ہے۔ لسانیات کا شمار سوشل سائنسز میں ہوتا ہے اور لیوائی سٹراس کو تو ویسے بھی یقین ہو گیا تھا کہ لسانیات ہی حقیقی سائنس ہونے کا درجہ رکھتی ہے، جو اپنے قوانین کے مطابق مختلف قسم کے معنی پیدا کرتی ہے، یقیناً یہ عمل انتہائی پیچیدہ اور متضاد عوامل کی پیکار کا نتیجہ ہے۔ ہر زبان اگر اپنے پس منظر میں تشکیل پائے تو بالائی سطح پر معنی کی نوعیت مختلف ہوسکتی ہے۔ ہمارا سوال پھر وہی ہے کہ برطانوی معاشرتی یا ثقافتی تناظر میں جنم لینے والے معنی کا ہو بہو اطلاق پاکستانی ثقافت پر کیسے کیا جاسکتا ہے؟ دریدا کی Of Grammatology کے دیباچے پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر ڈیرک نے مجھے کہا کہ گائتری سپیوک لٹریچر کی استاد تھی نہ کہ فلسفے کی، اس لیے اس کا دریدا کی کتاب کا ترجمہ اور اس کا تحریر کیا ہوا دیباچہ شک سے بالا نہیں ہے۔ فلسفے کی اپنی اصطلاحات ہوتی ہیں جنہیں ادب کے قاری کو محتاط رویہ اختیار کر کے پڑھنا چاہیے۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ جرمن فلسفی مارٹن ہائیڈیگر اس بات پر مصر تھا کہ زبان فرد کے اندر از خود بولتی ہے، اس عجب خیال کو سادہ الفاظ میں تھیوری کے برعکس اپنے اور زبان کے تعلق کی نوعیت کو سمجھ کر بھی مسترد کیا جاسکتا ہے۔ اگر زبان پر ہمارا اختیار ہے اور ''خلائی مشن'' کے برعکس سماج کے ساتھ بھی ہمارا کوئی تعلق ہے تو سماجی عمل کی بہتر تفہیم کر کے ہم پہلے سے موجود مغربی ''کوڈز'' کی جگہ اپنا ایک الگ 'کوڈ' بھی تشکیل دے سکتے ہیں۔ اسی کو میں نے 'دفاعی حربہ' قرار دیا تھا۔ اگر اس عمل کے لیے زیادہ صلاحیت درکار ہے تو کم از کم اپنے تناظر میں زبان کے objectification کے پہلو کو سامنے رکھ کر اپنا نقطہ نظر پیش کیا جاسکتا تھا۔

بیسویں صدی میں ''بیگانگی'' کے نتیجے میں اس طرح کی علمیات کی توقع کرنا قطعاً حیرت انگیز امر نہیں ہے۔ مجموعی طور پر بیسویں صدی جنگوں، انقلابات اور ردِ انقلابات کی صدی تھی۔ اس کے علاوہ بیسویں صدی سامراج کے وجود میں آنے کی صدی تھی۔ جس کے اثرات نہ صرف عالمی سطح پر بلکہ مغربی ممالک کے داخلی تضادات کی صورت میں بھی سامنے آئے۔ معیشت کی چوکھٹ پر ہر قابلِ قدر چیز بکنے لگی۔ مزدور کی پیدا کردہ جنس

(commodity) کے ساتھ ساتھ فنی پیداوار بھی معیشت کی غلامی کرنے لگی۔ پیداواری عمل سے جنم لینے والی 'بیگانگی' ثقافتی سطح پر پوسٹ ماڈرن ازم کے روپ میں سامنے آئی اور مغربی تہذیب کے رکھوالوں نے اسے ''ردِ ثقافت'' (Counter culture) کے نام سے پکارنا شروع کر دیا۔ اس سارے عمل کو مارکسی مفکروں نے ایک صدی قبل ہی آشکار کر دیا تھا۔ سرمایہ داری نظام کے سامراج کا روپ اختیار کرنے کا انتہائی شاندار تجزیہ مارکس کے ''سرمایہ'' کی پہلی جلد کے باب چھبیس میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے، جسے بعد ازاں لینن نے اپنی کتاب ''سامراج، سرمایہ داری کی آخری منزل'' میں ٹھوس سائنسی بنیادوں پر ثابت کیا اور سامراج کے وجود میں آنے کی سچائی سے آگاہ کیا۔ مابعد جدیدیت کی ادبی جہت، مغربی ثقافت یا اس کا فلسفہ (پسِ ساختیات) یہ ''بیگانگی'' کی صورتیں ہیں۔ پسِ ساختیاتی رجحان مغربی ممالک کے اپنے داخلی تضادات کا نتیجہ ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ یہ سائنس ہے تو اسے ہر حال میں قبول کرنا ہے بلکہ اصل سوال تو اس کی حدود کا تعین اور اس کے تضادات کی نشاندہی کرنا ہے۔ اس کے علاوہ یہ جاننے کی کوشش کہ مابعد جدید فلسفے کا اس کے عہد سے کیا تعلق ہے؟

نیوٹن کی تھیوری اگر ناقابلِ عمل ہو تو اسی کے اطلاق کرنے کا مسلسل اصرار اس سے اعلیٰ حقائق تک پہنچنے میں رکاوٹ بن جاتا ہے، اس کے لیے یقیناً آئن سٹائن کو پکارنا ہوگا۔ اسی طرح اگر اہلِ اردو کے اپنے تقاضے ''ڈیکنسٹرکشن'' پورے نہیں کرتی تو اور بھی ایسی سائنسز موجود ہیں جو ان کی معروضی صورتحال سے ہم آہنگ ہونے کی پوری صلاحیتیں رکھتی ہیں۔ ۱۹۶۸ میں جب فرانس میں طالب علم اور فیکٹری مزدوروں کا انقلاب آیا تو سارتر، فوکو، لاکاں اور لیوٹارڈ وغیرہ ڈرائنگ رومز (خانقاہ) میں بیٹھ کر شاعری کے عروض پر بحث نہیں کر رہے تھے۔ وہ تو سڑکوں پر نکل کر مزدوروں اور طالب علموں سے سوال پوچھتے تھے تا کہ ان وجوہ کا علم ہو جن کی وجہ سے یہ لوگ سڑکوں پر نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے نظریے کو صرف تجریدی تصور کیا جائے۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ وہ اپنے نظریات کی سچائی کو زمین پر ہی ثابت کریں۔ یہی وجہ ہے کہ دریدا اگر فرد کی تشکیل ثقافتی زبان کے اندر کرتا ہے تو لیوٹارڈ اسی زبان میں طاقت کے عنصر کو غالب دیکھتا ہے، جبکہ فوکو زبان کے برعکس سماج میں طاقت کے کھیل کی عمل آرائی کو حتمی تصور کرتا ہے۔ فوکو کہتا ہے کہ

I believe one's point of reference should not be the great model of language and signs, but that of war and battle. The history which bears and determines us has the form of a war rather than a language: relations of power, not relations of meaning. (Power/Knowledge, p,114).

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ فوکو کسی ٹھوس بنیاد پر اپنی تھیوری وضع کرنا چاہتا تھا۔ معنی کی مخالفت کا مقصد صرف روشن خیالی منطق میں کارفرما معنی کا انہدام تھا۔ مثل فوکو کا 'فرد' طاقت کی تشکیل تھا، اس طرح فوکو معروضیت کو تو سمیٹتا ہے مگر اپنے دلائل کا پسِ منظر چھپانے میں ناکام رہتا ہے۔ اسے تو فرد کی فطرت کا انہدام اور اپنے عہد میں جنم لینے والی ہم جنس پرستانہ تحریکوں کی کامیابی درکار تھی۔ اگر فوکو 'معنی' کو تسلیم کر لیتا تو اسے اپنے فرد کی

نفی کرنی پڑتی، اس نے مناسب سمجھا کہ فرد کی فطری حیثیت کو چیلنج کرے۔ اس لیے اس نے معروضی اور عقلی سچائی کا انکار کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اگر عقلیت پسندی کی بنا پر قائم کیا گیا سچائی کی دریافت کا تصور ہی غلط ہے تو وہ فرد کیسے قائم رہ سکتا تھا۔ نئے فرد کو وہی درجہ دلانے کے لیے اس نے طاقت اور مزاحمت جیسی اصطلاحات استعمال کیں۔ اپنی تحریک کو فتح دلانے کی خاطر فوکو کہنے لگا کہ 'مزاحمت اور طاقت' ہر جگہ پر ہے۔ مزاحمت، طاقت کے اندر موجود ہے جو اس کو کمزور کرتی ہے۔ فوکو کی یہ تھیوری ۱۹۶۸ کے پس منظر میں مزید ترقی کرتی گئی۔

جیسا کہ میں نے واضح کیا ہے مغرب میں ادبی و سماجی نقاد ڈرائنگ رومز میں بیٹھ کر مختلف موضوعات پر خیال آرائی اپنے سماجی پس منظر میں کرنے کے علاوہ سماجی عمل میں حصہ بھی لیتے ہیں۔ جس فوکو، دریدا، سارتر یا ہائیڈیگر کا حوالہ اردو تنقید میں بطورِ عالمانہ قسم کی بحث کے استعمال کیا جاتا ہے، یہ لوگ تو مختلف قسم کی تنظیموں سے وابستہ رہے ہیں اور مختلف گروہوں اور طبقات کے ساتھ ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے نظریاتی اور عملی سطح پر لڑے ہیں۔ اس طرح جو فلسفہ وہ پیش کرتے رہے ہیں ان کا ان کے سماج کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ژاک دریدا کو ہی دیکھیں کہ کس طرح اس نے گیارہ ستمبر کے واقعات کے بعد امریکہ کی حمایت کی، جبکہ امریکہ کے عراق پر حملے کو غلطی قرار دیا۔ ۱۹۶۸ کے طالب علم انقلاب کی اس نے حمایت کی اور بعد میں دست بردار ہو گیا۔ ۱۹۹۵ میں دریدا نے سوشلسٹ امیدوار لیونل جوزفن کی سیاسی پارٹی میں حصہ لیا اور اس کی باقاعدہ حمایت کی۔ سیاسی سطح پر اختلاف بھی اپنی تھیوری کی روشنی میں ہی کیا۔ اُردو کا دانشور یا ''سوشل مفکر'' سیاست کے نام سے بھی خائف ہو جاتا ہے اور اس کا ادب خطرے میں پڑنے لگتا ہے۔ بالکل ملاّ یا پنڈت کی طرح جو خدا کو طاقت ور بھی کہتے ہیں اور خطرے میں بھی سب سے پہلے خدا کو ڈالتے ہیں۔

نارنگ صاحب جیسے نقاد بغیر کسی پس منظر کے اس انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں کہ اب کونسی تھیوری تشکیل پانے والی ہے تا کہ دوسروں سے پہلے وہ اس تھیوری کی رپورٹنگ کر کے بڑا نقاد کہلوانے کا تمغہ حاصل کر لیں، جس میں ان کو خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہو جاتی ہے، لیکن علمی بد دیانتی کی جس روایت کو وہ مضبوط کر رہے ہیں اس کے لیے آج نہیں تو کل انہیں قصوروار ضرور ٹھہرایا جائے گا، اگر چند لوگ جوئیہ صاحب جیسے ہو سکتے ہیں جو اس قسم کے رویوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں تو مستقبل میں ایماندارانہ نقطہ نظر رکھنے والے لوگ بھی سامنے آ سکتے ہیں۔

یہ تو مختصر سی بحث لسانیات کی اس کے اپنے اصولوں کے تحت معروضیت کو سمیٹ کر معنی کی تشکیل کرنے کے بارے میں تھی۔ جوئیہ صاحب نے اپنے خط میں جو اعتراضات اٹھائے ہیں، ان پر بحث کی گنجائش شاید موجود ہو۔ گوپی صاحب کے دفاع میں انہوں نے جو دلیل پیش کی ہے کہ گوپی صاحب 'جلدی' میں صفحہ نمبر لکھنا بھول گئے تھے، یہ دلیل ان کے اور گوپی صاحب کے درمیان ایک interaction کی خبر دیتی ہے۔ جوئیہ صاحب کو یہ کیسے علم ہوا کہ گوپی صاحب 'جلدی' میں صفحہ نمبر لکھنا بھول گئے تھے؟ ہمیں اس امر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ویسے یہاں پر یہ

عرض کر دی جائے کہ کتاب لکھتے وقت اگر مصنف کو تفکراتی عمل سے گزر کر اوریجنل زاویہ اختیار کرنا ہے تو وہ دوسرے کئی معاملات میں ''جلدی'' کر سکتا ہے، مگر کتاب کے بارے میں نہیں۔ آئزک نیوٹن جب اپنے کام میں مصروف ہوتا تھا تو اکثر اس کا کھانا اس کی بلی کھا جایا کرتی تھی نہ کہ وہ بلی کو دھیان لگا کر اس کا کھانا خود کھا جاتا تھا۔

گزشتہ مضمون ''گوپی چند نارنگ مصنف یا مترجم؟'' میں جو اقتباسات پیش کیے گئے تھے، شاید اس مضمون کے قاری نے یہ سوچا ہو کہ بس یہی اقتباسات ہیں، حالانکہ اس مضمون میں یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ اقتباسات کو اختصار سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس مضمون کی طوالت کے پیش نظر بھی اقتباسات کو مختصر رکھا گیا ہے۔ ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ گوپی چند نارنگ صرف کتاب کے تعارف میں بحیثیت شارح دکھائی دیتے ہیں۔ ''مشرقی شعریات'' والے حصے کے بارے میں کچھ بھی یقین سے کہنا مشکل ہے اور کتاب کا باقی حصہ لفظ بہ لفظ ترجمہ ہے۔ اپنے اس دعوے کی سچائی ثابت کرنے کے لیے ایک بار پھر مجھے اس تمام مواد (صفحہ نمبر، کتب کا نام وغیرہ سمیت) کو ترتیب دینے کے لیے تگ و دو کرنی پڑی۔ اس بار کچھ اس طرح کی غلطیوں کا انکشاف کیا گیا ہے کہ جوئیہ صاحب تو دور گوپی صاحب خود بھی اس کا دفاع کرنے میں ناکام رہیں گے۔ بہر حال حق ان کے پاس محفوظ رہے گا۔ ٹیرنس ہاکس کی کتاب Structuralism and Semiotics میں سے گوپی صاحب نے ساری کتاب لفظ بہ لفظ محض ان کی ترتیب بدل کر نقل کی ہے۔ مثلاً اگر ٹیرنس ہاکس ایک پیراگراف پہلے لکھتا ہے تو اسی پیراگراف کو گوپی صاحب درمیان میں لکھ دیتے ہیں۔ اگر الفاظ وہی ہیں تو محض پیراگراف کی ترتیب بدلنے سے کیا ہوگا۔ ویسے یہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت ان کے ذہن میں جولیا کرسٹیوا کی intertexuality کی تھیوری گردش کر رہی ہو۔ آیئے اس پیراگراف کا flavour دیکھتے ہیں۔ ٹیرنس ہاکس، Todorov پر لکھے ہوئے باب میں کچھ یوں کہتا ہے،

The notion that literary works are ultimately about language, that their medium is their message, is one of the most fruitful of structuralist ideas and we have already noticed its theoretical foundations in the work of Jakobson. It validates the post-romantic sense that form and content are one, because it postulates that form is content. At one level, this permits, for instance, Todorov to argue that the ultimate subject of a work like The Thousand and One Night is the act of story-telling, of narration itself: that for the character involved- indeed for homo loquens at large- narration equals life: 'the absence of narration death'........... (Structuralism and Semiotics, p,100).

گوپی چند نارنگ صاحب یوں تحریر فرماتے ہیں،

''یہ خیال کہ ادبی فن پارہ زبان سے قائم ہوتا ہے، اور زبان ہی پیغام ہے: 'THE MEDIUM IS THE MESSAGE' بنیادی ساختیاتی نظریہ ہے، اور جیکب سن نے اس کی نظریاتی بنیادوں کو واضح کیا تھا۔ یہ خیال پَس رومانوی تصور کی بھی توثیق کرتا ہے کہ فارم اور مواد دراصل ایک ہیں، کیونکہ اس میں یہ تصور جا گزیں ہے کہ فارم ہی مواد ہے۔ اسی خیال کی بنا پر تودوروف نے ایک جگہ یہ نہایت دلچسپ بحث اٹھائی کہ الف لیلی جیسے شاہکار کا بنیادی

’موضوع‘ دراصل خود کہانی کہنے کا عمل‘ ہے کیونکہ کردار سب انسان (HOMO LOQUENS) یعنی ’بولنے والے جاندار‘ ہیں اور ان کے لیے کہانی سنانا زندہ رہنے کی علامت ہے اور کہانی کے ختم ہو جانے کا مطلب ہے موت۔‘‘

'NARRATION EQUALS LIFE: THE ABSENCE OF NARRATION DEATH' P' 92

(ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات، صفحات، ۱۲۹۔۱۳۰)۔

مندرجہ بالا پیرا گراف قارئین سے انتہائی توجہ کا تقاضہ کرتا ہے۔ گوپی صاحب نے اوپر والے اقتباس میں بعض فقرے واوین میں بھی لکھے ہیں اور اس کے بعد آخر میں ایک فقرہ انگریزی میں بھی لکھا ہے اور یہاں تک کہ صفحہ نمبر بھی درج کیا ہے جس میں اصل ذریعے کا حوالہ نہیں ہے۔ اس سے وہ یہ تاثر قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ انہوں نے Todorov کی کتاب کا مطالعہ کیا ہے۔ جبکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ لفظ بہ لفظ اس اقتباس کا مطالعہ ٹیرنس ہاکس کی کتاب کے صفحہ نمبر ۱۰۰ پر کیا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نقاد گوپی چند نارنگ صاحب نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے تا کہ قاری کہیں اپنی توجہ ٹیرنس ہاکس کی کتاب کی طرف مرکوز نہ کر بیٹھے۔ اگر ٹیرنس ہاکس کی کتاب ۱۹۸۴ میں شائع نہ ہوتی تو عین ممکن تھا کہ گوپی چند نارگ، ٹیرنس ہاکس پر سرقے کا الزام عائد کر دیتے۔ (یہ یاد رہے کہ یہ سارا باب ہاکس کی کتاب سے ترجمہ کیا گیا ہے)۔ آیئے اب ایک اور اقتباس پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ ٹیرنس ہاکس کہتا ہے،

We have already noticed the arguments of Jakobson's fellow Prague school critic Mukarovsky with regard to 'foregrounding': that the aesthetic use of language pushes into the foreground 'the act of expression' itself. Jakobson offered the most refined proposal that the metaphoric mode tends to be foregrounded in poetry, whereas the metonymic mode tends to be foregrounded in prose. This makes the operation 'equivalence' of crucial importance to poetry, not only in the area of analogy, but also in the area of 'sound' of those metrical, rythmic and phonic devices,.......continue. (Terence Hawkes, P, 80).

نارنگ صاحب کا یہ توجہ طلب اقتباس یوں ہے،

’’روسی ہیئت پسندوں کے ضمن میں ہم مکاروو سکی کے اس خیال سے بحث کر آئے ہیں کہ ’زبان کا تخلیقی استعمال فن پارے میں زبان کو ’پیش منظر‘ میں لے آتا ہے، یعنی اظہاری عمل اپنے آپ کو نمایاں کرتا ہے۔ جیکب سن اس پر اضافہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ شاعری کی تخلیقی زبان میں استعاراتی پہلو نمایاں رہتا ہے، نثر کی تخلیقی زبان میں انسلا کی پہلو زیادہ حاوی رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ’مرادفیت‘ EQUIVALENCE شاعری میں اس قدر اہمیت رکھتی ہے۔ متوازیت بھی مرادفیت کا ایک رخ ہے۔ ردیف و قوافی، اصوات، اور اوزان و بحور تکرار و متوازیت کی جو اہمیت ہے، وہ اسی قبیل سے ہے‘‘ جاری ہے (ص، ۱۴۰)۔

آیئے ٹیرنس ہاکس کے ایک اور اقتباس پر غور کرتے ہیں،

Poetic language is deliberately self-conscious, self-aware. It emphasises itself as a medium over and above the 'message' it contains: it characteristically draws attention to itself and systematically intensifies its own linguistic qualities. As a result, words in poetry have the status not simply of vehicles for thought, but of objects in their own right, autonomous concrete entities, In Sausure's terms, then, they cease to be 'signifiers' and become 'signifieds', ...(P, 63-64).

نارنگ صاحب لکھتے ہیں:

’’شعری زبان عمداً اپنے وجود کا احساس دلاتی ہے، یہ خود آگاہ اور خود شناس ہوتی ہے۔ یہ موضوع یا پیغام سے بلند تر ہو کر، جو اس کے ذریعے بیان ہوا ہے، خود اپنی حیثیت کا احساس دلاتی ہے۔ شعری زبان کا بنیادی تفاعل توجہ کو اپنی جانب مبذول کرنا اور اپنے اوصاف کو نمایاں کرنا ہے۔ نتیجتاً شعری زبان میں الفاظ فقط خیال یا جذبے کی ترسیل کا ذریعہ نہیں رہتے، بلکہ خود ٹھوس حقیقت بن جاتے ہیں جو قائم بالذات ہوتی ہے۔ سائیر کے معنی میں لفظ محض signifiers نہیں رہتے بلکہ signified بن جاتے ہیں۔۔۔‘‘ جاری ہے (ص، ۸۹)۔

ٹیرنس ہاکس کے اس اقتباس پر غور فرمائیں،

Formalist theory realised that the 'meaning' habitually carried by words can never be fully seperated from the words themselves because no word has 'simple' one meaning. The 'meaning of A is not simply A1 or A2 or A3, for A has a larger capacity to mean which derives from its particular context or use. No word is ever really a mere proxy for a denoted object. Infact the transaction of 'meaning' has a coplexity of dimensions which the 'poetic' use of language further complicates. Poetry, in short, does not seperate a word from its meaning, so much as multiply - bewildering - the range of meanings available to it... (P, 64).

نارنگ صاحب کے اس اقتباس پر نظر ڈالتے ہیں:

’’ہیئت پسندوں کو اس کا احساس تھا کہ لفظ معنی سے اور معنی لفظ سے یکسر جدا نہیں کیے جا سکتے، اور معنی کا نظام اتنا سادہ نہیں جتنا بالعموم سمجھا جاتا ہے۔ الف کا مطلب محض الف ۱، الف ۲، یا الف ۳ نہیں ہے کیونکہ الف کے معنی سیاق و سباق سے اور دوسرے لفظوں سے مل کر یکسر بدلتے رہتے ہیں۔ کوئی لفظ کسی شے کے محدود معنی میں ہمیشہ کے لیے قائم نہیں ہے۔ پس شعری زبان اگرچہ لفظ کو قائم بالذات کرتی ہے لیکن اس کو معنی سے جدا نہیں کرتی، بلکہ اس کے مختلف مفاہیمی امکانات کو ابھارتی ہے، یعنی معنیاتی قوسِ قزح کو پیدا کرتی ہے۔ معنی کی یہ بوقلمونی اکثر طلسمِ خیال یا حیرت و استعجاب کی کیفیت کی حامل ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔‘‘ جاری ہے (ص، ۸۹)۔

ان تمام حوالہ جات کے بعد، اس رجحان کی حوصلہ شکنی کے لیے، مثبت انداز میں سوچنے کی ضرورت ہے، نہ کہ نقالی کے دفاع کی تیاری کے لیے فقروں کو غلط پیرائے میں بیان کرنے کے لیے نقالی کے حق میں دلائل تراشنے کی کوشش کی جائے۔ آج وہ وقت نہیں ہے کہ مغربی علمی آمریت کے سامنے سجدہ ریز ہوا جائے۔ ایک بار پھر ایسے رویے پنپنے چاہئیں جن سے علوم کا ارتقاء ممکن ہو۔ لیوٹارڈ ’’پوسٹ ماڈرن کنڈیشن‘‘ کے پہلے باب میں کمال کی

پیشین گوئی کرتا ہے۔اس کا کہنا ہے کہ مستقبل میں مغربی اقوام اس لیے دنیا پر حکومت کریں گی کیونکہ علومپر ان کی بالا دستی ہوگی۔لیوٹارڈ کے اس بصیرت افروز فقرے کو ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے۔اس حقیقت کو عملی جامہ نقل یا سرقے سے کبھی نہیں پہنایا جاسکتا۔اب ان تمام علوم میں آگے بڑھنا مقصود ہے ورنہ اہلِ اردو اسی بات پر خوش ہوتے رہیں گے کہ ’’اہلِ مغرب نے سب کچھ ہم سے لیا ہے۔‘‘

اس کے بعد جوئیہ صاحب کی ساختیات میں تصورِ مرکزیت کے حوالے سے ’’ڈاکٹر وزیر آغا‘‘ کے مضمون کی روشنی میں دی گئی اطلاع کہ ’’ساختیات کے مرکزیت کے تصور کو وحدت الوجود کی فکر کے مماثل‘‘ سمجھنا چاہیے، کا جوئیہ صاحب کے اس خط سے کوئی خاص تعلق واضح نہیں ہو رہا۔اگر ان کا ارادہ کسی مختلف موقف کی بنا پر بحث کا آغاز کرنے کے بارے میں تھا تو یقیناً انہیں اس امر کی کچھ وضاحت پیش کرنی چاہیے تھی بالکل ایسی جیسی وہ مجھ سے دریدا کے ’’متن‘‘ کے بارے میں میرے نفسِ مضمون سے غیر متعلقہ ہونے کے باوجود توقع کر رہے تھے۔اگر اس بحث کے لیے نارنگ صاحب کی کتاب سے کوئی قضیہ اٹھاتے تو زیادہ بہتر تھا کیونکہ ہم نے گوپی چند نارنگ صاحب کے عدم موقف کا ذکر کیا تھا۔ابھی تک نارنگ صاحب کی کتاب میں صرف نقل کے رجحانات پر توجہ دی گئی ہے۔فکر کے اعتبار سے ان کے تمام تضادات اور مضمون نگاری کے تقاضوں کے تحت ان کی قباحتوں کا تفصیلی جائزہ نہیں لیا گیا۔جوئیہ صاحب یا نارنگ صاحب اپنی کمزوری کو وزیر آغا کے ’’وحدت الوجود‘‘ موقف سے دور نہیں کر سکتے۔

تاہم وزیر آغا کا یہ عمل اس اعتبار سے قابلِ تحسین ہے کہ وہ اپنا ایک موقف رکھتے ہیں، وہ کس حد تک ڈیکنسٹرکشن اور ’’وحدت الوجود‘‘ میں ربط تلاش کر پائے، اس امر کا تجزیہ کرنا اس مضمون کے دائرہ سے خارج ہے۔اگر جوئیہ صاحب کو وزیر آغا کا موقف ’’بجا‘‘ لگا ہے تو کیا کسی اور شخص کو نارنگ صاحب کے کسی بھی موقف کو اختیار نہ کرنے کا عمل بھی ’’بجا‘‘ لگا ہے یا نہیں؟ اگر محترم جوئیہ صاحب ان کی نقل یا ان کے مفہوم میں Intertexuality کے دفاع پر کمر بستہ ہو سکتے ہیں تو ان کے کسی موقف کو عیاں کیوں نہیں کر سکتے؟ شاید وہ کسی اور جگہ یہ موقف پیش کریں کہ گوپی چند نارنگ نے ’’مشرقی شعریات‘‘ والے حصے میں ساختیاتی تھیوری کو چار ہزار برس قبل، ہندستان کے کسی گاؤں میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ایک یا دو فقروں کا حوالہ بھی تلاش کر لیں، تو یہاں پر عرض یہ ہے کہ ایک یا دو فقرے مفروضہ Hypothesis تو ہو سکتے ہیں، مربوط انداز میں پیش کی گئی تھیوری نہیں۔

افلاطون کے فلسفے میں ’شعور‘ کا لفظ پڑھ کر یہ فیصلہ دے دینا کہ شیلنگ یا کولرج نے بھی یہی لفظ استعمال کیا ہے، لہٰذا ان دونوں کا فلسفہ افلاطون کے فلسفے سے ملتا جلتا ہے، یہ رویہ گہرے تنقیدی تجزیے کا غماز معلوم نہیں ہوتا۔ شعور کا لفظ تو تمام فلسفی استعمال کرتے ہیں، اصل سوال تو اصطلاحات میں امتیاز قائم کرنا ہوتا ہے۔اگر جوئیہ صاحب کو یقین ہے کہ ’’مشرقی شعریات‘‘ کی گوپی چند نارنگ صاحب کی تشریح درست ہے اور یہ مشرقی موقف ہے تو اس کا انگریزی ترجمہ بھی ہو جانا چاہیے، کم از کم کوئی موقف تو سامنے آئے، ابھی تک تو سیاست سے لے کر ادب تک

کچھ بھی اپنا نہیں ہے۔دوسری طرف شاید گوپی چند نارنگ صاحب ساختیات یا ڈیکنسٹرکشن کے بارے میں اپنا موقف جان بوجھ کر چھپانا چاہتے ہیں۔اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔

بہرحال جہاں تک وزیر آغا کے ساختیات کو ’وحدت الوجود‘ سمجھنے کا سوال ہے تو جس پیرائے میں جوئیہ صاحب اس نکتے کو بیان کر رہے ہیں اس کا اس بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔جہاں تک ’’مماثل‘‘ ہونے کا تعلق ہے تو اسے زبان کے اندر سے اس کے اپنے رشتوں اور تضادات میں تلاش کیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ویسے تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ تمام پرندوں کے پر ہوتے ہیں، تو کیا اس سے تمام پرندوں کو ایک ہی نام دیا جاسکتا ہے؟ محض پروں کی بنیاد پر تو ہم پرستی کو تو ترقی مل سکتی ہے لیکن سائنسی طرزِ فکر پنپنے میں اس طرح کے رویے مانع ہوں گے۔

کسی بھی ایک فلسفے کو کسی دوسرے فلسفے سے رد کرنا غیر منطقی اور غیر سائنسی سوچ کا نتیجہ ہوتا ہے۔کانٹ کے فلسفے کو ہیگل کے فلسفے سے رد نہیں کیا جاسکتا تاوقتیکہ ہیگل، کانٹ کے فلسفے کے تضادات کانٹ کے فلسفے کے اندر سے نہ دکھائے۔نارنگ صاحب بھی ساختیات کے تضادات دکھا سکتے تھے لیکن اس سے پہلے ان تضادات کو سمجھنا ضروری تھا۔نارنگ صاحب تو لاکاں پر لکھے گئے باب، جس کا ترجمہ انہوں نے پیٹر بیری کی کتاب Begining Theory سے کیا ہے، میں لاکاں اور فرائیڈ کے درمیان تضاد کو بھی نہیں دکھا سکے۔عام قاری کے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ فرائیڈ کو یہاں پر گھسیٹنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی؟ کیا نارنگ صاحب صرف یہ بتانا چاہتے تھے کہ وہ فرائیڈ کے بارے میں بھی جانتے ہیں؟ محض جاننا ہی کافی نہیں ہوتا۔مفکر کی فکر کو آگے بڑھانا بھی ضروری ہوتا ہے۔اگر دو نظریہ سازوں کا ذکر کیا ہے تو دونوں کے درمیان فرق دکھانا ضروری ہو جاتا ہے (اس فقرے کے بعد اس بات کا بھی اندیشہ ہے کہ جوئیہ صاحب اس بات پر اعتراض اٹھا دیں کہ لاکاں کو نظریہ ساز نہیں کہنا چاہیے تھا)۔اگر نارنگ صاحب ہی کسی خیال کو آگے نہیں بڑھا سکے تو طالبِ علم سے کیا امید رکھیں گے کہ وہ علوم کے ارتقاء میں اپنا حصہ کیسے ڈالیں؟ کیا علوم کو صرف ایک بار سیکھنا ہی ضروری ہوتا ہے۔اس کے بعد اسے فارمولے کی شکل عطا کر دی جائے اور آنے والی نسلوں کے لیے اسے مقدس قرار دے دیا جائے۔ادبی تھیوری، فلسفہ یا سائنس کے ساتھ اس طرح کا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے کہ وہ بچپن میں ملّا یا پنڈت سے لیا ہوا کوئی درس معلوم ہو۔اس طرح ملّا، پنڈت یا پھر نارنگ صاحب میں فرق کیسے کیا جائے گا؟ اس طرح کا فرق محض موضوع کے مختلف ہونے کی بنا پر قائم نہیں کیا جاسکتا۔یہ دیکھنا ہے کہ اس موضوع تک پہنچنے کے لیے ہم کون سا راستہ اختیار کرتے ہیں۔

اب پھر اسی نکتے کی جانب لوٹتے ہیں جس میں مرکزیت کا ذکر کیا گیا ہے۔اگر ژاک دریدا سیوسئیر کے حتمی سگنیفائڈ میں مابعد الطبیعاتی جمود اور مرکزیت کو عیاں کر چکا تھا اور اس میں تسلسل کا دعویدار تھا تو جوئیہ صاحب ’’وحدت الوجود‘‘ کا ذکر کر کے کیا ثابت کر رہے ہیں، اس کی مزید وضاحت کی ضرورت تھی۔ویسے اُن سے یہ عرض ہے کہ جس سمپوزیم کا انہوں نے ذکر کیا ہے جس میں مضمون پڑھا گیا تھا اس کا کوئی نام بھی تو ہونا چاہیے یا شاید ان کا

ارادہ یہ ہو کہ اس مضمون کو بھی نارنگ صاحب کی Intertextuality کی بھینٹ چڑھا کر جناب نارنگ کا نام بطورِ مصنف تحریر کر دیا جائے۔ بہر حال دریدا کے مضمون جس کا شاید وہ حوالہ دینا چاہتے تھے لیکن گریز کیا، اس کا نام Structure, Sign and Play تھا۔(اس مضمون کا نام اس لیے دیا جا رہا ہے تا کہ مستقبل میں کہیں نارنگ صاحب اس کے ترجمے پر اپنا نام نہ تحریر فرما دیں)۔اسی میں دریدا نے لسانیات کی بنیاد پر ہر جگہ مرکزیت قائم کرنے کی کوشش کچھ ان الفاظ میں کی تھی،

The center is the center of totality, and yet, since the center does not belong to the totality...the totality has its center elsewhere.(Structuralist Controversy,247)

اگر جوئیہ صاحب اس طرح کی کسی تشریح میں ''وحدت الوجود'' کو تلاش کر رہے ہیں تو پھر ان کے اس تیقن کو واقعی 'بجا' کہنا چاہیے۔افلاطون کو پڑھنے کے بعد جب کانٹ کو پڑھا جائے تو چند صفحات کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید افلاطون کو ہی پڑھا جا رہا ہے۔تا وقتیکہ کہ کانٹ کے فلسفے کی صحیح تفہیم ہونی شروع نہ ہو جائے۔تاہم اس قضیے میں بحث کی کافی گنجائش موجود ہے۔دریدا سے بھی قبل رومن جیکب سن اور رولاں بارتھ 'مرکزیت' کے تصور کی نشاندہی کر چکے تھے اور اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے راستہ بھی ہموار کر چکے تھے۔ یہ رجحان بارتھ کے مضمون ''مصنف کی موت'' ہی میں پنہاں نہیں تھا بلکہ اس کے ایک اور مضمون MythToday میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے جس میں اس نے 'متھ' کو 'لونگ'' کے مماثل قرار دیا اور اس کے ذریعے ثقافت کو 'نیچرل لائز' کرنے کی وضاحت پیش کی۔بارتھ نے ثقافتی سطح پر معنی خیزی (Signification) کے عمل میں ٹھہراؤ کی بجائے تسلسل کو لازمی گردان کر ''مائیتھالوجی'' کے مرکزی خیال کی نفی خود ہی کر دی تھی۔

جبکہ رومن جیکب سن نے ۱۹۴۲ میں 'فونیم' کی تنقید کے دوران 'فونیم' کو سیوسیئر کے برعکس باقی تمام لسانیاتی اکائیوں سے مختلف قرار دیا جس کو سیوسیئر سمجھ کر اس کا اطلاق 'سائن' کی سطح پر کرنے میں ناکام رہا تھا۔جیکب سن نے 'فونیم' میں معنی آفرینی کے لیے سائن میں اپوزیشن کے رجحان کو نمایاں کیا۔ جیکبسن کی 'فونیم' کی تھیوری 'سگنیفائیڈ' کی حتمیت کو چیلنج کرتی تھی، مثال کے طور پر اس نے جرمن زبان کے الفاظ (nacht) رات اور (nachte) راتیں کو پیش کر کے علیحدگی میں معنی کے نہ ہونے کی اغلاط کو واضح کر دیا کیونکہ ایک ہی لفظ میں تکثیریت کا پہلو برآمد ہو رہا تھا، تو کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا جائے کہ ساختیات محض ایک واہمہ تھا؟ اگر اردو میں زبان کے حوالے سے کسی نے اس قدر بھر پور مطالعہ پیش کیا ہو تو جوئیہ صاحب مہربانی فرما کر اس کا حوالہ ضرور پیش کر دیں۔

جوئیہ صاحب کی مفروضہ قائم کرنے کی کوشش سے میری حیرت میں بدستور اضافہ ہوتا جا رہا ہے کہ ژاک دریدا کو ڈیکنسٹرکشن کی تھیوری پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی۔اردو میں اس طرح کے اعلیٰ درجہ کے نقاد بھی موجود ہیں جو ڈیکنسٹرکشن کے حق میں بھی بولتے ہیں اور اپنی حمایت میں پروپیگنڈا قسم کے مضمون لکھوا کر اپنی مستقل موجودگی قائم کرنے کے بھی خواہاں دکھائی دیتے ہیں۔دریدا جس 'موجودگی' Presence کے تصور کے خلاف دریدا،

کانٹ، ہیگل، سیوسیئر، ہسرل اور ہائیڈیگر وغیرہ کی مدد سے برسرِ پیکار ہوتا رہا ہے، آج اس کی تھیوری کے تقریباً اکتالیس اور اس کی موت کے تین برس بعد اس کی اپنی 'موجودگی' تمام دنیا کو ایک بار پھر عدم 'موجودگی' کے تصور کے خلاف لڑنے پر مجبور کر رہی ہے۔فرد موجود ہے لیکن اپنی عدم موجودگی کے حق میں دلائل دے رہا ہے۔اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ اس نے بحیثیت ایک لسانیاتی خیال پرست 'مابعدالطبیعات' کے خلاف جنگ لڑی تھی۔اگرچہ اس نے 'مابعدالطبیعات' کو محض اپنے دماغ کے اندر ہی ختم کرنا چاہا تھا۔Gershom Scholem تو یہ کہتا ہے کہ دریدا ''قدیم عہد نامہ' کے مرکزی تصور کہ یہودیوں کا خدا فرد کے اندر خود کو ظاہر کرے گا، کو ڈیکنسٹرکشن کے ذریعے ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔یقیناً یہ تصور یہودی متصوفانہ روایت سے جا ملتا ہے، تو کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دریدا چالاکی سے تمام دنیا کو یہودیت کی سچائی کا یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہے، جس کے لیے اس نے الفاظ کا سہارا لیا۔ہیبر ماس، دریدا کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کرتا ہے کہ

All denails not withstanding, remains close to Jewish mysticism. (PDM, P, 183)

ژاک دریدا نے سماجی تعلقات کو ان کی اپنی فطرت میں دیکھنے کی بجائے لسانیات میں تلاش کیا۔ بہر حال اس کی بعد میں آنے والی کتابوں بالخصوص Spectres of Marx میں وہ ایک بار پھر مارکس کی جانب رجوع کرنے پر اصرار کرتا ہے۔اس طرح وہ اپنی ہی تھیوری کی حدود متعین کر دیتا ہے۔(اس کی مکمل بحث کے لیے میرا مضمون، 'ژاک دریدا کے فلسفے کا مآخذ' ملاحظہ کیا جا سکتا ہے)۔جوئیہ صاحب نے نارنگ صاحب کے بارے میں میرے مضمون کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا تھا اور جس سے اُنھیں شاید کافی ''تپ چڑھی'' تھی کہ گوپی چند نارنگ ''ادبی نقاد ہی کیوں بنا سیاسی لیڈر یا سوشل مفکر بن کر ''میدانِ کارزار'' میں کیوں نہیں آیا؟'' اُن کی اس ''تپ'' کا محرک اُن کی ''وحدت الوجود'' کی خواہش کے اظہار میں نظر آ رہا ہے۔دراصل وہ مجھے ''سوشل مفکر'' کے برعکس 'خلائی' یا 'وحدت الوجودی' مفکر کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ویسے اگر 'جلدی' نہ کی جائے اور ذرا ٹھہر کر سوچنے کی کوشش کی جائے تو واضح ہو گا کہ اس خواہش کے اظہار میں اُنھوں نے ٹھوس سماجی عوامل کے برعکس مابعدالطبیعاتی تناظر کو خوب ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔لیکن سوال تو پھر تجرید کی تبلیغ پر ہی منتج ہوتا ہے۔اس فکر نے تو ایک عرصہ سے اُردو ادب کا محاصرہ کر رکھا ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ ادب کا بڑا حصہ محض گناہ بخشوانے کی سعی معلوم ہوتی ہے، جبکہ اصل سوال تو 'ٹھوس' کی وضاحت کا ہے۔دوسری جانب جن مفکروں کی تھیوریوں کو درآمد کیا جاتا ہے وہ تو سارے کے سارے سماجی، سیاسی اور ادبی مفکر تھے جیسا کہ ہم وضاحت کر آئے ہیں۔

جوئیہ صاحب نے اُردو ادب میں اور تخلیقیت کے فقدان اور نقالی کے جواز کے رجحان کی حوصلہ افزائی کے لئے جولیا کرسٹیوا کی بین المتونیت Intertextuality کی 'تھیوری' کا حوالہ پیش کیا ہے۔نقالی کے دفاع کے لئے شاید اُن کے نزدیک اس سے بہتر حوالہ کوئی نہیں تھا۔اب ہم اُمید کر سکتے ہیں کہ اُن کی اس سوچ کی اشاعت کے بعد

دریدا کی Of Grammatology یا پھر فوکو کی کتاب The Archaeology of Knowledge میں چند ایک ترامیم کے ساتھ جوئیہ صاحب کے کسی 'نقاد' قسم کے مشیر کا نام بحیثیت مصنف کے لکھا ہوگا۔ ویسے اگر جولیا کرسٹیوا کو اس بات کا علم ہو جاتا کہ اُردو میں اس کی تھیوری کا یہ مطلب لیا جا رہا ہے تو وہ شاید اپنی زندگی میں ہی اس نظریے سے دست بردار ہو جاتی اور اگر اسے کہیں یہ خبر ہو جاتی کہ اردو کا کوئی خودساختہ بڑا 'نقاد' اس کے تمام کام کو 'ہتھیانے' کی تیاری میں ہے تو وہ شاید علمی و فکری کام چھوڑ کر کسی 'حمام' کی سرپرستِ اعلیٰ بننے کو ترجیح دیتی۔ اب وہ حمام میں بھی تو حصہ دار نہیں بن سکتی تھی۔

اپنے اسی intertextuality کے نقطۂ نظر کی وضاحت کے سلسلے میں محترم جوئیہ صاحب اپنے ہی چند نکات سے تضاد پیدا کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، کیونکہ وہ بڑی حیرت سے اس امر کا اظہار کر چکے ہیں کہ ''کیا پوسٹ ماڈرن ازم تھیوری ہے؟'' اور اب خود ہی کہہ رہے ہیں کہ ''جولیا کرسٹیوا کی intertextuality کی تھیوری۔'' اگر جولیا کرسٹیوا کی 'تھیوری' بقول جوئیہ صاحب 'تھیوری' ہے تو کیا وہ پوسٹ ماڈرن فکر کی حامل نہیں ہے؟ پوسٹ ماڈرن تھیوری دراصل تھیوری ہی ہے، جس کی تہہ میں ساختیات کے برعکس پسِ ساختیاتی علمیات کارفرما ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ پس ساختیات پوسٹ ماڈرن بالائی ساخت کی بنیاد ہے۔ پسِ ساختیات افتراق، اضافیت، خودمختار وغیرہ جیسے عوامل کو حتمی سمجھتی ہے تو دوسری طرف پوسٹ ماڈرن ثقافت میں بھی سگنیفائر کے تسلسل کی منطق کارفرما ہے۔ بالکل اس طرح جیسے لیوائی سٹراس کے علم البشریات کی تہہ میں لسانیات متحرک تھی۔

پوسٹ ماڈرن ازم کے متعلق مندرجہ بالا اقتباس میں جناب جوئیہ صاحب نے جولیا کرسٹیوا کی Intertextuality کو 'تھیوری' کہا ہے، جبکہ راقم کی پوسٹ ماڈرن لٹریری تھیوری کی اصطلاح پسند نہیں آئی۔ اگر اتنی سی وضاحت سے اُن کی تسلی نہ ہوئی ہو تو Niall Lucy کی مرتب کردہ اینتھالوجی، جو The Postmodern Literary Theory کے نام سے شائع ہوئی ہے، محترم اُس کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اہل اردو کا المیہ یہ ہے کہ خودساختہ مفکر خود بھی اور اپنے طالب علموں کو بھی اصطلاحات میں پھنسائے رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے اصطلاحات کو تقدس عطا کرنا ہوتا ہے، نہ کہ انہیں تنقیدی نظر سے دیکھنا مقصود ہوتا ہے۔ اس وجہ سے جن اصطلاحات کو وہ رٹہ لگا لیتے ہیں پھر اس سے باہر انہیں کوئی معنی دکھائی ہی نہیں دیتا تاوقتیکہ بارتھ یا دریدا انہیں نیا معنی سمجھانے کے لیے میدان میں نہ اتر آئیں۔ یہاں پر یہ عرض کر دوں کہ بعض اوقات خود بھی سوچ لینا ضروری ہوتا ہے۔ کیا جوئیہ صاحب یا ان کے مشیر اس بات سے باخبر ہیں کہ فرانسیسی ڈیکنسٹرکشن کو امریکہ میں اہم تبدیلیوں کے بعد قبول کیا گیا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ڈیکنسٹرکشن مختلف تناظر میں پہنچ چکی تھی۔ کیا اردو والوں کے لیے اپنا کوئی تناظر موجود ہے یا پھر وہ ہر تناظر کو ہی اپنا تناظر سمجھتے ہیں؟

جوئیہ صاحب نے کرسٹیوا کا ذکر بھی صحیح وقت پر کیا ہے۔ یقیناً کرسٹیوا کی سوچ میں واضح تبدیلی فرانس میں

۱۹۶۸ کے طالب علم اور مزدور انقلاب کے بعد آتی ہے کیونکہ اس وقت زبان کے حوالے سے تناظر کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ کرسٹیوا نے ۱۹۶۸ کے بعد The Revolution in Poetic Language تحریر کی، جس میں زبان کے حوالے سے 'صورتحال' کی اہمیت کو اجاگر کرنا تھا۔ اگر رولاں بارتھ 'حظ' اٹھانے کے لیے ایک تناظر کی تخلیق ضروری سمجھتا ہے تو لکھنے کے لیے صورتحال کی اہمیت سے انکار کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال اسی وقت کرسٹیوا نے اپنی کتاب میں مارکسی Vocabulary کا استعمال کیا اور زبان کو ہی صورتحال کے مطابق ٹھوس معنی عطا کرنے کی کوشش پر زور دیا۔ یہی وجہ ہے کہ کرسٹیوا کو Situationist کہا جانے لگا۔ یہ بات طے ہے کہ 'لفظ' اپنے محرکات کو چھپانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ ویسے تو مغربی ڈسکورس میں ظلم، ناانصافی، تشدد وغیرہ جیسے 'الفاظ' استعمال کرنے سے گریز کیا جاتا ہے، لیکن اگر ان کا استعمال کر بھی لیا جائے تو لفظ اصل تناظر کی شدت کو مدہم کر سکتا ہے۔

دانشور کا طریقہ کار مختلف ہوتا ہے۔ متذکرہ بالا الفاظ کے استعمال سے ان کی الفاظ کے محرکات کی طرف توجہ مبذول ہونے لگتی ہے۔ فرض کریں کہ اگر مارکسی مفہوم میں لفظ 'استحصال' یا جنس (commodity) کا استعمال کیا جاتا ہے تو جب تک ان الفاظ کا پسِ منظر دریافت نہیں کیا جائے گا، حقیقی معنی کا تعین کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ مارکسی مفکروں کو سگنیفائر کی آمریت کبھی قبول نہیں ہو سکتی۔ وہ حالات جو ان الفاظ کو استعمال کرنے کا راستہ ہموار کر رہے ہیں جب تک انہیں سمجھنے کی کوشش نہیں کی جائے گی، اس وقت تک تناظر کی اہمیت بھی واضح نہیں ہوگی اور الفاظ محض ''جمالیاتی تماش بینی'' کا ذریعہ بننے کے علاوہ اور کوئی اثر پیدا نہیں کریں گے۔ کرسٹیوا کو اس امر کا ادراک تھا کہ زبان معنی تو اپنی ہی منطق سے پیدا کرے گی لیکن اگر زبان کو 'سچویشن' عطا کر دی جائے تو اس وجہ سے خارجی، متعلقہ اور لازمی تقاضوں کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ اس مفہوم میں زبان ہر 'لیبارٹری' میں سائنس تو رہتی ہے لیکن معنی کی نوعیت یکسر بدل جاتی ہے۔

جب ۱۹۶۸ء میں ساختیاتی ماڈل کا شیرازہ بکھرا اور ساختیاتی مفکر اپنی ساختیاتی شناخت سے انحراف کرنے لگے تو حتمی شناختوں کے تصور کو زک پہنچی تو عمل کے برعکس نظریاتی سطح پر سگنیفائڈ سے چھٹکارا مل گیا (صرف نظریاتی سطح پر)۔ اُسی پسِ ساختیاتی رجحان کے پیشِ نظر فرانسیسی فلسفی لیوٹارڈ نے امریکی حکومتی ادارے کی استدعا پر امریکی معاشرے کی حالت پر ۱۹۷۹ء میں ایک رپورٹ لکھی جسے The Postmodern condition: A Report on Knowledge کا نام دیا گیا۔ اس رپورٹ میں لیوٹارڈ نے دو سو پچاس سے زائد تحریروں کے حوالے قلمبند کیے۔ جن میں سے صرف ایک حوالہ بھی مشرقی ممالک سے تلاش کرنے کی کوشش مایوسی پر منتج ہوگی، یعنی مغربی مفکر نے مشرقی ممالک کو اپنے فکری ایجنڈے سے حذف کرنے میں ہی اپنی بقا محسوس کی۔ مقصود اُسے سماجی و ادبی مفکروں اور سائنسدانوں کے افکار کی روشنی میں معروضی رجحان کو عیاں کرنا تھا۔ لیوٹارڈ پر پسِ ساختیاتی رجحان غالب تھا۔ اس نے بالائی ساخت کی تشریح اسی تصور کے تحت کی۔ اس وضاحت کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ پسِ ساختیاتی رجحان،

پوسٹ ماڈرن ازم کی علمیات ہے۔

مابعد جدیدیت دراصل عہدِ حاضر کی انحطاط پذیر معروضی صورتحال ہے، اس کے وجود میں آنے کے تمام محرکات میں مغربی دنیا کے داخلی تضادات کے علاوہ عالمی سرمایہ داری نظام اور بالخصوص سٹالن ازم کا انہدام تھا۔ مغربی معیشت نے ۱۹۳۰ کے بحران کے بعد جان مینارڈ کینز کی ریاستی مداخلت کی تھیوری کو بنیاد بنا کر خاطر خواہ ترقی کی تھی۔ مغربی بورژوازی نے اسے مارکسی معیشت کا نعم البدل قرار دے دیا۔ دوسری جنگِ عظیم سے پہلے تضادات پھر شدت اختیار کر گئے اور سامراج نے دنیا میں تباہی برپا کر دی۔ ۱۹۵۰ کے بعد پھر جان کینز کو ہی مدد کے لیے پکارا گیا جس سے معاشی ترقی ریکارڈ سطح پر ہوئی۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۰ کے بعد نیو کینز ازم کی تھیوری کے غبارے سے بھی ہوا نکل چکی تھی گو کہ وہ مستقل نہیں تھی۔ ایک بار پھر تکنیکی انقلاب برپا ہوا جس نے مغربی معاشرے کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا۔

مختصر یہ کہ عظیم لینن کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی اور سرمایہ داری سامراجی مراحل میں داخل ہو گئی۔ تکنیکی انقلاب سے معیشت کے تمام میدانوں میں ری سٹرکچرنگ کی ضرورت محسوس ہوئی جس سے ایک نئے بحران کا اضافہ ہوا۔ اس ذہنی کشمکش کے بعد اور کوئی چارہ کار موجود نہیں تھا کہ منتشر شدہ سماج کی تشریح روایتی فلسفوں کے برعکس نئے انداز میں کی جاتی۔ ثقافتی سطح پر جن تفریقات نے جنم لیا ان کے بعد نظریہ سازوں نے بالائی ساخت کو زبان کی ساخت کا عکس قرار دے دیا۔ یہی وہ دور تھا جب معروضیت، سچائی، ارتقاء اور سماج کی نامیاتی وحدت کو شک کی نظر سے دیکھا گیا۔ پوسٹ ماڈرن علمیات کا تقاضہ یہ تھا کہ ہر اس خیال، فلسفے اور نظریے کی دھجیاں بکھیر دے جو نجات کا علمبردار ہونے کا دعوی کرے۔ مابعد جدید مفکروں نے یہ سوچا گیا کہ سماج کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے کیونکہ 'نجات' کا مقصد یہ ہے کہ کسی صورتحال کو کسی چوکھٹے سے گزارنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لاکاں سمیت ارتقاء کے کئی مخالف نظریہ سازوں نے یہ کہا کہ کسی بھی عمل کی تفہیم حاصل کرنے کی کوشش ہی نہ کی جائے۔ فرانس میں فوکو اور رولاں بارتھ وغیرہ نے اپنی جبلی ہم جنس پرستانہ ضرورت کا دفاع کیا، جو ان کے ہر قول سے جھلکتا ہے۔ اردو میں گوپی چند نارنگ صاحب جیسے نقاد اپنے داخلی تضادات پر توجہ مرکوز کرنے کی بجائے علمیت کا اثر پیدا کرنے کے چکر میں مصروف ہو گئے اور تھیوری کو اس کے تناظر سے محروم کر کے مشرقی طالب علم کو فکری حوالوں سے گمراہ کرنے کا بیڑہ اٹھا لیا۔

جوئیہ صاحب کا آخری قابلِ ذکر نکتہ یہ ہے کہ راقم کو ''اردو میں پہلے سے قائم' اس روایتی حمام کے سب ننگوں کو ننگا'' دکھانا چاہیے۔ بہر حال جوئیہ صاحب نے یہ تو تسلیم کیا کہ ''ننگے'' کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں، لیکن اس بات کی کوئی سمجھ نہیں آئی کہ یہ ذمہ داری وہ مجھے کیوں سونپنا چاہتے ہیں، جبکہ خود وہ یہ کہہ چکے ہیں کہ انہوں نے دریدا کے انگریزی مضمون کا خود مطالعہ کیا تھا، یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے اس مضمون کا نام نہیں بتایا،

بہر حال ان کی انگریزی پر دسترس ہونے کو تسلیم کر لیتے ہیں اور اسی تناظر میں ان سے یہ گزارش کرتے ہیں کہ 'حمام' مجھ سے زیادہ ان کے قریب ہے اور ویسے بھی مقالے کا موضوع ''پلپچر ازم ان اردو لٹریچر'' نہیں ہے اس لیے جوئیہ صاحب کو خود بھی کچھ تگ و دو کرنی چاہیے ورنہ 'حمام' میں 'ننگوں' کی تحسین کا پہلو تو ہمہ وقت موجود ہے۔

نارنگ کی کتابوں کی فہرست حامد علی خاں کی کتاب میں درج ہے مگر لطیفہ یہ ہے کہ فہرست میں درج پہلی ہی کتاب غیر مطبوعہ ہے۔۔کوئی بھی شخص غیر مطبوعہ کتابوں کی طویل فہرست پیش کر سکتا ہے۔۔چالیس کتابوں کی فہرست میں بارہ کتابوں کے پروفیسر موصوف نرے مرتب ہیں، مصنف نہیں۔ اب پروفیسر موصوف کی تصانیف کی تعداد ٹھہری: ۴۰-۱۲=۲۸۔۔۔ان اٹھائیس کتابوں میں سے ایک کتاب (معراج العاشقین) کے پروفیسر موصوف حاشیہ نگار ہیں۔ چھ کتابیں ایسی ہیں جنہیں نارنگ نے خود ترتیب نہیں دی ہیں بلکہ ترتیب کے عمل میں موصوف شامل ہیں۔ اب تصانیف کی تعداد ٹھہری ۲۸-۶=۲۲

حضرت نے کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کی Anthology کو مرتب کیا ہے۔ Anthology کا لغوی معنی ہوتا ہے، انتخاب۔ انہیں کسی بھی طرح تصنیف نہیں کہا جا سکتا۔ اب پروفیسر موصوف کی تصانیف کی تعداد ہوئی بیس۔ طوالت سے بچتے ہوئے صرف یہی کہنا ہے کہ حامد علی خاں کے مطابق چالیس سے زیادہ کتابیں گوپی چند نارنگ کی تصانیف میں درج ہیں، مگر ان کتابوں میں سے چھبیس ستائیس کتابیں ایسی ہیں جنھیں پروفیسر موصوف نے یا تو ترتیب دیا ہے یا ان کے ایڈیٹوریل بورڈ میں شامل رہے ہیں یا کسی کے اشتراک سے ان پر کام کیا ہے۔

الفاظ (علی گڑھ) شمارہ ۱، ۲، جلد۔۱۱ کے صفحات ۹۴۔۹۵ میں بھی پروفیسر موصوف کی کتابوں کی فہرست درج ہے۔ اس فہرست کے مطابق شری نارنگ صرف چھ، جی ہاں صرف چھ کتابوں کے مصنف کہے جا سکتے ہیں۔ وہ کتابیں ہیں: 1۔ ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں ۱۹۶۰ء۔ 2۔ کرخنداری اردو کا لسانیاتی مطالعہ (انگریزی) ۱۹۶۱ء۔ 3۔ اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو۔۱۹۶۲ء۔ 4۔ ریڈنگز اِن اردو پروز (انگریزی۔اردو) ۱۹۶۷ء۔ 5۔ سفر آشنا۔۱۹۸۲ء۔ 6۔ اسلوبیات میر۔۱۹۸۴ء۔

ان کتابوں میں صرف دو کتابیں ایسی ہیں جن کا شمار تنقیدی تصانیف میں ہو سکتا ہے۔ الفاظ کے مذکورہ شمارہ کی اشاعت کے بعد پروفیسر موصوف نے یہ اردو کتابیں شائع کرائیں۔ 1۔ قاری اساس تنقید۔۱۹۹۲ء
2۔ ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات۔۱۹۹۳ء

مذکورہ دونوں کتابیں ادنیٰ ترین تراجم کی بدترین مثالیں ہیں۔

(**سکندر احمد** کے مضمون **گوپی چند نارنگ کی تصانیف کی حقیقی تعداد** سے اقتباس مطبوعہ **اعتراف** پٹنہ یکم مارچ ۲۰۰۲ء بحوالہ کتاب **تماشائے اہل قلم** مرتب فاروق ارگلی)

امین خیال کے ماہیے

کوئی بھی کام کروں
ربِ رحمٰن ہے جو
نام اس کا ہی پہلے لوں

کشف المحجوب ہے تو
مجھ پر ظاہر ہو
میرا محبوب ہے تو

تانبے کا پیسا ہے
ازل سے ابد تلک
ویسے کا ویسا ہے

تو الف ہے، میم ہے تو
لا میں الاّ میں
پوشیدہ تری خوشبو

ہے سب کچھ توں ماہیا
تو جو مجھ میں ہے
میں تجھ میں ہوں ماہیا

دل میں تو سماتا ہے
دیکھوں جس جا بھی
تو ہی نظر آتا ہے

کر اللہ ہو سائیں
بن کر دیکھ اس کا
ہے تو ہی تو سائیں

حیراں ہر بندہ ہے
رب اور یہ دنیا
اک گورکھ دھندہ ہے

کثرت کو، وحدت کو
پا نہ سکا کوئی
اک تیری حقیقت کو

مندری میں ہو نگ جیسے
خود سے مجھ کو تم
کر لو گے الگ کیسے

جیسے بند مٹھی ہے
سلجھ سکے نہ جو
تو ایسی گتھی ہے

میں آنکھ تو نور مِرا
ہر جا تو ہی تو
مجھ سے ہے ظہور ترا

پانی کی گاگر ہے
میں اک قطرہ ہوں
تو پیار کا ساگر ہے

بے چین یہ پل پل ہے
گُل سے جدا ہو کے
جز اب تک بے کل ہے

کیوں قسمت سو گئی ہے
رب جی معاف کرو
جو غلطی ہو گئی ہے

کیا خوب وہ ہستی ہے
حسن پرستی بھی
توحید پرستی ہے

ہر جا تیری ہو ہے
جگ کی ہر شے میں
بس اک تو ہی تو ہے

فرضوں کی ادا کا ہے
مانگ لے جب چاہے
ہر وقت دعا کا ہے

امین خیال کے ماہیے

بے کار یہ بلوے ہیں
مسجد، مندر کیا
ہر جا ترے جلوے ہیں

لولاک لما وہ ہیں
علت غائی ہیں
جگ کا مبدا وہ ہیں

حق اللہ ہُو ماہیا
بڑھ کر دنیا سے
ہے مجھ کو تو ماہیا

اقراری کُن کے ہیں
مہر و ماہ و نجم
سب نوکر اُن کے ہیں

نہ کون و مکاں ہوتا
آپ ﷺ نہ ہوتے تو
سنسار کہاں ہوتا

کر فرض ادا ماہیا
'میں' کو مُنج کر دے
لَو رب سے لگا ماہیا

دے ٹال بلا سائیں
سب کی خیر رہے
ہو سب کا بھلا سائیں

یہ جگت جو دھارن ہے
کملی والے ﷺ یہ
سب تیرے کارن ہے

دیوار میں باری ہے
کیسا پردہ ہے
کیا ظاہر داری ہے

نگری نگری، ہُو ہُو
کون جگہ ہے وہ
جس جا پہ نہیں ہے تو

زمنوں کی، زمانوں کی
علت غائی ہیں
وہ دونوں جہانوں کی

مسجد کہ دَیر رہے
سب کا بھلا ہووے
اور سب کی خیر رہے

میری جند جان ہے وہ
عین الحق ہے وہ
میرا ایمان ہے وہ

جن کا نہ سایہ ہے
سب جگ ان کے ہی
سائے میں آیا ہے

کیوں ڈور یہ اڑ گئی ہے
تیرے وظیفے کی
بس عادت پڑ گئی ہے

مٹی تو نمانی ہے
آپ ہی آگ، ہوا
اور آپ ہی پانی ہے

سن میری صدا شاہا
کون سنے دل کی
بن تیرے سوا شاہا

بچپن سے یہ عادت ہے
اُس کی نماز پڑھوں
جس کی یہ عبادت ہے

امین خیال کے ماہیے

اک دل کش سپین دِکھے
زندگی اپنی جگہ
موت اس سے حسین دِکھے

اک راہی بھٹکا ہوں
عرش نشیں ہو کر
آ خاک پہ اٹکا ہوں

اک فیض تو جاری ہے
غم یا خوشی بخشو
یہ مرضی تمہاری ہے

مطلب سمجھانا تھا
میں نے کہا کچھ تھا
اُس نے کچھ جانا تھا

کیا تو نے کہا پیارے
سسکیاں لیتے ہوئے
گزری ہے صبا پیارے

کوئی بھی آس نہیں
یار کی ڈھارس تھی
اب وہ بھی پاس نہیں

آواز وہ سنتا ہوں
اپنی ہی چوٹی سے
آواز جو دیتا ہوں

کب روشنی پھوٹے گی
دیس کی چوروں سے
کب جان یہ چھوٹے گی

بھر لے کوئی جام ایسا
نام ہو دنیا میں
کر لے کوئی کام ایسا

قندیل جلاتے ہیں
ہمت جو کر لیں
وہ مقصد پاتے ہیں

مت دیکھ ضرورت کو
مہر کی بارش سے
دھو ڈال کدورت کو

کالک ہے منڈیروں پر
مہر نہیں نکلا
کیا بیتی سویروں پر

مہکے ہوئے سہرے سے
پھوٹ پڑیں کرنیں
اس روشن چہرے سے

تو ایک ہے لاکھوں میں
دیکھ کے تجھ کو دیئے
جل اُٹھتے ہیں آنکھوں میں

در دل کے کھولے ہیں
برسوں کے روٹھے
کچھ ہنس کر بولے ہیں

کیا درد کا لہرا ہے
سات سمندر سے
بڑھ کر دل گہرا ہے

تجھ سے ہے عجب ناتا
تجھ بن دل میرا
اب چین نہیں پاتا

ٹیس اب تک جاری ہے
ایڑیوں پہ چلتے
اک عمر گزاری ہے

امین خیال کے ماہیے

اک بار تو مل ماہیا
جان و جگر تیرے
ہے تیرا یہ دل ماہیا

کیا جان کی قیمت ہے
پل بھر مل بیٹھیں
اتنا بھی غنیمت ہے

بس کچھ بھی نہ کہتا ہوں
چشمِ تصور سے
تجھے دیکھتا رہتا ہوں

دیدار رہیں تیرے
ہر پل، ہر لمحے
تو پاس رہے میرے

دل بحر کو چھل* دی ہے
یار نے تو دل کی
دنیا ہی بدل دی ہے

دَم پیار کا بھرتے ہیں
پیار ہی کرتے تھے
ہم پیار ہی کرتے تھے

*پنجابی میں لہر کو چھل کہتے ہیں

عیبوں سے بچاتا ہے
مسلک کوئی ہو
کب بَیر سکھاتا ہے

پربت میں جھرنا ہے
جتنا بھی جی لیں
اک دن تو مرنا ہے

رُشنائے ہوئے رکھنا
سچ کی چاندی کو
چمکائے ہوئے رکھنا

اسٹال ہے ٹائیوں کا
دل سے نکال دے ڈر
یوسف سے بھائیوں کا

افکار پہ ہوتا ہے
اچھا، برا ہونا
کردار پہ ہوتا ہے

آئی ٹی کا زمانہ ہے
ساری دنیا کو
دکھ اپنا سنانا ہے

اعزاز نہیں ہوتا
چلنا سمندر پر
اعجاز نہیں ہوتا

کچھ خبر نہیں سائیں
اڑنا ہواؤں میں
یہ فقر نہیں سائیں

رستم ہے، دارا ہے
نفسِ امارہ کو
جس نے بھی مارا ہے

ٹیس اٹھی ہے چھاتی میں
عیب کمائے ہیں
دو دن کی حیاتی میں

گھاٹے ہیں خسارے ہیں
جگ میں پنپنے کے
جو ڈھنگ ہمارے ہیں

سن گندے! کر توبہ
وقت بہت کم ہے
اے بندے! کر توبہ

امین خیال کے ماہیے

اے یار نہیں ہوتا
ہر کوئی عظمت کا
مینار نہیں ہوتا

آرام نہیں ملتا
قصۂ غم کا کہیں
انجام نہیں ملتا

مرجاتا ہوں جانے سے
پھر جی اُٹھتا ہوں
ساجن ترے آنے سے

تقدیر نہیں بدلی
ڈھور ہی بدلا ہے
زنجیر نہیں بدلی

جاں جائے کہ دل جائے
چاہتا ہوں جس کو
بس وہ مجھے مل جائے

سچائی یہ دائم ہے
کہتے ہیں، دنیا
امید پہ قائم ہے

یہ زہر نہیں چکھتے
بغض کی بات کوئی
ہم دل میں نہیں رکھتے

ہیں فلک پہ دو تارے
بیٹھ کے پاس مرے
دکھ اپنے بتا سارے

ہر اک کو سجھاتا ہے
دل میں کوئی بیٹھا
گھڑیال بجاتا ہے

اجلی پرچھائیوں کا
اہلِ محبت کو
ڈر کیا رُسوائیوں کا

جب سامنے آتے ہیں
جذبے آنکھوں میں
کئی رنگ بھر جاتے ہیں

جاؤں نہ بہک پیارے
رچ بس گئی مجھ میں
ہے تیری مہک پیارے

تعبیروں جیسا ہو
خواب جو دیکھا ہے
سچ مچ میں ایسا ہو

ہے آج بھی وہ رغبت
پہلے ہی جیسی
ہے تجھ سے مری چاہت

یہ پانی کھاری ہیں
اب تو سب رشتے
احساس سے عاری ہیں

سچ میرا بیاں ہوگا
مجھ سے کئی ہوں گے
تجھ جیسا کہاں ہوگا

ملتی ہی نہیں آنکھیں
یار کے چہرے سے
ہٹتی ہی نہیں آنکھیں

رٹتا ہوا کہتے ہیں
طوطے آخر کو
طوطے ہی رہتے ہیں

ماہیا گیت

فراز حامدی (جے پور)

جب یادِ وطن آئی
یاد بہت آئے
ہمسائے، بہن، بھائی
جب یادِ وطن آئی

جب چھیڑ کے شہنائی
کوئی غزل گائی
کیوں لے مری بھر آئی
جب یادِ وطن آئی

لی درد نے انگڑائی
کر گئی تنہائی
لذت کا شناسائی
جب یادِ وطن آئی

احساس کی پہنائی
اور بھی گہرائی
یوں دل نے سزا پائی
جب یادِ وطن آئی

بے کار نظر آئی
دل کو نہیں بھائی
پردیس کی دارائی
جب یادِ وطن آئی

ماہیا نظم: رفیق شاہین (علی گڑھ)

پھر ٹوٹ گئے سپنے

کیا خوب نظارا تھا
کوئی تھا پہلو میں
اور بہتا شکارا تھا

خوشبو تھی فضاؤں میں
چھیڑے ہوئے دل کے
نغمے تھے فضاؤں میں

لہرا کے حسیں آنچل
خوشبو کے لہجے میں
کہتا تھا کہیں لے چل

ترسی ہوئی تنہائی
گلمرگ میں آخر
دو پیاسوں کو راس آئی

طوفان بنے دھارے
لو دیتے تن میں
جلتے ہوئے انگارے

آخر کو کنارے پر
پار لگی کشتی
جذبات کے دھارے پر

تھا سچ سے بڑا سپنا
جب اک بے گانہ
پل بھر میں ہوا اپنا

پھر ٹوٹ گئے سپنے
آج پرائے ہیں
کل تک جو رہے اپنے

ماہیے

ڈاکٹر محمد علی اثر

(حیدرآباد، دکن)

خالق بھی مرا تو ہے
فکر مجھے کیوں ہو
رازق بھی مرا تو ہے

شاہوں کے وہ سرور ہیں
اپنے شکم پر جو
باندھے ہوئے پتھر ہیں

آنکھیں جو مری نم ہیں
رہتے ہیں وہ دل میں
جو رحمتِ عالمؐ ہیں

امت ہے یہ فریادی
چھین لی ہے کس نے
حق گوئی و بے باکی

مایوس نہ ہو ماجھی
آنکھ جھپکتے ہی
تھم جائے گی یہ آندھی

ماہیے

ڈاکٹر فاروق شکیل

(حیدرآباد، دکن)

ہر زخم پرانا ہے
درد جو ہے دل میں
یادوں کا خزانہ ہے

چہرے پہ تبسم ہے
بات نہیں کرتا
خاموش تکلم ہے

ڈستا ہے ہرا موسم
زخم ہرے کر کے
دیتا ہے سزا موسم

زخموں کو پروتا ہے
درد کو وہ اپنے
ماہیے میں پروتا ہے

نفرت کو مٹانا ہے
پیار کی ہریالی
ہر دل میں اُگانا ہے

ماہیے

اظہار وارثی

(بہرائچ)

یہ موت سی خاموشی
رات کٹے کیسے
اے رات کی خاموشی

کچھ خواب بُنے ہم نے
اُڑ گئے پرزے تو
ٹکڑے بھی چنے ہم نے

سایہ نہ شجر میرا
دھوپ میں صحرا کی
جاری ہے سفر میرا

شکوہ نہ گلہ کوئی
بھیگ گئی آنکھیں
جب آن ملا کوئی

سائے تری پلکوں کے
جب ملے خوابوں میں
دن پھر گئے خوابوں کے

ماہیے

اکمل شاکر (پسنی)

کل رات کوئی آیا
خواب حویلی کی
تعبیر تھا وہ سایا

پھولوں کو مہکنے دو
بادِ صبا رُکنا
تتلی کو بہکنے دو

دل ایسا پرندہ ہے
یاد کی ٹہنی پر
تیرے لیے زندہ ہے

سوکھے ہوئے پھولوں کو
لوگ مسلتے ہیں
خوشبو کے اصولوں کو

گاؤں میں حویلی تھی
اور حویلی میں
اک رانی اکیلی تھی

ملنے کبھی آیا کر
رات دریچوں پر
شمعوں کو جلایا کر

ماہیے

انجم اعظمی (کلکتہ)

کہتا ہوں جسے اپنا
زخم لگاتا ہے
سینے پہ وہی گہرا

بس دھوپ میں پلتا جا
چھاؤں سے کیا لینا
تو ایک شجر ٹھہرا

بے لوث طبیعت رکھ
رنج نہیں ہوگا
اخلاص سے نسبت رکھ

حالات ہوں جیسے بھی
کفر ہے مایوسی
کر فکر بدلنے کی

تم حوصلہ مت ہارو
کام لگن سے لو
تقدیر بنا ڈالو

کیوں لطف سے ہو عاری
شعر کہو جو بھی
کچھ اس میں ہو فنکاری

ماہیے: رانا اختر

(لاہور)

پھولوں سے، کلیوں سے
اُنس نہ مٹ پائے
گاؤں کی گلیوں سے

مزدور ہیں سڑکوں پہ
افسر کیا جانیں
کیا گزرے کلرکوں پہ

پنجاب کی ریلیں ہیں
بیٹھیں بھلا کیسے
قسمت میں جیلیں ہیں

ہر فوجی بارڈر پہ
ڈیوٹی کرتا ہے
جرنیل کے آرڈر پہ

اس گاؤں کے نقشے میں
پہلی بار چلے
ہم ایک ہی رکشے میں

ماں جی کے قدموں سے
چین نصیب ہوا
دنیا کے صدموں سے

کتاب گھر

کتاب میلہ تعارف: حیدر قریشی

مطالعۂ اقبالیات (تحقیق و تالیف) **محقق و مولف: ڈاکٹر وسیم انجم**

صفحات:288 **قیمت**: 250 **روپے** **ناشر**: انجم پبلشر، کمال آباد نمبر ۳، راولپنڈی

وسیم انجم کا بنیادی کام اقبالیات سے متعلق ہے، بیچ میں جب انہوں نے مجھ پر کچھ کام کیا تو مجھے اس حوالے سے کافی شرمندگی ہوتی تھی کہ اقبال پر اتنی محنت کے ساتھ کام کرنے والا ادیب اور محقق مجھ جیسے بندے پر کام کر رہا ہے۔ شاید وسیم انجم کو اس کا احساس ہو گیا، چنانچہ پھر انہوں نے بعض ایسے ایسے لوگوں پر بھی کچھ کام کر ڈالا جس سے میری شرمندگی اقبال کے حوالے سے تو کم ہو گئی لیکن دوسرے حوالے سے زیادہ ہو گئی۔ اب وسیم انجم اپنے اصل موضوع کی طرف توجہ دینے لگے ہیں تو مجھے خوشی ہوئی ہے کہ یہی ان کا اصل میدانِ تگ و تاز ہے۔

زیرِ نظر کتاب ''مطالعۂ اقبالیات'' وسیم انجم کے گہرے مطالعہ کا ثبوت ہے۔ انہوں نے اقبال کو براہِ راست بھی سمجھنے کی کاوش کی ہے اور دوسرے محققین اور ناقدین کے توسط سے بھی اقبال کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس مطالعہ میں اقبال کے فلسفیانہ اور شاعرانہ دونوں طرح کے نظریات کو بڑی حد تک مربوط کر کے پیش کیا گیا ہے۔ ان کے تحقیقی مطالعہ کے دائرۂ کار کا اندازہ کرنے کے لئے کتاب کے آٹھ ابواب کے عناوین سے کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ا۔ مابعد الطبیعیات، ۲۔ اسلامی اور انسانی خلافت، ۳۔ اقبالؒ کی تخلیقات اور نظامِ اشتراکیت ۴۔ اقبالؒ کا خطبۂ پنجم اور ثقافتِ اسلامی کی اساس ۵۔ علامہ اقبالؒ کے مجموعۂ خطوط ۶۔ علامہ اقبالؒ اور تصورِ پاکستان ۷۔ اقبالؒ کی اردو غزلیں اور غزل نما قطعات کا اسلوب و معنی کے اعتبار سے فارسی شاعری کی تخلیقات سے مماثلت ۸۔ پیامِ مشرق ان عناوین کے کئی ذیلی عناوین الگ سے ہیں جن کے نتیجہ میں متعلقہ موضوعات کے بارے میں اقبالی فکر کافی حد تک سامنے آ جاتی ہے۔ تاہم یہ مطالعہ کسی کتاب کے خلاصہ کی طرح اقبال کے مزید مطالعہ سے بے نیاز نہیں کرتا بلکہ غور و فکر کے نئے در وا کر کے پیش کردہ موضوعات اور مباحث میں مزید مطالعہ کی طرف راغب کرتا ہے۔ وسیم انجم کی بنیادی شناخت اقبالیات کے حوالے سے روز بروز گہری ہو رہی ہے۔ میں اس میدان میں ان کی مزید کامیابیوں کے لئے دعا گو ہوں!

(کتاب کے فلیپ پر درج رائے)

پرورشِ لوح و قلم (فیض حیات اور تخلیقات) **تصنیف: لدمیلا وسیلئیوا**

صفحات: 296 **قیمت**: 395 **روپے** **ناشر**: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس۔ کراچی

ڈاکٹر لدمیلا ماسکو میں اردو کی معروف خدمتگار ہیں اور پوری اردو دنیا میں ان کا نام جانا پہچانا ہے۔ یوں تو اردو زبان کے حوالے سے ان کی خدمات بہت زیادہ ہیں لیکن ان کی ایک اہم شناخت ''فیض شناسی'' کی ہے۔ سابق سوویت یونین میں فیض احمد فیض کو عزت و توقیر حاصل تھی وہ اظہر من الشّمس ہے۔ فیض کی زندگی اور ان کی ادبی خدمات کے سلسلہ میں ان کی زیرِ نظر تصنیف بنیادی طور پر روسی زبان میں لکھی گئی اور اسی میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد اس کتاب کے چند ابواب کا اردو ترجمہ اُسامہ فاروقی نے کیا۔ اسی دوران ان کی وفات ہو گئی تو بقیہ ابواب کا ترجمہ ڈاکٹر لدمیلا نے خود کیا (خدا انہیں سلامت رکھے) اور یوں یہ کتاب اہلِ اردو کے لئے بھی دستیاب ہو گئی۔

اس کتاب میں نہایت محنت اور عرق ریزی کے ساتھ فیض کی زندگی کے حالات جمع کیے گئے ہیں۔ ان کی زندگی کے نشیب و فراز کو بڑی حد تک اس میں یکجا کر دیا گیا ہے۔ فیض کی شخصیت میں جو نرمی، محبت، صلح جوئی، امن پسندی تھی اور اس نوعیت کی دیگر تمام خوبیوں کے ساتھ وہ ایک انقلابی شاعر بھی تھے۔ ان کی انقلابی شاعری میں بھی ان کے شخصی اوصاف نے ایک دھیما پن پیدا کر دیا۔ وہ دھیما پن جس نے فیض کو باقی سارے ترقی پسند شاعروں سے منفرد و ممتاز کر دیا۔ فیض کی شاعری کا جائزہ لینے میں ڈاکٹر لدمیلا نے نہایت علمی و ادبی بصیرت کا مظاہرہ کیا ہے۔ جو ہندو پاک میں فیض کے ان مداحوں کے لیے ایک چیلنج ہے، جو فیض کے بارے میں بہت کچھ لکھنے کے باوجود ابھی تک ڈاکٹر لدمیلا جیسی بصیرت تک نہیں پہنچ سکے۔ ڈاکٹر لدمیلا کی تنقیدی بصیرت کا کمال ہے کہ انہوں نے فیض سے اپنی عقیدت کو مجروح بھی نہیں ہونے دیا اور ان کی ادبی خوبیوں کے ساتھ ان کی ادبی کمزوریوں کو بھی مدِ نظر رکھا ہے۔ فیض کی شاعری کا ارتقائی سفر جاننے کے لیے ڈاکٹر لدمیلا کے تجزیے سند کا درجہ اختیار کر گئے ہیں۔

فیض کی زندگی کے نشیب و فراز کے ساتھ ہمیں یوں تو متعدد شخصیات سے تعارف حاصل ہوتا ہے۔ لیکن دو شخصیات کا تعارف بے حد اہم ہے۔ ایک ایلس فیض جنہوں نے ایک برطانوی خاتون ہوتے ہوئے کسی بھی مشرقی خاتون سے بڑھ کر فیض سے وفا کی اور سکھ دکھ میں ہمیشہ ساتھ دیا۔ دوسری شخصیت فیض احمد فیض کے والد صاحب کی ہے۔ سلطان محمد خاں کی زندگی ایسے حیرت انگیز نشیب و فراز کی حامل ہے کہ قاری ہر قدم پر چونکتا ہے۔ جیسے یہ سچ مچ کی نہیں، کسی طلسماتی کہانی میں بیان کی گئی زندگی ہو۔ سچی بات یہ ہے کہ بے شک فیض کی اپنی زندگی جدو جہد، محنت، قربانی اور محبت سے بھری ہوئی ہے، لیکن ان کی طلسماتی شخصیت کی داستان بھی اپنے والد سلطان احمد خاں کی حیرتوں سے بھری زندگی کی داستان کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے۔

اس کتاب میں یوں تو سارے واقعات گہری تحقیق کے بعد بیان کیے گئے ہیں۔ تاہم کلکتہ یونیورسٹی میں فیض کی ملازمت کے حوالے سے مجھے مزید تحقیق کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر لدمیلا کے بیان کے مطابق

جب فیض صاحب پاکستان سے نکل کر دلی گئے تو وہاں انہیں کئی یونیورسٹیز میں پروفیسر کی جگہ پیش کی گئی، وہ کلکتہ یونیورسٹی کو جائن کرنا چاہ رہے تھے کہ اسی دوران حکومت پاکستان نے حکومت ہند کو اشارا دیا کہ ایک پاکستانی شہری کے لیے اس طرح کا اقدام مناسب نہ ہوگا۔

ہندوستان میں مغربی بنگال ہمیشہ سے کیمونسٹ پارٹی کا گڑھ رہا ہے۔میری معلومات کے مطابق فیض کی جیوتی باسو سے ملاقات ہوئی تھی۔ان کے لیے کلکتہ یونیورسٹی میں ملازمت کی فراہمی کی غرض سے اقبال چیئر کی منظوری ہو رہی تھی۔منظوری کا باضابطہ طریق کار کسی حد تک طویل تھا۔سوانہیں پاکستانی حکومت کے کسی دباؤ کے باعث انکار نہیں کیا گیا تھا۔لیکن اقبال چیئر کی منظوری کے دفتری عمل کی طوالت کے دوران فیض کو لوٹس میں ادارت کی جاب مل گئی اور وہ دلی سے ماسکو ہوتے ہوئے لبنان چلے گئے۔میرا خیال ہے اس حوالے سے مزید تھوڑی سی تحقیق کی ضرورت ہے۔ممکن ہے ڈاکٹر لدمیلا کی بات ہی درست نکلے لیکن احتیاطاً مزید تحقیق کی تھوری سی گنجائش موجود ہے۔باقی یہ حقیقت ہے کہ فیض پر یہ کتاب ایک دستاویزی حیثیت کی حامل کتاب ہے۔
کاش فیض کے پاکستانی اور انڈین مداح بھی فیض پر اسی پائے کی کوئی کتاب لکھ سکیں۔

غفلت کے برابر(غزلیں) **شاعر**: **ابرار احمد**

صفحات:206 **قیمت**:250روپے **ملنے کا پتہ**: ماورا پبلشرز۔لاہور

ابرار احمد اگرچہ شروع سے تھوڑی بہت غزلیں کہتے آ رہے ہیں تاہم ان کی بنیادی پہچان نظم نگار شاعر کی رہی ہے۔اس کے باوجود ابرار احمد ان نظم نگاروں سے ہمیشہ الگ رہے جو نظم کہنے کے ساتھ غزل کو برا بھلا کہنا ضروری سمجھتے ہیں۔ان کے اپنے بیان کے مطابق ۲۰۰۰ء کے دوران ان پر غزل باقاعدہ طاری ہوگئی،اس کیفیت کا ثمر ان کی غزلوں کے مجموعہ **غفلت کے برابر** کی صورت میں سامنے آیا ہے۔نظم کی طرح غزل میں بھی ابرار احمد نے اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ذیل کے چند اشعار سے ان کی غزل کے تیور دیکھے جا سکتے ہیں۔

ہم نے رکھا تھا جسے، اپنی کہانی میں کہیں — اب وہ تحریر ہے اوراقِ خزانی میں کہیں
یہیں کہیں پہ ہے رستہ، دوامِ وصل کا بھی — یہیں کہیں سے ہی راہِ فنا نکلتی ہے
یہ نقدِ جاں لیے آئے تھے ہم تمہارے حضور — سو تم بھی کرنے لگے ہم سے بھاؤ تاؤ میاں
کچھ بھی نہیں رہا یہاں، آپ سے کیا چھپائیے — دل ہی میں جب لہو نہیں، شور کہاں مچائیے
یہ کوئے خاک ہے یا پھر دیارِ خواب کوئی — زمین ہے کہ زماں ہے، مجھے نہیں معلوم

نظم نگاروں کے قبیلہ کی طرف سے غزل کو مطعون کرنے کی بجائے ایسی خوبصورت غزلوں کے مجموعہ کا آنا غزل کے لئے خوبصورت تحفہ ہے اور ادب کے لئے بھی نیک فال ہے۔

خوشبو کا سفر(شاعری) **شاعر**:**طاہر مجید**

صفحات:160 **قیمت**: 150 **روپے** **ناشر**:اساطیر۔۴۵۔اے مزنگ روڈ۔لاہور

طاہر مجید ایک عرصہ سے جرمنی میں مقیم ہیں۔شعر کہنے کا سلسلہ پاکستان کے زمانے سے شروع کر رکھا تھا لیکن رفتار اتنی دھیمی رہی کہ پہلا مجموعہ تیار ہونے میں ایک عمر لگ گئی۔انڈو پاک میں ''شاعر گر استادوں'' کی برکت سے جرمنی اور باقی یورپ میں ریڈی میڈ شاعروں کی برق رفتاری کا یہ عالم ہے کہ پچاس کی عمر میں شاعری شروع کرتے ہیں اور دو سال میں تین مجموعے بنے بنائے، چھپے چھپائے حاصل کر لیتے ہیں۔طاہر مجید اس لحاظ سے یورپ کے گنتی کے ان چند شاعروں میں شامل ہیں جو جیسا بھی لکھتے ہیں خود لکھتے ہیں۔**خوشبو کا سفر** میں ان کی اب تک کی زندگی کے سفر کی وہ ساری خوشبو یکجا ہوگئی ہے جو انہوں نے خوشیوں اور دکھوں سے کشید کی تھی۔
چند اشعار سے طاہر مجید کی شاعری کے مزاج اور موڈ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

پہرے کچھ اس طرح سے لگے اس کی دید پر — اس مرتبہ تو چاند بھی نکلا نہ عید پر
برباد کر دیا ہے تو چل بھول جا مجھے — چل، میرا ہی قصور تھا، تو بے قصور تھا
الجھ گئے ہیں کچھ ایسے معاملے دل کے — اداس ہو گئے ہم اور بھی تجھے مل کے

توقع کی جانی چاہئے کہ طاہر مجید اپنا دوسرا مجموعہ لانے میں پہلے مجموعہ اتنی تاخیر نہیں کریں گے اور ان کے دوسرے مجموعۂ کلام میں ان کے ممکنات زیادہ بہتر طور پر کھل کر سامنے آئیں گے۔

سمندر سوچتا ہے (شاعری اور فن و شخصیت) **شاعر**:**رئیس الدین رئیس**

صفحات:357 **قیمت**: دوسو روپے یا بیس ڈالر **ملنے کا پتہ**: ۲۵/۱۷۰۱ ادہلی گیٹ۔علی گڑھ

رئیس الدین رئیس کا تازہ مجموعہ **سمندر سوچتا ہے** بظاہر ۳۳۵ صفحات کا مجموعہ ہے، لیکن اس میں شروع کے ۲۱ صفحات کو شمار نہیں کیا گیا۔انہیں شامل کر لیا جائے تو اصلاً یہ ۳۵۶ صفحات کا مجموعہ ہے۔۲۵۷ صفحات پر شاعری درج کی گئی ہے۔اس میں ان کے پہلے دو مجموعوں اور بعد کے نئے اور تیسرے مجموعہ کا کلام شامل کیا گیا ہے۔لگ بھگ ۱۰۰ صفحات ابتداء، فہرست کے علاوہ رئیس الدین رئیس کی شاعری کے بارے میں مختلف ادیبوں اور ان کے دوستوں کی آراء شامل ہیں۔یوں یہ شعری کلیات کے ساتھ فن و شخصیت قسم کا مجموعہ بھی بن گیا ہے۔اس سب کو ملا کر رئیس الدین رئیس کے بارے میں اور ان کی شاعری کے بارے ایک واضح رائے قائم کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔نمونۂ کلام:

میں قطرہ ہوں مگر وسعت پہ میری — یہ دریا کیا، سمندر سوچتا ہے
خودی کا رمز تھا جب واشگاف میں بھی ہوا — تو اپنے آپ سے بے حد خلاف میں بھی ہوا
آنکھوں کو دن نکلتے ہی تاویل چاہئے — یعنی تمام رات کی تفصیل چاہئے

ناصر عباس نیر (لاہور)

مابعد جدیدیت، نظری مباحث

ابتدائیہ

گزشتہ دو دہائیوں سے اردو تنقید نئے مباحث پر مرتکز ہے۔ یہ نئے مباحث، گزشتہ ایک صدی کی اردو تنقید کے دیگر مباحث کی طرح مغرب سے آئے ہیں۔ اس اعتبار سے ان نئے مباحث میں، اردو تنقید کے لیے مغائرت نہیں ہونی چاہئے کہ یہ اسی مغربی تنقیدی فکر کے تسلسل کا حصّہ ہیں، جس سے اردو تنقید ۱۹ویں صدی کے ربع آخر سے منسلک چلی آرہی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اردو تنقید کا عام قاری (اور بعض خاص قارئین بھی جو کسی مختلف آئیڈیالوجیکل موقف کے علمبردار ہیں) نئے تنقیدی مباحث سے مغائرت محسوس کرتا ہے۔ اس کے کئی اسباب ہیں، اور غالباً سب سے بڑا سبب ان اصطلاحات کا اجنبی ہونا اور مقدمات اور استدلال کا مختلف اور نامانوس ہونا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ نئے تنقیدی مباحث، ہماری فہم عامہ اور شعور کی عمومی طرزوں کو ہی چیلنج کرتے ہیں۔ جن اصولوں کو ہم مسلمہ صداقت کا درجہ دے کر دنیا، تاریخ اور ادب کو سمجھتے آئے ہیں، یہ مباحث انہیں پر سوالیہ نشان لگاتے ہیں۔ ماڈرنیٹی کی تحریک کے بعد سے مگرب نئے، اجنبی فکر کے خوف سے آزاد ہو گیا ہے، اس لئے اہلِ مغرب، نئے مباحث کے نامانوس استدلال سے وحشت کھانے کی بجائے، اس کی جستجو میں رہتے اور اسے اپنی فکری و تہذیبی ترقی کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں۔ مگر ہمارے یہاں چونکہ ماڈرنیٹی اپنی حقیقی روح کے ساتھ رونما نہیں ہوئی، (کیوں نہیں ہوئی اور ماڈرنیٹی کی ادھوری اور مسخ شدہ صورت سے ہم بہ حیثیت مجموعی کن ذہنی الجھنوں اور تہذیبی مخمصوں کا شکار ہیں، یہ الگ موضوع ہے۔) اس لیے ہمارا نئے اجنبی فکر سے گھبرانا قابل فہم ہے۔ ان نئے اصولوں میں اہم ترین، زبان اور دنیا کے رشتے کا 'اصول' ہے۔ نئے مباحث کی بنیادی بصیرت یہ ہے کہ زبان باہر کی حقیقت کی شفاف ترجمانی نہیں کرتی، 'باہر کی حقیقت' کو خود اپنے اصولوں کے تحت تشکیل دیتی ہے۔ یہ بات ہمارے فہم عامہ کے یکسر خلاف ہے۔ ساختیات اور پس ساختیات کے نظریات کم یا زیادہ اسی اصول کی مختلف تعبیروں کی بنیاد پر وجود میں آئے ہیں۔ چونکہ یہ استدلال نیا اور مختلف ہے، اس لیے اس کی اصطلاحات بھی نئی اور مختلف ہیں۔

بعض لوگ ساختیات، پس ساختیات اور مابعد جدیدیت کے جملہ مباحث کو غیر متعلق اور غیر ضروری قرار دیتے ہیں۔ ان میں چونکہ کچھ وہ بزرگ ادبا بھی شامل ہیں جو سابقہ تھریکوں، جدیدیت اور ترقی پسندی سے وابستہ رہے ہیں اور ان تحریکوں کے حوالے سے انہیں صاحب الرائے ہونے کا مرتبہ بھی حاصل رہا ہے، اس لیے ان کی بات کا اعتبار کر لیا جاتا ہے۔ اکثریت عمومیت پسندی کا شکار ہوتی ہے۔ ایک شخص یا ایک اصول، ایک تناظر میں معتبر اور قابلِ عمل ہوتا ہے مگر ہم اپنی جنرلائزیشن کی عادت کے تحت اس کا اطلاق عام تناظرات پر کرنے لگتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ اعتبار دراصل اس مغائرت کو ہی بڑھاتا جاتا ہے۔ مغائرت کے بڑھنے کا نقصان مباحث کو نہیں اردو تنقید کو ہے۔ ایک بات طے ہے کہ اردو تنقید ہی نہیں، ہماری چقافتی اور فکری زندگی کا کوئی گوشہ عالمی فکر سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ عالمی فکر کے سلسلے میں ہمارا موقف کیا ہو (موقف کا ہونا لازم ہے)، یہ دوسرا سوال ہے، پہلا سوال عالمی فکر کی اس کے درست تناظر میں تفہیم ہے۔ اس تفہیم کے بعد ہی موقف تشکیل دیا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب پہلے سوال کے جواب میں یعنی مابعد جدیدیت کی تفہیم کی غرض سے مرتب کی گئی ہے۔

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں مابعد جدیدیت اور اس کے ذیلی مباحث سے متعلق مقالات کو یکجا کیا گیا ہے۔ اردو میں مابعد جدیدیت کے حوالے سے ہونے والے مباحث کی نوعیت اور نہج کیا ہے؟ مابعد جدیدیت ہماری ثقافتی صورتِ حال سے کتنی متعلق اور کتنی غیر متعلق ہے؟ مابعد جدیدیت چند نقادوں کا مسئلہ ہے یا معاصر صورتحال کی تفہیم کا معتبر ذریعہ ہے؟ مابعد جدیدیت کے تحت اردو میں لکھی گئی عملی تنقید، کسی نئی جہت کا پتا دیتی ہے یا نہیں؟ ان تمام سوالات سے متعلق مقالات، کتاب کے دوسرے حصے میں شامل ہیں۔

یہ کتاب بھی ''ساختیات۔۔ایک تعارف'' کی طرز پر مرتب کی گئی ہے۔ ابتدا میں تفصیلی مقدمہ، آگے منتخب مقالات اور آخر میں اصطلاحات کی فرہنگ اور کتابیات شامل ہے۔ مقدمے میں مابعد جدیدیت کے بنیادی نکات کو سہل انداز میں مگر اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مقدمے کو مابعد جدیدیت کی فکر کا تعارف سمجھا جائے۔ تفصیلی مطالعہ کے لیے منتخب مقالات کی طرف رجوع کیا جائے اور مزید مطالعے کے لیے کتابیات میں سے مقالات یا کتب منتخب کی جائیں۔

یہ کتاب بھی ڈاکٹر وحید قریشی کے ارشاد کی تعمیل میں مرتب کی گئی ہے اور انھی کے ادارے، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی سے اشاعت پذیر ہو رہی ہے۔

میں ان تمام حضرات کا ممنون ہوں جن کے مقالات کتاب میں شامل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کی اگر کوئی اہمیت ہے تو ان حضرات کے مقالات کی ہی بدولت ہے۔ بعض مقالات کے کچھ حصوں کو ضرورتاً حذف کیا گیا ہے۔

حیدر قریشی (جرمنی)

کئی چاند تھے سرِ آسماں

شمس الرحمٰن فاروقی کے ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' پر کوئی بات کرنے سے پہلے اس میں سے ابھرنے والی مربوط کہانی کا خلاصہ بیان کر دینا ضروری ہے۔

میاں یوسف سادہ کار اس داستان کے درمیان کا ایک اہم کردار ہیں۔ میاں یوسف سادہ کار کی بیٹی وزیر خانم اس ناول کا مرکزی کردار ہیں۔ داستان کے ایک سرے پر میاں یوسف سادہ کار کے پردادا میاں مخصوص اللہ ہیں تو دوسرے سرے پر وزیر خانم کے پڑپوتے وسیم جعفر ہیں۔ ان سب کی بکھری ہوئی کہانیوں سے یہ داستان مربوط صورت اختیار کرتی گئی ہے۔ اس مربوط صورت کے لئے بات میاں یوسف سادہ کار کے پردادا سے شروع کی جانی چاہئے۔ ان کے دادا میاں مخصوص اللہ کشن گڈھ راج کے گاؤں ہندل الولی پروا میں رہتے تھے۔ فنکارانہ خلاق ذہن کے مالک تھے۔ رنگوں کی دنیا سے مناظر و مظاہر فطرت کی تصویریں بناتے بناتے ایک بار انہوں نے ایک لڑکی کی تصویر بنا دی۔ اس تصویر کی ایک طرح سے ان کے حجرے میں نمائش ہوئی۔ زیادہ تر لوگ اسے ایک پرانے کردار بنی ٹھنی کی تصویر کہتے تھے۔ بنی ٹھنی کے بارے میں مشہور تھا کہ سترھویں صدی کے کشن گڈھ کے ایک والی کی محبوب ملکہ تھیں۔ اس کی تصویر کی نقول آج بھی کشن گڈھ میں مل جاتی ہیں۔ لیکن بعد میں بھید کھلا کہ یہ تصویر تو کشن گڈھ راج کے مہاراول گجندر پتی سنگھ کی بیٹی من موہنی کی تھی۔ بنی ٹھنی اور من موہنی کی تصویروں میں اتنی مشابہت کیوں تھی؟ یہ بھید شروع میں ہی قاری کے ساتھ ہو لیتا ہے۔

مہاراول اس بارے میں اپنی بیٹی سے پوچھتا ہے کہ اس کی شکل ایک مصور تک کیسے پہنچی؟ بیٹی کوئی جواب نہیں دیتی۔ اسے اسی گاؤں میں سزائے موت دی جاتی ہے۔ تصویر کو روند دیا جاتا ہے اور گاؤں والوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ صبح سے پہلے پہلے گاؤں خالی کر دیں۔ یوں میاں مخصوص اللہ اتر پردیش کے گاؤں سے نکل کر کشمیر میں آ جاتے ہیں۔ وہاں ایک کشمیری خاتون سے شادی کرتے ہیں۔ مختلف نشیب و فراز سے گزرتے ہیں۔ کشمیری قالین بنانے سے لے کر روحانیت کے مدارج طے کرنے تک، جب ان کی زندگی ختم ہوتی ہے تو ان کے ہاتھ میں بنی ٹھنی کی مڑی تڑی تصویر تھی۔ میاں مخصوص اللہ کے بیٹے یحییٰ بڈگامی کے ہاں دو بیٹے پیدا ہوئے۔ داؤد اور یعقوب۔

یحییٰ بڈگامی کو بنی ٹھنی کی ایک تصویر کسی کے توسط سے ملتی ہے، اس حوالے سے بھی ایک اسرار کا ہالہ سا، ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ خاص طور پر اس لئے بھی کہ لوگوں نے جو من موہنی کی تصویر کو بنی ٹھنی کی تصویر قرار دیا تھا تو اس کا مطلب ہوا کہ دونوں کی شباہت میں مماثلت تھی۔ یحییٰ بڈگامی کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں کو اس کے سامان میں سے یہ تصویر ملتی ہے تو وہ حیران و پریشان ہوتے ہیں۔ اس کے بیٹوں کی زندگی ایک اور رخ اختیار کرتی ہے۔ داؤد اور یعقوب نے ایک گاؤں کی دو مظلوم بہنوں سے شادی کر لی۔ داؤد کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی اور یعقوب کے ہاں بیٹا پیدا ہوا جس کا نام یوسف رکھا گیا۔ ۱۸۰۳ء میں انگریزی فوج نے شاہ عالم ثانی کو مراٹھوں کی ''قیدِ فرنگ'' سے نجات دلانے کا ارادہ کیا۔ داؤد اور یعقوب انگریزی فوج میں شامل ہو گئے۔ اس معرکہ میں مرہٹہ فوج غالب ہوئی اور انگریزی لشکر کو بھاری جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس معرکہ میں یوسف کا سارا خاندان ہلاک ہو گیا۔ صرف یوسف باقی بچا، جس کی عمر اس وقت دس برس کی تھی۔ ایک طوائف اکبری بائی کا پورا خیمہ بھی بچ گیا۔

دس برس کے یوسف کو اکبری بائی نے سنبھالا اور دلی میں قیام پذیر ہو گئیں۔ وہیں جب یوسف سادہ کار پندرہ برس کے ہوئے تو اکبری بائی نے اپنی تیرہ سالہ بیٹی اصغری کے ساتھ ان کا بیاہ کر دیا۔ یوسف سادہ کار نے اکبری بائی کے اڈے کو چھوڑ کر دلی کے کوچہ رائے مان میں ایک مکان لے لیا۔ اصغری نے بھی ایک پاکباز بیوی کی طرح زندگی گزاری۔ ان کے ہاں تین بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ انوری خانم عرف بڑی بیگم۔ عمدہ خانم عرف منجھلی بیگم اور وزیر خانم عرف چھوٹی بیگم۔

بڑی بیگم نماز روزہ کی پابند اور دین سے گہری رغبت رکھتی تھیں۔ ان کی شادی مولوی شیخ محمد نظیر کے ساتھ ہوئی اور کامیاب ازدواجی زندگی بسر ہوئی۔ منجھلی بیگم کی طبیعت متین تھی لیکن خرابی یہ تھی کہ اسے ننہال سے رغبت تھی۔ نانی کے پاس آنے جانے کے نتیجہ میں اس نے وہاں کے ادب آداب اور کئی تہذیبی طور طریقے سیکھ لئے تھے۔ اکبری بائی کے ہاں منجھلی بیگم کو ایک بار نواب سید یوسف علی خان بہادر نے دیکھا، اور پسند کر لیا۔ یوں منجھلی بیگم بغیر نکاح کے نواب صاحب کے ساتھ چلی گئیں۔ گو ان کی ساری زندگی بغیر نکاح کے رہی تاہم یہ رشتہ آخر دَم تک اس زمانے کی تہذیبی عزت اور محبت کے ساتھ نبھایا گیا۔

چھوٹی بیگم یعنی وزیر خانم نے شروع میں ہی پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے تھے۔ نانی کے ساتھ اسے زیادہ ہی انسیت تھی۔ وہاں اس نے منجھلی سے زیادہ تہذیب اور ادب آداب سیکھ لئے۔ کچھ موسیقی کی تعلیم لی، کچھ شعر و شاعری میں بھی دلچسپی لی۔ اسی دوران یوسف سادہ کار کی بیوی فوت ہو گئی تو بڑی بیگم نے وزیر خانم کو شادی کے لئے راضی کرنا چاہا لیکن اس کے اپنے ہی خیالات تھے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں ایسے باغیانہ خیالات جو آجکل کھل کر کہے جا سکتے ہیں۔ لیکن اُس زمانے میں تو ایسے خیالات کا اظہار کجا، ان کا سوچنا بھی مہا پاپ تھا۔ تنگ آ کر بڑی بیگم نے چھوٹی بہن کو اتنا کہا کہ ''اور نہیں تو کیا تیرے لئے کوئی نواب، کوئی شاہزادہ آئے گا؟ بیٹی اتنا غرور

نہیں کرتے ،اللہ کوغرور پسند نہیں ۔‘‘
بہن کے جواب میں وزیر خانم نے کہا:’’شاہزادہ تقدیر میں لکھا ہوگا تو آئے گا ہی ۔نہیں تو نہ سہی ۔ مجھے جو مرد چاہے گا ،اسے چکھوں گی ، پسند آئے گا تو رکھوں گی ۔نہیں تو نکال باہر کروں گی ۔‘‘

اس کے بعد وزیر خانم نے جے پور میں ایک انگریز مارسٹن بلیک کے ساتھ رہنا شروع کیا۔موجودہ مغربی معاشرہ کی طرح فرینڈز بن کر رہنے لگے ۔مارسٹن بلیک سے ان کے ہاں ایک بیٹا اور ایک بیٹی پیدا ہوئے ۔۱۹۲۹ء کے آخری مہینوں میں کسی دن مارسٹن بلیک نے وزیر خانم کو یہ خوشخبری سنائی کہ وہ نئے سال ۱۹۳۰ء کے آغاز کے ساتھ ان سے باقاعدہ نکاح کر لے گا۔لیکن اس سے پہلے ہی وہ ایک فساد میں بلوائیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔وزیر بیگم کی دنیا اندھیر ہوگئی ۔مارسٹن بلیک کی بہن اور بھائی نے ان سے ان کے دونوں بچے سنبھال لئے اور ایک ہلکا پھلکا سا معاہدہ کر کے اسے گھر سے رخصت کر دیا۔مارچ ۱۸۳۰ء کی کسی تاریخ کو وزیر خانم جے پور سے پھر دہلی واپس آ گئیں ۔تب ان کی عمر انیس سال اور چند مہینے تھی ۔

دہلی میں انہیں ریذیڈنٹ دولت کمپنی بہادر ولیم فریزر کے ہاں ایک محفل شعروسخن میں مدعو کیا گیا۔وہاں نواب شمس الدین سے بھی ان کا آمنا سامنا ہوا۔بات آگے بڑھی ۔ولیم فریزر بھی ان میں دلچسپی لے رہا تھا اور نواب شمس الدین بھی ۔وزیر بیگم کو نواب شمس الدین بھا گئے ۔اب وہ مارسٹن بلیک کی بجائے نواب شمس الدین کے ساتھ رہنے لگیں ۔نواب سے وزیر خانم کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا۔نواب مرزا نام رکھا گیا۔نواب شمس الدین اور ولیم فریزر کی رقابت ایک طرف ،اور دوسری طرف کئی نشیب و فراز سے گزرتی ہوئی نوابوں کی خاندانی رقابتوں کا سلسلہ ۔۔۔ولیم فریزر قتل ہو گئے اور ان کے قتل کی سازش کے جرم میں نواب شمس الدین کو پھانسی دے دی گئی ۔

نومبر ۱۸۴۰ء میں وزیر خانم کے والد یوسف سادہ کار کا انتقال ہو گیا۔اس کے دو سال بعد وزیر خانم کے لئے آغا مرزا مولوی تراب علی کی طرف سے شادی کی بات کی گئی اور بڑی بہن کی بات کو مانتے ہوئے وزیر خانم شادی کے لئے راضی ہو گئیں ۔شیعہ اور سنی دونوں طریق کے مطابق نکاح کیا گیا۔اس شوہر سے وزیر خانم کو ایک بیٹا ہوا شاہ محمد آغا مرزا۔جون ۱۸۴۳ء میں بچے کی پیدائش ہوئی اور نومبر ۱۸۴۳ء میں آغا مرزا تراب علی ہاتھیوں اور گھوڑوں کی خرید کے لئے سون پور (بہار) کے لئے روانہ ہوئے ۔واپسی پر بھوانی ماتا کے پیرو کار ٹھگوں کے ہاتھوں اپنے ساتھیوں سمیت مار دیئے گئے ۔بڑی مشکلوں کے بعد ان کی لاشوں کو تلاش کیا جا سکا۔وزیر خانم ایک بار پھر اکیلی ہو گئیں ۔

وزیر خانم کے مالی حالات خراب ہونے لگے ۔پہلے خدمتگاروں کو نوکری سے فارغ کیا پھر گھر کا سامان بیچنے کی نوبت آ گئی ۔اسی دوران ایک انوکھا واقعہ ہو گیا۔شہنشاہِ ہند بہادر شاہ ظفر کے ایک بیٹے میرزا فتح الملک بہادر (مرزا فخرو) کو وزیر خانم سے شادی کا خیال آیا۔انہوں نے مناسب طریق سے پہلے بادشاہ سلامت سے اس کی اجازت لی ،پھر وزیر خانم کی بڑی بہن کے گھر میں وزیر خانم کے رشتے کا پیغام بھیجا۔تب بڑی بہن کو اپنی پرانی

بات یاد آئی کہ کوئی شہزادہ تجھے بیاہنے آئے گا۔۲۴ جنوری ۱۸۴۵ء کو یہ شادی شرعی طریق کے مطابق ہو گئی ۔وزیر خانم اپنے ویران اور اجڑے ہوئے گھر سے شاہی محل میں پہنچ گئیں ۔ان کے ساتھ ان کی دیرینہ خادمہ حبیب النساء بھی تھیں اور ان کا نواب شمس الدین سے ہونے والا بیٹا نواب مرزا بھی تھا۔بہادر شاہ ظفر نے اپنی اس بہو کو شوکت محل کا خطاب دیا۔یہاں وزیر خانم نے اپنی زندگی کے گیارہ سال شاہانہ طریق سے بسر کئے ۔شہزادہ فخرو سے وزیر خانم شوکت محل کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا۔اس کا نام خورشید مرزا رکھا گیا۔۱۸۵۶ء میں اچانک شہزادہ فخرو مرزا معمولی علالت کے بعد انتقال کر گئے ۔بہادر شاہ ظفر اپنے بڑھاپے کی انتہا پر تھے ،ان کی ملکہ زینت محل جوان کی سر چڑھی ملکہ تھیں ان کے بڑھاپے کی وجہ سے محل کے بیشتر فیصلے خود صادر کرنے لگیں ۔شہزادہ فخرو کے چہلم کے تیسرے روز زینت محل نے وزیر خانم شوکت محل کو اپنے پاس بلایا اور حکم سنایا کہ وہ محل کو فوری طور پر چھوڑ دے ۔وزیر خانم کے پاس امکان موجود تھا کہ وہ بادشاہ سلامت سے بات کرتیں ،لیکن انہوں نے زینت محل کے حکم کو ہی تقدیر کا لکھا جان کر قبول کر لیا۔

اگلے روز مغرب کے بعد قلعہ کے لاہوری دروازے سے وزیر خانم کا قافلہ باہر نکلا۔ان کے بیٹے نواب مرزا اور خورشید مرزا ان کے ساتھ تھے ۔لیکن پالکی میں بیٹھی ہوئی وزیر خانم کو اب آگے کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔

یہیں پر ناول اپنے اختتام کو پہنچتا ہے ۔۱۷۱۹ء میں جنجھے میاں مخصوص اللہ کی خاموش محبت کی ادھوری داستان سے شروع ہونے والا یہ ناول انہیں کی نسل میں سے ان کے پوتے یعقوب بڑگامی کی پوتی وزیر خانم کی بلتی ہوئی محبتوں کی آخری ادھوری داستان پر ۱۸۵۶ء کے عہد تک مکمل ہوتا ہے ۔

ناول کے بارے میں شمس الرحمٰن فاروقی نے وضاحت کی ہے کہ جس زمانے کے کردار ناول میں آئے ہیں انہوں نے اسی زمانے کے مستعمل الفاظ کو ہی وہاں استعمال کیا ہے ۔یہ بلاشبہ بڑا مشکل کام تھا جسے انہوں نے نہایت کامیابی کے ساتھ انجام دیا ہے ۔اس ڈکشن کی وجہ سے جو لوگ اس ناول کو جدید آبِ حیات کہہ رہے ہیں میں بھی ان کی تائید کرتا ہوں ۔لیکن ناول کی یہ خوبی اس کی کمزوری یا خامی بھی بن گئی ہے ۔مسئلہ یہ ہے کہ عام قارئین کو تو چھوڑ دیں خود اردو کے شاعروں اور ادیبوں میں کتنے لوگ ہوں گے جو اس زبان کو ناول کی مطلوبہ روانی کے ساتھ پڑھ سکیں؟ بہت کم ۔۔۔بہت ہی کم ۔لیکن یہ خامی اور خوبی ایک دوسری سطح پر اہلِ ادب کے لئے چیلنج بھی بنتی ہے کہ وہ اس ناول کے ذریعے اردو کی بنیاد تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کریں ۔اس چیلنج کو ادب کے سنجیدہ قارئین اور ادیب لوگ کس حد تک قبول کر پاتے ہیں اس کا انحصار ان قارئین پر ہے جو ناول کو پورے طور پر پڑھ کر اپنی رائے کا اظہار کریں گے ۔

زبان کی مشکلات سے ہٹ کر مجھے اس ناول میں شمس الرحمٰن فاروقی کی جزئیات نگاری نے حیران کیا ہے ۔انیسویں صدی کے ہندوستانی معاشرے کی انہوں نے جس عمدگی کے ساتھ تصویر کشی کی ہے اور ہر سطح پر

جزئیات کو جس طرح مہارت کے ساتھ بیان کیا ہے اسے ان کے فن کا کمال کہا جا سکتا ہے۔مختلف کرداروں کے امتیازی اوصاف اجاگر کرنے سے لے کر ان کے ملبوسات اور تہذیبی رکھ رکھاؤ تک اس مہارت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں کہ قاری بار بار حیران ہوتا ہے۔ناول میں آنے والے مختلف مقامات کی منظر کشی، وہاں کے تہذیبی و ثقافتی مظاہر، انفرادی واجتماعی سطح پر افراد وطبقات کی عادات واطوار، وفاداریوں اور غداریوں کی الگ الگ کہانیوں سمیت ہر معاملہ میں شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے بیانیہ میں ایسی باریک بینی سے کام لیا ہے کہ داد دیئے بغیر چارہ نہیں رہتا۔

ناول کی ایک اور خوبی جس نے مجھے شروع میں چونکایا وہ کسی تصویر کی پراسراریت کا احساس دلانا تھا۔بنی ٹھنی کی تصویر کے بارے میں پرانی روایت کے بیان سے لے کر من موہنی کی تصویر تک۔۔۔دونوں تصویروں میں مشابہت کا اشارہ دے کر پھر یحییٰ بڈگامی کو اسی تصویر کا تحفہ ملنے تک۔۔۔ڈاکٹر وسیم جعفری کو ملنے والی کتاب کے اندر ٹی وی سکرین جیسی روشن تصویروں کے قصہ سے لے کر برٹش میوزیم سے حاصل کی گئی اپنی پردادی وزیر خانم کی تصویر تک جو فضا بن رہی تھی اس سے ایک تجسس پیدا ہو رہا تھا۔لگتا تھا کہ ان ساری تصاویر میں ہم آہنگی کا کوئی ماورائی سا تاثر بیانیہ میں یکجا ہوگا، بلکہ مجھے تو ایسا لگا کہ ''عذرا کی واپسی'' سے کچھ کچھ ملتا جلتا قصہ بھی سامنے آ سکتا ہے۔''عذرا کی واپسی'' جیسا نہ سہی لیکن ''کچھ نہ کچھ ماورائی سا'' ضرور سامنے آئے گا، بھید کھلے گا۔لیکن افسوس کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا اور مذکورہ تصاویر کی پراسراریت محض وقتی ہوتی ہے۔کہیں نہ تو کوئی بھید اجاگر ہوتا ہے نہ ان میں کسی نوعیت کی کوئی ہم آہنگی ظاہر ہوتی ہے۔ایسا لگتا ہے جیسے ناول کے بیچ میں قاری کو قابو میں رکھنے کے لئے تصویر کے ٹوٹے چلائے جا رہے ہیں۔اگر ان تصاویر کے گرد کسی پراسراریت کا ہالہ بنائے بغیر انہیں ویسے بیان کر دیا جاتا تو کسی اعتراض کی گنجائش نہ رہتی۔

انیسویں صدی کے ہندوستان کی زوال پذیر تہذیب کی روداد کے ساتھ انگریزی عملداری کے طور طریقوں اور خود ہندوستان کے مختلف مقتدر طبقوں کی باہمی رنجشوں اور سازشوں کی کہانیاں اس ناول میں بڑے اچھے طریقے سے بیان ہوتی گئی ہیں۔ایسا کہیں بھی اوپری طور پر بیان ہوتا محسوس نہیں ہوتا بلکہ سارے احوال ناول کے اندر تخلیقی طور پر جذب ہو کر سامنے آتے چلے جاتے ہیں۔ان احوال سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انگریزی کی عملداری کے سامنے ہندوستان کے مقتدر طبقات کی کیا حیثیت رہ گئی تھی اور وہ طبقات بھی کس طرح باہمی رنجشوں، کدورتوں اور سازشوں میں گھرے ہوئے تھے۔اگر اس زمانے کی سیاسی صورتحال کو آج کے عہد تک لایا جائے تو ایسے لگتا ہے ہم آج بھی عالمی سطح پر اسی حالت میں ہیں جیسی انیسویں صدی میں ہندوستان کے مقتدر طبقات کی تھی۔بس اس حالت کے عالمی تناظر کے باعث اس میں زیادہ وسعت اور پھیلاؤ آ گیا ہے۔ وگرنہ دونوں طرف ایک جیسی ہی صورتحال ہے۔

جنسی عمل کی منظر کشی میں شمس الرحمٰن فاروقی کی جزئیات نگاری کی مہارت اپنے کمال پر دکھائی دیتی ہے۔اگر انہوں نے ناول کو آج کے عہد کی اردو میں لکھا ہوتا تو صرف جنسی جزئیات نگاری کے باعث ناول ہاتھوں ہاتھ لے لیا جاتا۔''آدابِ وصل ووصال میں ان کی مہارتیں'' جیسے الفاظ صرف نشاندہی کے لئے لکھ رہا ہوں وگرنہ جہاں جہاں شمس الرحمٰن فاروقی نے ان مہارتوں کی منظر کشی کی ہے جنسی جزئیات نگاری کا کمال دکھا دیا ہے۔

ناول کا ایک اہم حصہ شعروادب سے مملو ہے۔فارسی شاعری کے ضمن میں مجھے اعتراف ہے کہ میں اسے سمجھ نہیں سکتا اور یوں ناول کے کئی اہم حصوں سے اس سطح پر لطف اندوز نہیں ہو سکا۔یہ میری ذاتی علمی کمی ہے۔تاہم بعض فارسی اشعار فارسیت کے باوجود مجھے آسانی سے سمجھ میں آئے۔خاص طور پر برہنہ ردیف والی غزل۔

گلے دارم ز رنگ و بو برہنہ سہی سروے چو آب جو برہنہ

پوری کی پوری غزل ناول کے واقعاتی پس منظر کے باعث آسانی سے سمجھ میں آ گئی۔مزہ بھی دے گئی۔تاہم فارسی اشعار سے ہٹ کر اردو شعروادب کے حوالے سے بھی شمس الرحمٰن فاروقی نے اُس دور کی ایک تصویر کھینچ دی ہے۔یہاں یہ بتانا مناسب ہوگا کہ وزیر خانم اور نواب شمس الدین کے صاحبزادہ نواب مرزا اردو شاعری کا ایک روشن نام نواب مرزا داغ دہلوی ہیں۔اس حوالے سے اس ناول کو داغ دہلوی کی زندگی کی داستان کے حوالے سے بھی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔اس زمانہ کی ادبی فضا، علمی مباحث وغیرہ کی ایک واضح جھلک ناول میں دیکھی جا سکتی ہے۔ان مباحث میں کہیں کہیں خود شمس الرحمٰن فاروقی کے اندر کا نقاد اور محقق ناول پر غالب آ جاتا ہے جہاں وہ باقاعدہ علمی لحاظ سے تحقیقی وتنقیدی گفتگو کرنے لگ جاتے ہیں۔مثلاً

''حق یہ ہے کہ عرفی کے مضمون کی نزاکت، اور اس سے بڑھ کر معنی کے امکانات کی وسعت ایسی ہے کہ داغ کا شعر بظاہر پھیکا اور گھریلو معلوم ہوتا ہے۔لیکن یہی گھریلو پن تو اس معاملے کی جان ہے، اور ''انداز'' کے لفظ کا گھریلو پن ''شیوہ'' کے مقابلے میں اپنے حسن کو منوا رہا ہے۔پھر اس سے بڑھ کر ''جی جانتا ہے'' اس قدر بے تکلف اور محاوراتی زور رکھتا ہے کہ زبان ہندی کے اعجاز اور ہندی کے شاعر کے اعجاز پر ایمان لانا پڑتا ہے۔سہل ممتنع کا جو طرز بعد میں داغ کی شاعری کا امتیازی نشان بنا، درحقیقت شروع ہی سے ان کے یہاں موجود تھا جس کی وجہ غالباً فاطمہ کا عشق ہی تھا کہ جوانی کے برگ وبار لاتے ہوئے قادرالکلامی کے مزے اُٹھاتے ہوئے اس نوبادۂ حدیقۂ شعروسخن کا جی چاہتا تھا کہ غیر پیچیدہ اور غیر استعاراتی، غیر رسمی زبان میں اپنے معشوق سے اپنے دل کا حال کہے۔''

تاہم ایسے تحقیقی وتنقیدی ٹکڑے ناول سے کچھ الگ ہو کر بھی زیادہ الگ نہیں لگتے۔

اس ناول کے ذریعے ایسے تاریخی تہذیبی حوالے بھی ملتے ہیں جو عرب، ہندی اور ہند مسلم تاریخ وتہذیب میں عام نظروں سے اوجھل ہیں۔مثلاً لفظ قحبہ کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ عربی میں اصلاً کھانسی کے لئے بولا جاتا ہے۔لیکن فاحشہ عورتوں کے لئے اس لفظ کا استعمال ایک خاص پس منظر رکھتا ہے۔ قدیم عرب میں فاحشہ

عورتیں اپنے گاہکوں کو متوجہ کرنے کے لئے ہلکے سے کھانستی تھیں،اس لئے کھانسنے (قحبہ) کی نسبت سے وہ بھی کھانسنے والیاں کے طور پر قحبائیں کہلائے جانے لگیں۔

مرزا تراب علی جو سون پور کے سفر سے واپسی پر بہار کے ٹھگوں کے ہاتھوں مارے گئے،ان کے احوال میں دیوی بھوانی کی متھ اور اس کے پجاریوں کی ٹھگ بازیوں کی تفصیل بجائے خود ایک الگ اور دلچسپ داستان ہے۔لیکن جو مرزا تراب علی کی موت کی وجہ سے پوری طرح ناول میں جذب ہو جاتی ہے۔

شادی بیاہ کے معاملہ میں اِس وقت ہندوستانی اور پاکستانی معاشرہ جس طرح کا ذہن رکھتا ہے،اس کے مقابلہ میں ڈیڑھ،دوسو سال پہلے کے معاشرہ میں نسبتاً کافی لچک دکھائی دیتی ہے۔ایک تو اُس معاشرہ میں طوائف کے بالا خانے ایک خاص نوعیت کے تہذیبی اور فنکارانہ سطح کے تربیتی ادارہ ہونے کا احساس دلاتے ہیں،اسی کا نتیجہ ہے کہ معزز مولوی بھی بالا خانوں سے آئی ہوئی خواتین کے ساتھ بخوشی شادی کر لیتے تھے۔دوسرے اُس زمانہ میں بغیر نکاح کے مرد عورت کے ایک ساتھ رہنے کی روایت اعلیٰ معاشرتی سطح پر موجود تھی۔ممکن ہے اسے لونڈی کے مذہبی تصور کی روشنی میں روا رکھا جاتا ہو۔مجھے اس ناول کو پڑھنے کے بعد احساس ہو رہا ہے کہ اسلام میں شاید اس حوالے سے خاصی گنجائش موجود ہے لیکن مخالفین کے اعتراضات کے جواب دیتے دیتے ہم معاشرتی سطح پر خود اس سہولت سے گریز کرتے کرتے دور ہوتے گئے۔اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اُس زمانے میں معاشرتی سطح پر بغیر نکاح کے بیویوں کی طرح رکھنا اور معاشرے میں قابلِ اعتراض نہ دیکھا جانا عجیب سا لگتا ہے۔

ایک اور تہذیبی اشارہ بہت مزے کا ملتا ہے۔اس زمانہ میں شرفاء کی بیگمات اور بہو بیٹیاں نالکی یا پالکی پر سوار ہو کر گھر سے نکلتی تھیں۔صرف برقعہ پہن کر گھر سے نکلنا ایک طرح سے بے پردگی میں شمار ہوتا تھا۔اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ زمانے کی اپنی رفتار ہوتی ہے۔اس رفتار کے سامنے مزاحمت کرنے والے بڑی جوشیلی مخالفت تو کرتے ہیں لیکن پھر اس رفتار کے سامنے جذباتی برانگیختگی کے باوجود کوئی بند نہیں باندھ پاتے۔نالکی اور پالکی کے زمانے کے بعد شٹل کاک برقعہ شریفانہ پردہ سمجھا جانے لگا،تاہم اب خواتین پالکی اور نالکی سے اتر آئیں۔چند برسوں کے بعد شٹل کاک برقعہ بھی صرف افغان علاقوں میں رہ گیا،بات لیڈی ہملٹن کپڑے کے ریشمی برقعہ سے چادر اوڑھنے تک پہنچی اور اب چادر سے دوپٹہ تک آ گئی ہے۔دوپٹہ بھی غائب ہوتا جا رہا ہے،ممکن ہے اگلے بیس تیس برس کے بعد ہمارے بزرگ اپنے بچوں کو اس طرح نصیحت کیا کریں کہ بٹی دیکھو ہم جتنے روشن خیال ہو جائیں آخر کو مشرقی رویات کے امین ہیں۔میں یہ نہیں کہتا کہ اسکرٹ مت پہنو لیکن اس کی طوالت اتنی ضرور ہونی چاہئے کہ تمہارے گھٹنے ڈھک جائیں۔آخر شرم وحیا بھی کوئی چیز ہے۔تو جناب!شمس الرحمٰن فاروقی کے اس ناول کے ایسے حوالوں سے مجھے خود یہ ادراک ہوا کہ تبدیلی ناگزیر عمل ہوتا ہے اور اس کی مخالفت کرنے والے خود وقت کے ساتھ پسپا بھی ہوتے جاتے ہیں اور ہر پسپائی کے بعد کچھ پیچھے ہٹ کر اپنی نصیحت بھی جاری رکھتے ہیں۔روکنے والے بھی

اپنی جگہ حق بجانب ہیں اور وقت کی رفتار بھی اپنی جگہ ایک زندہ حقیقت ہے جس کے لئے کسی لمبی چوڑی دلیل اور ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔صرف نالکی اور پالکی کے ڈیڑھ سو سال پہلے کے دور سے لے کر آج کے دوپٹے اترتے ہوئے دور تک ہر تبدیلی اپنا ثبوت آپ ہے۔انیسویں صدی کی ہندوستانی زندگی کا حال پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ بیل گاڑیوں اور پالکیوں کے اس زمانہ میں رفتار کتنی آہستہ تھی۔اسی لئے زندگی کے معاملات میں بھی ہر طرح کے انتشار وافتراق کے باوجود ایک دھیرج ملتا تھا۔انیسویں صدی کے پیدل اور بیل گاڑی کی رفتار کے زمانے سے جب ہم آج کے اپنے زمانے کو دیکھتے ہیں تو جیٹ طیاروں،خلائی راکٹوں،اور کمپیوٹر کی برق رفتاریوں کے باعث اپنے عہد کی رفتار کا احساس بھی کرتے ہیں اور یہ بھی معلوم پڑتا ہے کہ اس تیز رفتاری نے ہم سے وہ دھیرج چھین لیا ہے جو گزرے ہوئے آہستہ روز مانوں میں نسبتاً بہت زیادہ میسر تھا۔

بہادر شاہ ظفر کی بیگم ملکہ زینت محل نے وزیر خانم کو محل بدری کا حکم دیتے ہوئے جو چند زہریلے جملے کہے تھے:''چھوٹی بیگم،ہمیں تمہاری بیوگی پر بہت افسوس ہے۔۔۔۔لیکن تم تو ایسے سانحوں کی عادی ہو چکی ہو۔اسے بھی سہ جاؤ گی۔انو اسی کا کلیجہ مضبوط ہوتا ہے،لوگ کہے ہیں''

دیکھا جائے تو ہمارے معاشرے میں وزیر خانم ایسے کرداروں کے لئے ایسا کچھ ہی کہا جاتا ہے لیکن شمس الرحمٰن فاروقی نے وزیر خانم کے کردار کو اس خوبی کے ساتھ ابھارا ہے کہ ان کی تمام تر کوتاہیوں اور آزاد خیالیوں کے باوجود نہ صرف ان سے ہمدردی ہوتی ہے بلکہ ایک طرح سے ان کے لئے محبت کے جذبات بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ناول کا سب سے زوردار حصہ وہ ہے جب وزیر خانم کی بڑی بہن کے پاس شہزادہ مرزا فخرو کی جانب سے وزیر خانم کے لئے رشتہ کا پیغام آتا ہے،اور وہ اپنی بہن کو اس سے آگاہ کرتی ہے۔ایک لٹی پٹی اور اجڑی ہوئی زندگی میں شاہی گھرانے سے پیغام آنا اور اس پر دونوں بہنوں کی کیفیات۔۔۔میرا خیال ہے کہ یہاں شمس الرحمٰن فاروقی نے کرداروں کی نفسیات پر اپنی گرفت کا اعجاز دکھایا ہے۔یہ حصہ بڑا ہی پُر تاثیر ہے۔اور پھر ناول کا اختتامیہ بھی اتنا ہی پر تاثیر ہوتے ہوئے دلوں میں اداسی اور دکھ کی عجیب سی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔

کئی چاند تھے سرِ آسماں شمس الرحمٰن فاروقی کے تخلیقی اظہار کی عمدہ ترین صورت ہے۔یہ ناول ایک اہم ناول ہے اور شمس الرحمٰن فاروقی کی تخلیقی شناخت کا سب سے بڑا حوالہ ہے۔اس میں ان کے اندر کے نقاد اور محقق نے ان کا پورا ساتھ دیا ہے۔اس نوعیت کے ناول لکھنے کے سلسلے میں جس تحقیقی محنت کی ضرورت ہوتی ہے،وہ ناول کی ہر سطر میں دکھائی دیتی ہے۔تحقیق وتنقید کے شعبوں میں شمس الرحمٰن فاروقی کی زندگی بھر کی ریاضت اس ناول میں پوری طرح ان کے کام آئی ہے۔اور اس طور سے کام آئی ہے کہ ان کے تخلیقی اظہار کا داخلی حصہ بن گئی ہے۔

آپ کے خطوط، ای میلز، تاثرات

جدید ادب جرمنی کا شمارہ:۹ موصول ہوا، جس کے لئے شکر گزار ہوں۔اس کو پڑھ کرتازگی کا احساس ہوا۔میری طرف سے دلی مبارک۔آپ نے اچھا شمارہ مرتب وشائع کیا ہے۔**ڈاکٹر جمیل جالبی**۔کراچی

''سرور ادبی اکادمی'' جرمنی کے زیر اہتمام شائع ہونے والے علمی اور ادبی مجلّے ''جدید ادب'' کا شمارہ نمبر ۹ (جولائی تا دسمبر ۲۰۰۷ء) موصول ہوا۔کرم گستری اور یاد فرمائی کے لیے شکر گزار ہوں۔بے حد احسان مند ہوں کہ آپ یاد رکھتے ہیں اور رسالہ بھیجنے کی زحمت کرتے ہیں۔انشاء اللہ جلد ہی اسے پڑھا جائے گا اور یقیناً استفادے کی صورتیں نکلیں گی۔**افتخار عارف**۔اسلام آباد

آپ کی تحریریں دیکھیں، آپ قلم کی بھرپور زندگی گزار رہے ہیں۔اور آپ کا قلم کسی ایک جہت تک محدود نہیں ہے۔آپ کا وسیع علم اور آپ کی آزاد اور عصبیت سے خالی فکر زندہ اور روشن جذبوں سے ہم آہنگ ہو کر آپ کی ہر تحریر کو منفرد اور معتبر بناتی ہے۔آپ نے جوگندر پال صاحب کے ناول ''پار پرے'' پر جو تبصرہ لکھا ہے وہ تخلیقی تنقید کہلایا جاسکتا ہے۔تبصرہ کیا ہے، اچھی خاصی ناول کی سمری ہے۔اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ قاری کو ناول پڑھنے پر راغب کرتا ہے، ناول کے مرکزی خیال کو اٹھاتا ہے، اسی طرح پال کے افسانوں کے مجموعے پر آپ کا مضمون حاصلِ مطالعہ قسم کا ہے۔اس دور میں جب بغیر کتاب کو پڑھے اس پر لکھا اور بولا جاتا ہے، آپ کیوں پڑھ کر مضمون یا تبصرہ لکھتے ہیں؟ ''رہے نام اللہ کا'' ایک دلچسپ، شگفتہ اور علمی تحریر ہے۔ایسوسی ایشن آف آئیڈیاز کی تیکنیک سے یہ ایک کامیاب تخلیق میں بدل گئی ہے۔عجیب بات ہے کہ اگر میں لکھتا تو میں بھی یہی کچھ اور ایسا ہی لکھتا۔۔۔یورپ (جرمنی) میں آپ اردو ادب کے لئے اتنا کچھ کر رہے ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ آپ کو بابائے اردو یورپ کہہ کر مخاطب کروں۔ہمارا ماحول بھی عجیب ہے ایک جانب کوئی کرتا بہت کم ہے اور دکھاتا بہت ہے، اس کے نام کے ڈنکے بجتے ہیں۔دوسری جانب کوئی کام میں لگا رہتا ہے۔نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ، تو اس کے لئے بڑے بڑے بولنے والے گونگے اور لکھنے والے لاقلم ہو جاتے ہیں، میڈیا کو بھی چپ لگ جاتی ہے۔ایسا کیوں ہے؟ ہم سب اس صورتحال کے لئے جوابدہ اور ذمے دار بھی ہیں۔بہر حال میں ایک عرصے سے آپ کی کاوشوں سے آگاہ ہوں اور انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اللہ تعالیٰ آپ کو جوش، جذبے اور خلوص کو زندہ وتابندہ رکھے۔ **عبداللہ جاوید** (مسی ساگا، کینڈا)

Jdeed Adab is in my hand - and , indeed, it is superb. I have today mailed to you, by air mail, a book SATYAPAL ANAND KI TEES NAZMEN edited by Balraj Komal and published from Delhi. The packet also includes a detailed letter in Urdu and a couple of other things for publication. Please ack. by email when you receive it. Again, THE MAGAZINE IS SUPERB. Yours: **Satyapal Anand**

میں یہ سمجھا کہ عمران شاہد گوپی چند نارنگ کا ایک نیا پہلو جو ترجمہ نگاری کو روشن کرتا ہے اسے روشنی میں لا رہے ہیں۔لیکن جب مضمون پڑھا تو میرے ہوش اڑ گئے۔شاید میرے ذہن میں بھی یہی بات تھی لیکن اتنے ''بڑے نام'' کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں تھے یا پھر میرے پاس ہمت نہیں تھی۔عمران شاہد مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے گوپی چند نارنگ کے تعلق سے نہایت اہم نکتہ اردو دنیا کے سامنے رکھ دیا۔اگر گوپی چند نارنگ پر ریسرچ بھی ہوتی تو کوئی بھی ریسرچ اسکالر اس نکتہ کو واضح نہیں کر پاتا۔**دانش غنی**۔(بنگلور، انڈیا)

حیدر قریشی اور نذر خلیق کی ادارت میں جدید ادب جرمنی کا نیا شمارہ شائع ہو گیا ہے۔پرچے کی ترسیل شروع کر دی گئی ہے اور انٹرنیٹ پر بھی اسے آن لائن کر دیا گیا ہے۔اس شمارہ میں حمد ونعت، دعا کے تحت کچھ نئے تجربے کئے گئے ہیں۔مضامین کے سیکشن میں ڈاکٹر صوفیہ یوسف، ناصر عباس نیر، ڈاکٹر شہناز نبی، ڈاکٹر خلیل توق اُر، عبدالرب استاد، عمران شاہد بھنڈر اور ڈاکٹر آصف قادری کے مضاین شامل ہیں۔عمران شاہد بھنڈر کا مضمون پوسٹ ماڈرن ازم کے بارے میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے کام کا پوسٹ مارٹم کرتا ہے۔اس میں متعدد اقتباسات کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے کہ ڈاکٹر نارنگ نے کوئی حوالہ دیئے بغیر مغربی مصنفین کی کتابوں سے سرقے کئے ہیں۔

اس بار پروفیسر ڈاکٹر حمید سہروردی کے لئے ایک گوشہ سجایا گیا ہے۔غزلیات کے حصہ میں صبا اکبر آبادی، مظفر حنفی، اکبر حمیدی، تاجدار عادل، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر شہناز نبی، حسن عباس رضا، قاضی اعجاز محور، عادل منصوری، رضیہ فصیح احمد، عظیم انصاری، سہیل احمد صدیقی، صادق باجوہ، معید رشیدی، بلند اقبال، عذرا پروین، ناظم خلیلی، پرویز مظفر، حیدر قریشی اور دیگر کی غزلیں شامل ہیں۔افسانوں کے سیکشن میں شہناز نبی، طاہر نقوی، حامد سراج، جان عالم، خورشید اقبال (ترجمہ)، اور حیدر قریشی کے افسانے شامل ہیں۔نظموں کے حصہ میں ستیہ پال آنند، ڈاکٹر انور سدید، شہناز نبی، فرحت نواز، پروین شیر، عذرا پروین، جان عالم۔اقبال نوید، ناظم خلیلی اور اکمل شاکر کی منظومات شامل ہیں۔خصوصی مطالعہ کے تحت چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان کی ایک تحریر ''میری والدہ'' نایاب تحفہ ہے۔ان کے علاوہ صبا اکبر آبادی، ڈاکٹر جمیل جالبی، احمد ہمیش، اکبر حمیدی، انجلا ہمیش اور حیدر قریشی کی تحریریں اپنی اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہیں۔ماہیوں کے حصہ میں امین خیال، نذیر فتح پوری، سعید رحمانی، ساجد حمید، اقبال آصف، اوم پرکاش آزاد بھاولپوری، فاروق شکیل، نسرین نقاش اور اکمل شاکر کے ماہیے شامل ہیں۔کتاب گھر میں اس بار ڈاکٹر خلیل توق اُر، سہیل احمد صدیقی، جاوید رحمانی، عاشور کاظمی، پروین شیر اور رئیس

الدین رئیس کی کتابوں پر تبصرے دیئے گئے ہیں جبکہ طاہر نقوی کے مجموعہ پر نذر خلیق نے مضمون لکھا ہے۔

قارئین کے خطوط کے حصہ میں ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، سعید شباب، پروفیسر ظہور الدین، ناظم خلیلی، انقلاب بمبئی، منشا یاد، ڈاکٹر کرسٹینا، فاروق خالد، نصرت ظہیر، صفدر علی خاں، مقصود الٰہی شیخ، سلطان جمیل نسیم، محمد یونس خاں، سہیل احمد صدیقی، ڈاکٹر غضنفر اقبال، ستیہ پال آنند، سعید رحمانی، کاوش پرتاپگڈھی، معید رشیدی، ڈاکٹر انور سدید، نذیر فتح پوری کے تاثرات شامل ہیں۔ اس بار جدید ادب ۲۰۰ صفحات کی بجائے ۲۱۶ صفحات پر مشتمل ہے، توقع کی جانی چاہئے کہ اگلا شمارہ ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ہوگا۔ **سعید شباب** (خانپور)

(یہ خبر urdu_writers@yahoogroups.com سے مورخہ ۹/جون ۲۰۰۷ء کو ریلیز کی گئی)

جدید ادب شمارہ: ۹ ملا، یہ میرے لیے جدید اردو ادب کا ایسا آئینہ ہے جس میں جدید ادبی صورت حال کے خد و خال دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ ایسا ادبی جریدہ ہے جو اردو کی ادبی صحافت میں بڑی حیثیت اور انفرادیت رکھتا ہے۔ اس شمارہ کے مندرجات بڑے دلچسپ اور اہم ہیں۔ آپ کا اداریہ حسبِ سابق بڑی اچھی رائے کا حامل ہے۔ مضامین کے باب میں ناصر عباس نیر کا ''اقبال اور جدیدیت'' بڑے غور سے پڑھا اور اس سے مستفید ہوا۔

عمران شاہد بھنڈر صاحب کا ''گوپی چند نارنگ مترجم یا مصنف؟'' کو جب پڑھا تو مجھے یاد آیا کئی سال پہلے جب میں اردو کی ایسی کتاب کی تلاش میں تھا جو عربی زبان میں ترجمے کی مستحق ہو، اور مجھے گوپی چند نارنگ کی کتاب ''ساختیات، پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات'' یونیورسٹی کی لائبریری میں ملی۔ کتاب کا نام پڑھ کر مجھے اس لیے مسرت ہوئی کہ یہ مشرقی اور مغربی شعریات کا تقابلی مطالعہ ہوگا۔ لیکن پڑھ پڑھ کر افسوس ہوتا رہا کہ یہ کتاب اوریجنلٹی سے بالکل خالی ہے۔ ہمارے ایک فاضل استاد نے بھی بتایا کہ اس کتاب کا اکثر حصہ مغربی مفکرین کی نقالی ہے۔ یہاں عمران شاہد نے استادِ محترم کی بات کی تصدیق بڑی وضاحت اور مدلل طریقے سے کی ہے۔ اصل میں یہ پاک و ہند کا المیہ ہی نہیں بلکہ تیسری دنیا کے بیشتر ممالک کا یہی المیہ ہے۔ تاہم عمران شاہد صاحب جیسے دیانت دار محققین کی کوششوں سے اب ادبی بددیانتی کی نقاب کشائی ممکن ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر طوق اُر کا مضمون ''ترکی میں اردو کیوں سیکھتے ہیں؟'' ہمارے یہاں کے سوال کی یاد دلاتا ہے کہ ''مصر میں اردو کیوں سیکھتے ہیں؟'' ہم ایسی زبان کو کیوں پڑھتے ہیں جو اپنے ملک میں اجنبی ہوتی جا رہی ہے۔ جس کے بولنے والے خود اس کو ایک سیکنڈ کلاس زبان سمجھتے ہیں۔ اور جس کی حکومت خود اس زبان سے متصادم ہے۔

ھانی السعید المصری (المنصورہ، مصر)

آپ کا فرستادہ تحفہ 'جدید ادب' شمارہ نمبر ۹ ملا، بہت بہت شکریہ۔ زیرِ نظر شمارہ بھی ہر بار کی طرح معیاری ہے۔ مضامین میں کئی مقالے بڑے اچھے ہیں، مگر ان سب میں عمران شاہد بھنڈر صاحب کا مضمون ''گوپی چند نارنگ مترجم یا مصنف؟'' حاصلِ مطالعہ رہا۔ اسے بغور پڑھا، بار بار پڑھا۔ ہمارے یہاں لوگ ذاتی منفعت کو

ذہن میں رکھتے ہوئے یا جاہ و منصب سے مرعوب ہو کر حق بات کہنے سے احتراز کرتے ہیں۔ عمران شاہد بھنڈر صاحب نے نارنگ صاحب پر جو مدلل الزامات عاید کئے ہیں، ان میں خاصا وزن ہے۔ وہ لائق مبارکباد ہیں کہ بڑی بے باکی کے ساتھ حقایق پر سے پردہ اُٹھایا ہے۔ میں انہیں اس حق گوئی و بے باکی پر سلام پیش کرتا ہوں۔

کاوش پرتاپ گڈھی ۔(دہلی)

I have read the contents of Jadeed adab-9 and enjoyed it .critical essays are literary pieces.Nasir Abbas Nayyar is very active these days writing on different subjects. No subject is far away from him.**Where as imran Shahid Bhinder has opened a new chapter about Dr Gopi chand.This angle of his writings is being discussed now a days**. Prof Hameed suharwardi has been a good short story writer. Gosha about him reflects some light on his works.

طاہر نقوی (دبئی)

جدید ادب کے بارے میں جیسا سنا تھا، اس سے کہیں ہزار گنا معیاری پایا۔ حصہ مضامین میں ویسے تو تمام مضامین وقیع ہیں لیکن عمران شاہد بھنڈر کا مضمون ''گوپی چند نارنگ، مترجم یا مصنف'' اپنے انکشافات کے اعتبار سے چونکانے والا ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ گوپی چند نارنگ کی طرف سے کیا جواب آتا ہے۔ عبدالرب استاد کا مضمون ''پریم چند اور خطبۂ صدارت'' پریم چند پر منعقدہ نیشنل سیمینار میں سنا تھا لیکن توجہ نہیں دے سکا تھا۔ اب اطمینان سے مطالعہ کیا، موصوف نے بہت محنت سے مضمون لکھا ہے۔ گوشۂ حمید سہروردی بہت سلیقے سے ترتیب دیا گیا ہے۔ یہ گوشہ محترم حمید سہروردی کے فن کی تفہیم میں بہت مددگار ثابت ہوگا۔

ڈاکٹر مقبول احمد مقبول (اودگیر، ضلع لاتور)

جدید ادب دیکھنے کا موقعہ ملا، شعری و نثری نگارشات کا بڑا حصہ لائقِ توجہ اور قابلِ مطالعہ ہے۔ مبارکباد۔ جدید ادب جب پاکستان سے نکلتا تھا اس وقت میری کچھ چیزیں اس میں چھپی تھیں، اس دیرینہ تعلق کو پھر سے استوار کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

شہپر رسول (نئی دہلی)

اس شمارے میں جوگندر پال صاحب کے افسانچے بہت خوب ہیں مگر ''کہانی'' کا جواب نہیں' سلطان جمیل نسیم صاحب کا ''گورکن'' بھی بہت اچھا لگا' اس موضوع پر ان کے افسانے بہت پر اثر ہوتے ہیں شاید اس لئے کہ وہ یہ سب اپنے شہر میں بہت قریب سے دیکھ چکے ہیں۔ میرا جی کی نظم' حیدر قریشی کے ماہیے' خاور اعجاز کی نظم کہانی پر اور سہیل صدیقی کی ہائیکو اچھی لگی' ویسے ''کہانی'' کے موضوع پر شاید کچھ زیادہ لکھا جانے لگا ہے' کیا پتہ اس کی وجہ موضوعات کی عدم دستیابی ہو۔ آپ کا ''رہے نام اللہ کا'' خوب ہے' خدا اور خلا کے حوالے سے بڑی عجیب اور

دلچسپ باتیں کی ہیں آپ نے اور فکر انگیز یقیناً ہیں' باقی باتوں کے علاوہ مجھے جس میں زیادہ لطف آیا وہ ہے پہلے نام اور خاندانی نام کا مسئلہ کیونکہ میں خود اسی مسئلے میں الجھا ہوا ہوں۔آپ کی محبتوں کا مقروض ہوں کہ ہر دفعہ کاہلی اور کوتاہی سے صرف نظر کر لیتے ہیں، دعاؤں کا طالب رہتا ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔ **فیصل عظیم** (کینڈا)

سابقہ روایت کے مطابق یہ شمارہ نمبر ۹ بھی اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا ہے، اور واقعی اسم با مسمیٰ ہے۔زیر نظر شمارہ میں تمام مضامین خاصے کی حیثیت رکھتے ہیں تو گوشۂ ڈاکٹر حمید سہروردی بہت مکمل اور جامع ہے، غزلیں، نظمیں، ماہیے، افسانے، خصوصی مطالعہ سب ہی اعلیٰ و معیاری ہیں۔مبارکباد!

رئیس الدین رئیس۔علی گڑھ

بڑی بات ہے کہ جو خواب میں نے دیکھا تھا وہ آپ نے پورا کر دیا۔ایک مدت کے بعد محترم قیصر تمکین صاحب کے پاس جدید ادب کے سرِ ورق پر آپ کا نام دیکھا۔انہوں نے یہ جریدہ مجھے مطالعہ کے لیے دیا۔کتنی خوشی ہوئی، کیا بتاؤں کہ آپ سے رابطے کا پتہ ملا اور یہ بھی کہ آپ کام کر رہے ہیں اور بڑا کام کر رہے ہیں۔

سلطانہ مہر۔برمنگھم

جیسا کہ سابقہ تمام شماروں میں ہمہ جہت اور ہمہ پہلو مضامین شامل رہے ہیں، اسی طرح اس شمارہ میں بھی روایت قائم رہی ہے۔ڈاکٹر شہناز نبی کا مضمون ''مغربی بنگال میں اردو صحافت'' بنگال کے دیرینہ آشیانہ میں اردو کی بھولی بسری صحیفہ نگاری کا مکمل جائزہ لیا گیا ہے۔ڈاکٹر صوفیہ یوسف کا مضمون ''نسائی ادب اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'' دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ڈاکٹر خلیل طوق اُر کا مضمون ''ترکی میں اردو کیوں سیکھتے ہیں؟'' برصغیر اور ترکی کے قدیم تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی تعلقات کے ایک مختصر مگر معنی خیز تمہیدی تحریر کی حیثیت رکھتا ہے۔اس قبیل کا ایک مضمون راقم الحروف نے بھی انگریزی میں لکھا ہے، اسے حسبِ ذیل ویب سائٹ پر دیکھا جا سکتا ہے۔

www.saag.org/papers18/paper1737.html **سید مزمل الدین**۔حیدر آباد، انڈیا

جدید ادب شمارہ جولائی تا دسمبر ۲۰۰۷ء موصول ہوا۔یہ شمارہ سابقہ شماروں کی طرح اردو کے معاصر عالمی ادب کا بھرپور استعارہ ہے۔آپ کا تخلیقی اظہاریہ دوج کا چاند ہو رہا ہے۔**افتخار امام صدیقی**۔بمبئی

ڈاکٹر حمید سہروردی پر گوشہ ان کی شخصیت اور فن کو سمجھنے میں مدو معاون ثابت ہوتا ہے۔اس گوشے کو تعمیر کرنے والے سبھی قلم کاروں نے موصوف کے فنی کمالات کو بڑے فنکارانہ انداز میں اجاگر کیا ہے۔صاحبِ گوشہ کے منتخب افسانوں نے گوشے پر مینا کاری جیسا کام انجام دیا ہے۔باقی مضامین بھی معلوماتی اور دلچسپ ہیں۔۔شہناز

نبی، طاہر نقوی، حیدر قریشی اور محمد حامد سراج کے افسانے دیرپا تاثر چھوڑتے ہیں۔خورشید اقبال کا ترجمہ بھی زبان و بیان کی شگفتگی، تسلسل اور اپنے رواں دواں انداز کے سبب دل کو چھو لیتا ہے۔ **رفیق شاہین**۔علی گڑھ

نیا کالم☆ پڑھ لیا اور آجکل آفس میں زیر بحث بھی ہے۔یہاں کے دوست آپ کے کالم کے منتظر رہتے ہیں۔میرے دوست اس بات پر بھی بہت حیران ہوتے ہیں کہ آپ ملک سے اتنی دور رہتے ہوئے بھی اس طرح ملک سے جڑے ہوئے ہیں کہ یہاں کے حالات اور ان کے پس منظر سے واقف ہیں۔احباب کے حوالے سے بتا رہا ہوں کہ کراچی کے صحافتی حلقوں میں کافی شوق سے پڑھا جاتا ہے۔کافی لوگ اس بات سے متفق ہیں کہ ڈاکٹر شاہد مسعود نے بعض موضوعات آپ کے کالموں سے لئے ہیں۔کیونکہ میں نے آپ کی اور ڈاکٹر صاحب کی کتاب کئی لوگوں کو پڑھائی تھی، اُس وقت جن لوگوں نے پوری طرح اتفاق نہیں کیا تھا، اب کالم پڑھ کر متفق ہیں۔

جدید ادب میں میں سب سے پہلے آپ کی یادیں پڑھتا ہوں۔مجھے ویسے بھی سوانح اور آپ بیتی بہت پسند ہیں۔آپ کی تحریر میں تصوف کا رنگ بہت واضح جھلکتا ہے۔جرمنی کی شہریت ملنے کا واقعہ انسانی ذہن سے ماورا اور اوپر والے کے بے پایاں کرم کی روشن مثال ہے۔پرانے گاؤں کا حوالہ بھی دلچسپ اور میرے مزاج کے مطابق لگا۔جدید ادب نے مجھے ماہیا کی صنف سے روشناس کرایا ہے، اس سے پہلے میں زیادہ آشنا نہیں تھا اور اس نے دل جیت لیا۔اس بار نذیر فتح پوری اور اکمل شاکر کے ماہیے زیادہ دلپذیر تھے۔نذر خلیق نے سورۃ البقرہ کی ۶۲ ویں آیت کا عمدہ منظوم ترجمہ کیا ہے، جس سے صرف امت کی بخشش کے مروجہ تصور کی بہتر وضاحت ہوتی ہے۔ڈاکٹر صوفیہ یوسف نے نسائی ادب کے حوالے سے کئی فراموش کردہ شاعرات اور مصنفین کا تعارف کرا دیا۔ناصر عباس نیر نے اقبال اور جدیدیت میں دریا کو کوزے میں بند کرنے کی اچھی کوشش کی ہے۔ویسٹ بنگال میں صحافت پر ڈاکٹر شہناز نبی کا مضمون میرے لئے ذاتی دلچسپی کا حامل تھا۔گوپی چند نارنگ کے بارے میں عمران شاہد بھنڈر کا مضمون اہلِ ادب کے لئے چشم کشا اور لمحۂ فکریہ ہے۔صبا اکبر آبادی اور اکبر حمیدی کی غزلیں بہت اچھی ہیں۔طاہر نقوی میرے پسندیدہ افسانہ نگار ہیں۔''چوکیدار'' دوسروں کی خاطر لٹنے والوں کا اثر انگیز ماجرا ہے۔محمد حامد سراج نے بہت کم وقت میں مقام بنایا ہے۔ڈاکٹر شہناز نبی مقالہ، افسانہ، غزل، نظم، گویا ہر جگہ چھائی ہوئی ہیں۔اور حق ادا کر دیا ہے۔آپ نے اپنی یادوں میں حیدر قریشی کے حوالے سے میرا ذکر کیا ہے۔اُس ناول کے بارے میں میری سید قاسم محمود سے بات ہوئی تھی۔انہوں نے بتایا کہ ''ستاروں کا سجدہ'' کا مسودہ کافی عرصہ اُن کے پاس پڑا رہا تھا، پھر جب انہوں نے شاہکار پاکٹ بکس کا سلسلہ شروع کیا تو اُس میں یہ کتاب بھی چھاپ دی۔اس کے مصنف حیدر قریشی لاہور کے مضافات میں رہتے تھے اور اکثر قاسم صاحب کے پاس آتے تھے لیکن کتاب کی اشاعت کے کچھ ہی عرصے بعد اُن کا انتقال ہو گیا۔ **نعیم الرحمن**۔کراچی (اے آر وائی چینل)

☆ میرے کالم ''اِدھر اُدھر سے'' کا ذکر ہے جو اردو دوست ڈاٹ کام پر شائع ہوتا ہے۔یہاں ۲۰ جولائی ۲۰۰۷ء کے کالم کا ذکر ہے جو لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے آپریشن کے حوالے سے تھا۔

گذشتہ نصف صدی کے دوران جب روزگار کی تلاش میں برصغیر کے نوجوانوں کو دنیا کے دوسرے ممالک میں جا کر قسمت آزمائی کرنی پڑی تو اُن کے ساتھ متعدد اہلِ ذوق بھی نقل مکانی کر گئے۔ ان لوگوں نے اپنی ذوق کی پرورش کے لیے اردو کی نئی بستیاں قائم کیں اور اب یہ کہنا مناسب ہے کہ اردو صرف ہندوستان اور پاکستان کی عوام کی زبان نہیں رہی بلکہ ان پاکستانی نژاد اور ہندوستانی نژاد لوگوں کی زبان بھی ہے جو امریکہ' برطانیہ' کینیڈا' جرمنی 'سعودی عرب' ایران اور جاپان کے علاوہ خلیجی ریاستوں میں آباد ہیں۔ اور نہ صرف ادب تخلیق کر رہے ہیں' بلکہ ان نئی بستیوں سے اردو ادب کے اعلیٰ پائے کے رسائل بھی شائع ہوتے ہیں۔ ان رسائل میں۔۔۔''جدید ادب'' (جرمنی) کو بہت شہرت حاصل ہے۔

رسالہ ''جدید ادب'' کے مدیر اردو کے معروف شاعر اور ''ماہیا'' کو اردو زبان میں تحریک بنانے والے حیدر قریشی بنیادی طور پر پاکستان کے شہری ہیں۔ ''جدید ادب'' انہوں نے ''خانپور'' سے جاری کیا تھا۔ اب انہوں نے جرمنی کی شہریت اختیار کر لی ہے۔ لیکن اردو اور پاکستان کے ساتھ رابطہ مستقل طور پر قائم رکھا ہوا ہے۔ ان کا رسالہ ''جدید ادب'' بھی اب جرمنی سے شائع ہوتا ہے اور پوری اردو دنیا کی نمائندگی کرتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ''جدید ادب'' بیک وقت کتابی صورت میں بھی چھپتا ہے اور انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہوتا ہے۔ ان کی ویب سائیٹ کا ایڈریس ہے www.jadeedadab.com۔ اس کے سابقہ آٹھ شمارے اس ویب سائیٹ پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ''جدید ادب'' کے مدیر ثانی ڈاکٹر نذر خلیق ہیں جو خانپور میں مقیم ہیں۔ مجلسِ مشاورت میں دہلی سے ممتاز افسانہ نگار جوگندر پال' لاہور سے معروف نقاد ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا' بہاول پور سے ڈاکٹر شفیق احمد اور دہلی سے جناب شاہد ماہلی شامل ہیں۔ گویا ہندو پاک میں ''جدید ادب'' کو اردو کے اہم ادیبوں اور دانشوروں کا تعاون حاصل ہے۔ اس کا ہر پرچہ ایسا مواد لے کر شائع ہوتا ہے جس سے اردو دنیا کے ادیبوں میں حرکت و حرارت پیدا ہوتی ہے اور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حیدر قریشی صاحب کا یہ رسالہ (جدید ادب) پوری دنیا میں اردو کی پاسبانی میں پیش پیش ہے۔

''جدید ادب'' کا خاص شمارہ نہم جولائی تا دسمبر 2007ء کی اشاعت پر مشتمل ہے۔ مدیر حیدر قریشی نے ایک مرتبہ پھر مغربی ممالک میں اردو ادب کے فروغ کو موضوع بنایا ہے اور یہ حقیقت تسلیم کی ہے کہ مغربی ممالک میں تخلیقی سطح پر کوئی ایسا کارنامہ سامنے نہیں آیا اور نہ کوئی بڑا ''بریک تھرو'' دیکھنے میں آیا ہے کہ جس سے کہا جا سکے کہ اردو کے ادبی سرمائے میں کوئی غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ جناب حیدر قریشی کے تجربے سے اختلاف اس لیے ممکن نہیں کہ ان کا یہ ''ارشاد'' ان کے ذاتی مشاہدے کا نتیجہ ہے۔ لیکن دوسری طرف اردو کی قدیم بستیوں یعنی دہلی 'لکھنؤ' حیدر آباد' لاہور' کراچی' پشاور' اسلام آباد میں لکھے جانے والے ادب پر نظر ڈالی جائے تو اکیسویں صدی کے گذشتہ سات برسوں اور اس سے ملحق بیسویں صدی کے آخری عشرے میں بھی کوئی ''بریک تھرو'' نظر نہیں آتا۔ اس تمام عرصے میں کوئی بڑی ادبی تحریک پیدا نہیں ہوئی' بعض افراد کی ذاتی کوششوں سے انشائیہ، ماہیا اور ہائیکو کو تحریک بنانے کی کوشش کی گئی۔ جس کا نتیجہ ان اصناف کی مقبولیت کی صورت میں سامنے آیا' لیکن یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑے گی کہ ان شعری اصناف کو غزل جیسی مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی۔ افسانہ' ناول' سفر نامہ' خودنوشت' سوانح عمری کی

اصناف میں خاطر خواہ اضافے ہوئے لیکن تخلیقات کا معیار اوسط درجے کا تھا۔ چنانچہ ''میڈیکارٹی'' کے اس دور میں غنیمت ہے کہ اردو کی آواز قدیم اور جدید بستیوں سے اُٹھ رہی ہے اور تخلیق کاروں کی نمائندگی کے لیے اردو کے خوبصورت پرچے بھی چھپ رہے ہیں۔ بدقسمتی سے احمد ندیم قاسمی کی وفات کے ساتھ ہی فنون بند ہو گیا ہے اور عہد ساز رسالہ ''اوراق'' ڈاکٹر وزیر آغا کی ''ضعیفی'' کی نذر ہو گیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مخزن، قرطاس، سمبل، ہم عصر، ارتقاء، آئیندہ، روشنائی، مژگاں، مباحثہ، جدید ادب اور نئی کتاب جیسے رسائل بھی جاری ہو گئے ہیں جو ادب کے قافلے کو جاری و ساری رکھے ہوئے ہیں۔ ان میں ایسی تخلیقات بھی دیکھی جا سکتی ہیں جن میں تجربے کی جدت اور مصنفین کی اختراعی قوت موجود ہے۔ تاہم ایک بدعت بھی پیدا ہو گئی ہے جس کی مذمت ضروری ہے اور وہ ہے مختلف رسائل میں خود قیمت ادا کر کے اپنے نام اور کام کے گوشے چھپوانا۔۔۔۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان گوشوں میں جو تعریفی مضامین چھپتے ہیں وہ بھاری قیمت ادا کر کے لکھوائے جاتے ہیں اور ان کے سامنے ممدوح ہلکا محسوس ہوتا ہے۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ اب بعض نامی گرامی نقاد ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے بھی اجرت لے کر طلبہ کو لکھ کر عنایت کر دیتے ہیں۔ ایم فل اور پی ایچ ڈی کی مقالہ نگاری تو ادب کا ریاض ہے جو ریاضت کار کو ادب کا مستقل اسیر بنا لیتا ہے' لیکن اب لکھا لکھایا مقالہ ڈگری کے حصول کا وسیلہ بن جاتا ہے تو ادب کی ترقی کیسے ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ گذشتہ دس سال کے دوران پی ایچ ڈی کرنے والوں سے ادب کا فطری ذوق رکھنے والا کوئی ادیب سامنے نہیں آیا۔ اور افسوس یہ بھی ہے کہ بعض بڑے بڑے ادیبوں نے اپنے ضمیر کو داغدار کیا اور چند ٹکوں کے لیے 'اردو کشی' کے اقدام سے گریز نہ کیا۔ حیدر قریشی صاحب نے ''جدید ادب'' میں ''گھوسٹ رائیٹرز'' (Ghost Writers) کا تذکرہ بڑی جرأت مندی سے کیا تھا۔ لیکن پردہ نشینوں کے نام ظاہر نہیں کیے تھے۔ میں اُن سے تقاضا کرتا ہوں کہ ''جدید ادب'' کا ایک حصہ اس قسم کی ''بدعملی'' کو بے نقاب کرنے کے لیے وقف کیا جائے۔ ☆

''جدید ادب'' کا ادیبوں کے گوشے چھاپنے کا سلسلہ اس کی کشادہ نظری کا مظہر ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ''خصوصی گوشے'' کے لیے ادیب کا انتخاب حیدر قریشی خود کرتے ہیں اور ان کے لیے اپنے طور پر مضامین بھی خود لکھواتے ہیں۔ گذشتہ شمارے میں پاکستان کے ایک درویش طبع اور غنی مزاج ادیب رشید امجد صاحب پر گوشہ پیش کیا گیا جس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ اب بھارت کے ممتاز افسانہ نگار پروفیسر حمید سہروردی پر گوشہ پیش کیا گیا ہے جو جنوبی ہند کے ایک دور افتادہ مقام گلبرگہ میں مقیم ہیں اور ادب کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں۔ اس گوشے میں ڈاکٹر غضنفر اقبال نے ان کے پورے ادبی کام کا ''چہرہ نما'' پیش کیا ہے۔ ان کے فن پر امجد علی فیض، سلیم شہزاد' پروفیسر بیگ احساس' سید احمد قادری اور سید سجاد اختر نے مقالات پیش کیے ہیں۔ حیدر قریشی صاحب نے مجھے ٹیلی فون پر بتایا کہ آئیندہ شماروں میں اردو کے معروف شاعر' انشائیہ نگار اور خاکہ نویس اکبر حمیدی پر اور سرگودھا کے ممتاز دانشور غلام جیلانی اصغر پر گوشے ترتیب دیئے جا رہے ہیں۔

تنقیدی مضامین کا حصہ اس مرتبہ متنوع اور فکر انگیز ہے۔ ناصر عباس نیّر کا مقالہ ''اقبال اور جدیدیت'' ان کے وسیع مطالعے کا قیمتی ثمر ہے۔ ڈاکٹر شہناز نبی صاحبہ نے مغربی بنگال میں اردو صحافت کا جائزہ

پیش کیا ترکی میں اردو کی تعلیم وتدریس پر ایک معلومات افزا مقالہ ڈاکٹر خلیل طوق آر نے پیش کیا ہے۔ڈاکٹر آصف قادری کا مقالہ ''کبیر۔۔۔اردو کا پہلا ترقی پسند شاعر'' بھی دلچسپی سے پڑھا جانے والا مقالہ ہے۔لیکن سب سے زیادہ ہنگامہ عمران شاہد بھنڈر کا مقالہ ''گوپی چند نارنگ مترجم یا مصنف؟'' پیدا کرے گا۔اس کی گونج پوری ادبی دنیا میں سنی جائے گی اور میری اطلاع کے مطابق تو منفی ردعمل شروع بھی ہو چکا ہے۔بعض لوگ اظہار اثر صاحب کے ''ادب ساز'' والے مقالے کو ردعمل کا ہی نتیجہ قرار دے رہے ہیں جس میں دو پاکستانی ادیبوں کی کردارکشی کی گئی ہے۔اب منصور کے پردے میں بولنے والے حقیقی ادب کی تلاش جاری ہے۔اس مقالے کی زد میں حیدر قریشی ویسے ہی حالات سے دوچار ہو سکتے ہیں جن کا سامنا وہ کچھ عرصہ پہلے کر چکے ہیں۔

افسانے کے حصے میں طاہر نقوی کا ''چوکیدار'' شہناز نبی کا ''میں کہاں ہوں'' محمد حامد سراج کا ''تسبیح کے دانے'' اور حیدر قریشی کا ''اپنے وقت سے تھوڑا پہلے'' بڑی دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔حیدر قریشی صاحب کا ذکر آیا ہے تو میں آپ کو ان کا مضمون ''روح اور جسم'' پڑھنے کی دعوت دیتا ہوں جس میں بہت سی کھٹی میٹھی باتوں کو بازیافت کیا گیا ہے۔بعض مقدس چہروں سے نقاب اتارنے کی کاوش بھی کی گئی ہے۔شاعری کے حصے کے بارے میں صرف اتنا کافی ہے کہ یہ دامان باغبان و کفِ گل فروش کا منظر پیش کرتا ہے۔لیکن ادیبوں کی بے تکلف محفل تو خطوط کے حصے میں جمی ہے۔اور اس میں ڈاکٹر ظہور احمد اعوان' سعید شباب' منشایاد' نصرت ظہیر' مقصود الٰہی' شیخ سلطان جمیل' سہیل احمد صدیقی' ستیہ پال آنند اور ڈاکٹر کرسٹینا کے علاوہ متعدد ادیبوں نے اپنے اپنے مخصوص انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔مجموعی طور پر ''جدید ادب'' غور سے پڑھنے اور حوالے کے طور پر استعمال کرنے کے لیے محفوظ رکھنے کی چیز ہے۔پاکستان میں ملنے کا پتہ ڈاکٹر نذر خلیق' صدر شعبہ اردو' پوسٹ گریجوایٹ گورنمنٹ کالج خان پور۔آپ ایک خط لکھ کر پرچہ منگوا سکتے ہیں۔ **ڈاکٹر انور سدید** (لاہور) (مطبوعہ **ندائے ملت** لاہور)

☆ڈاکٹر صاحب! جدید ادب کے شمارہ ۸ میں آپ ہی کے تاثرات کے جواب میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ میں بہت سارے پردہ نشینوں کے نام ظاہر کر چکا ہوں۔انہیں دہرانے اور مزید نام ظاہر کرنے کے لیے بھی تیار ہوں، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ پاکستان اور انڈیا سے ایک ایک اور ادبی رسالہ بھی میرا ساتھ دے اور میرے وہ مضامین بیک وقت پاکستان، انڈیا اور جرمنی سے شائع ہو سکیں۔آپ پاکستان سے کسی ایک حق گو رسالے کے مدیر کو اس کے لیے راضی کریں میں اسی وقت، اسی لمحہ سے اس نیک کام کا آغاز کرنے کو تیار ہوں۔(ح۔ق)

(بنام نذر خلیق) 'ندائے ملت' میں 'جدید ادب' کے تازہ شمارہ پر جناب انور سدید کا تبصرہ پڑھا۔اس کے ادبی حوالے سے معتبر ہونے کے لیے جناب حیدر قریشی کا نام ہی کافی تھا کہ انور سدید صاحب کے تبصرہ نے اشتیاق کو فزوں تر کر دیا۔میں ممنون ہوں گا اگر آپ مذکورہ شمارہ کی ایک کاپی مجھے ارسال فرما سکیں اور آئندہ بھی یہ کرم جاری رکھیں۔ **ابصار عبدالعلی** (لاہور)

پاکستان میں مابعد جدیدیت کے حوالے سے ناصر عباس نیر کا اپنا کام ہے۔جو کسی حد تک اس صورت حال کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ان کے مضمون اقبال اور جدیدیت میں مجھے کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔جس کی مجھے توقع تھی۔۔انہوں نے اپنے مضمون کو اس پر ختم کیا ہے کہ اقبال کا نکتہ نظر ایک خاص مفہوم میں ایک جدید اور ترقی پسندانہ تھا۔اقبال کے بارے میں دانشور عام طور پر تقسیم رہے ہیں۔بہت سے لوگ عقل دشمنی کی وجہ سے اقبال کو ترقی پسند نہیں مانتے۔لیکن ناصر عباس نیر نے اپنے حوالے سے اسے ایسا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔لیکن میرے خیال میں یہ ایک ایسی کوشش ہے۔جو اپنے زاویۂ نگاہ سے معروف ترقی پسند شاعر سردار جعفری بھی کرتے رہے ہیں۔ترقی پسندی کے بنیادی عناصر کیا ہیں۔اس کے بارے میں ابھی تک مجھے متفقہ اور فیصلہ کن نقطہ نظر نہیں ملا۔کیا انجمن ترقی پسند مصنفین کا نکتہ نظر جو مارکسی نکتہ نظر کے قریب تھا۔ترقی پسندانہ نکتہ نظر کا مکمل نمایندہ تھا۔یا پھر ڈاکٹر آصف قادری کا نکتہ نظر جو کبیر کو ایک ترقی پسند شاعر قرار دیتے ہیں۔اور یوں تو بہت سے صوفیا بھی ترقی پسند شاعر قرار پاتے ہیں۔جو اپنی خانقاہوں میں بیٹھ کر انسان دوستی، رواداری اور مساوات کی تعلیم دیتے تھے۔ان صوفیاء اور یوگیوں کا یہ نکتہ نظر اپنے مخصوص سماجی حالات کی پیداوار تھا۔جو انجمن ترقی پسند مصنفین تک آتے آتے نئی شکل میں ڈھل گیا۔ہمیں بہت ہی واضح انداز میں ترقی پسند عناصر کی نشاندہی کرنی ہوگی۔یا پھر ہر دور کو اپنی اپنی ترقی پسند کے حوالے سے دیکھنا ہوگا۔کبیر کو اب تک میں ہندی کا شاعر سمجھتا آیا تھا۔نیاز فتحپوری نے نگار کے ہندی شاعری نمبر میں بھی اسے ہندی کا شاعر تسلیم کیا تھا۔ڈاکٹر صاحب کا یہ مضمون پڑھتے ہوئے بھی میرے ذہن میں یہ سوال بار بار ابھرتا رہا ہے۔یہاں میں علامہ اقبال کے بارے میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اسے ترقی پسند ثابت کرنا ضروری ہے۔کیا موجودہ اسلامی بنیاد پرستی کی بنیادیں ان کی دین نہیں ہیں۔

گوپی چند نارنگ، مترجم یا مصنف؟ ایک اہم مضمون لگا ہے۔گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب کے حوالے سے پاکستان کے اردو دان طبقے میں خاصی شہرت حاصل کی ہے۔بلکہ اپنا رعب جمایا ہے۔وہ اپنی بات بیان کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔پچھلے دنوں ان کا ایک لیکچر بہاوءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے اردو ڈیپارٹمنٹ میں ہوا۔جس میں میں بھی شریک تھا۔انہوں نے اپنے اوپر ہونے والے بعض سوالات کا مضحکہ اڑایا۔ان کا رویہ افسر شاہانہ لگتا تھا۔جس کا بعد میں ذکر روزنامہ خبریں ملتان کے انٹرویو کرنے والے ایک رکن صابر چشتی نے بھی کیا۔مجھ ایسا شخص جو انگریزی ادب اور فلسفہ سے واجبی سی واقفیت رکھتا ہے۔اور اردو کتب میں مغربی افکار پڑھ کر متاثر ہو جاتا ہے۔لیکن جب کسی وجہ سے اصل کتب سے براہ راست واسطہ پڑ جاتا ہے تو عام طور پر یہی صورت حال سامنے آتی ہے۔جو عمران شاہد بھنڈر کا مضمون پڑھ کے ہوئی ہے۔اگر عمران شاہد بھنڈر کی تحریر میں تلخی اور جارحیت، جو مجھے کہیں کہیں دکھائی دیتی ہے کو نظر انداز کر دیا جائے تو پھر گوپی چند نارنگ کے بارے میں میری پہلی شاندار رائے متاثر ہوتی ہے۔یہ بات مجھے درست لگتی ہے کہ گوپی چند نارنگ اپنی کتاب میں مغربی فلسفیوں کا محاکمہ اور موازنہ

بہت کم کرتے ہیں۔ بلکہ یہ صرف ان کے خیالات کو بیان کر دینے پر اکتفا کر لیتے ہیں، ممکن ہے ان میں محاکمہ اور موازنہ کرنے کی صلاحیت موجود نہ ہو، جس کے لئے خود ایک بڑا فلسفی اور ماہر لسانیات ہونا ضروری ہے۔

گوشہ مخصوص کرنے کی جو روایت آپ کے ہاں ہے وہ اچھی ہے۔اس کے بارے میں پروفیسر حمید سہروردی کا گوشہ قابل تعریف ہے۔ ان سے ایک مصاحبہ ان کے خیلات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ان کا افسانہ کربلا بہت دور ہے، اچھا ہے اور سمجھ میں آتا ہے جب کہ 'ادھر ادھر' مجھے پوری طرح پلے نہیں پڑا۔ پروفیسر بیگ احساس کا تجزیہ بھی پوری طرح مجھ پر واضح نہیں کر سکا کہ وہ اس افسانے میں کیا کہنے چاہتے ہیں۔۔افسانوں میں افریقی کہانی اڑان اچھی لگی۔کالونیل ازم کے دور کے مغربی تعصّبات جو کالوں کے بارے میں ذہن میں تھے وہ شاید ابھی تک پورے طور پر ختم نہیں ہوئے تھے کیونکہ مجھے یہ افسانہ پڑھ کر حیرت ہوئی کہ ایک کالا (اگر اس کا مصنف کالا ہے تو) فنی اور فکری حوالے سے اچھا افسانہ لکھ سکتا ہے اس افسانے میں ماں کے احساسات اور جذبات مجھے گورکی کے ناول ماں کی یاد دلاتے رہے ہیں۔

آپ کا افسانہ اپنے وقت سے تھوڑا پہلے، جیسا کہ آپ نے اپنے مضمون جسم اور روح، میں کہا ہے آپ کی یاداشتوں کا پرتو لئے ہوئے ہے۔لیکن آخر میں ایک پراسرار شکل اختیار کر لیتا ہے اور یہ خاص ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کو بیان کرتا ہے۔ جو بعض اوقات انسانوں پر طاری ہو جاتی ہے۔اس قسم کی کیفیت کا ایک انگریزی افسانہ میں نے جوانی میں پڑھا تھا۔جس کی یاد آپ کے افسانے نے تازہ کر دی۔شاعری کے دونوں حصے غزلیات اور منظومات اچھے ہیں۔فرحت نواز کی نظم بچھڑتے لمحوں میں اچھی لگی ہے۔اس نے اپنی جوانی میں یہ کیا سوچنا شروع کر دیا ہے۔منظومات میں ڈاکٹر انور سدید کی منظومات بھی ہیں۔ یہ ہر موضوع پر لکھنے والے ہیں۔میری ترقی پسند تحریک سے وابستگی کی وجہ سے مجھے ان سے بیر رہا ہے۔ میں اگرچہ اوراق کا قاری بھی رہا ہوں۔ایک بار سرگودھا میں جناب راغب شکیب کے ساتھ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات بھی ہوئی تھی۔اور ان کے گرو (اگر یہ لفظ ٹھیک ہے) ڈاکٹر وزیر آغا سے سرگودھا، وزیر آباد اور ڈیرہ غازی خان میں کیف انصاری کے ساتھ ایک شام کے سلسلے میں (جب میں خصوصی طور پر ڈاکٹر وزیر آغا کی خدمت کے لئے مقرر کیا گیا تھا) بھی کئی ملاقاتیں ہوئیں اور ڈاکٹر انور سدید کا ذکر اچھے الفاظ میں ہوتا رہا۔لیکن میرا کفر کبھی نہ ٹوٹا، وہ بلاشبہ اچھے لکھنے والے ہیں۔اور جب سوویت یونین کا زوال ہو گیا اور اس کے ساتھ ادب کی دنیا میں لگائے گئے بہت سے جنگلے ٹوٹ گئے تو ڈاکٹر انور سدید صاحب بھی کراچی کے ترقی پسند رسالے ارتقا میں لکھنے لگ گئے ۔اور اب شاید میں انہیں اس وجہ سے ایک ہمدردانہ رویہ کے ساتھ پڑھنے لگا ہوں اس لئے اس دفعہ ان کی نظمیں مجھے اچھی لگی ہیں۔

سر ظفر اللہ خان سے ہم پرانے واقف ہیں۔ وہ ہمارے وزیر خارجہ رہے ہیں۔ میں نے جب ان کی سوانح عمری تحدیث نعمت پڑھی تو ان کی والدہ کا ذکر آیا میں ان کی اس کتاب میری ماں سے واقف تھا اور اسے پڑھنے کے

لیے بار بار تلاش کرتا رہا۔مگر کہیں سے میسر نہ آئی شکر ہے آپ نے کم از کم اس کا ایک باب پڑھنے کو مہیا کر دیا اور باقی کتاب پڑھنے کی تشنگی کو بھی دو چند کر دیا۔ جے دیوی کے بارے میں اس کے استدراج کو کیا نام دوں؟ میرے لئے یہ حیرت انگیز ہیں۔(مجھے ان واقعات کی سچائی میں کوئی شبہ نہیں)۔۔لیکن مجھے ایسے واقعات کبھی سمجھ نہیں آئے اور میں اس لیے ان پر بہت کم یقین کرتا ہوں۔ کیونکہ مجھے ان کا کوئی سائنسی یا عقلی جواز نظر نہیں آتا اگرچہ میرے بھی چھے بچے فوت ہو گئے ہیں اور ان کی وفات بھی بالکل ان واقعات کے قریب قریب تھی اور میں جس خاتون کو اس کا ذمہ دار سمجھتا تھا اس کے آگے ہتھیار ڈال کر رو پڑا مگر پھر بھی میں ان واقعات کا کوئی مطمئن کرنے والا عقلی جواز کبھی نہیں ڈھونڈ سکا۔اس مضمون میں سر ظفر اللہ خان کی والدہ کا حوصلہ اور عقیدہ یقیناً قابل داد ہے۔اسی طرح آپ کے مضمون جسم اور روح میں جو روحانی واردات کے بارے میں اشارے ہیں وہ بھی میرے لیے ناقابل فہم ہیں اگرچہ اس قسم کے واقعات میری زندگی میں کئی ہیں جیسے سچے خواب وغیرہ مگر میں ہمیشہ انہیں اتفاقات قرار دے کر رد کرتا ہوں۔ کیونکہ مجھے ان کا بھی کوئی عقلی یا سائنسی جواز نہیں ملتا۔لیکن یہ واقعات ہمیشہ مجھے چھیڑتے رہتے ہیں۔اور آپ کی طرف سے مجھے ان دو تحریریں نے ایک دفعہ سوچنے پر پھر مجبور کیا ہے۔ میں وجدان کو ذہن کی انتہائی ترقی یافتہ شکل قرار دیتا ہوں۔ جو کمپیوٹر کی طرح واقعات کو محفوظ کرنے اور پھر نتائج اخذ کرنے کے بعد ان نتائج کو نیند یا سوتے جاگتے خوابوں میں پیش کر دیتا ہے مگر میرے اس نظریئے کے باوجود بہت سے سوالات میرے لیے لاینحل ہیں۔ میرا خیال ہے کہ علامہ اقبال بھی وجدان کو ذہن کی انتہائی ترقی یافتہ شکل سمجھتے تھے۔آپ نے اس مضمون میں کہا ہے کہ آپ کو پاکستان میں بلڈ پریشر کی شکایت رہتی تھی مگر جرمنی میں ختم ہو گئی ہے لیکن آپ نے اس کا نسخہ نہیں لکھا۔(کیا اسکے لئے جرمنی آنا پڑتا ہے) جدید ادب مجھے اور بھی پڑھنا ہے۔جس کے بارے میں ای میلز کے ذریعے گفتگو ہوتی رہے گی۔لیکن باوجود قلم کو روکنے کے معاملہ بہت بڑھ گیا ہے۔اس لیے اس وقت اتنا کافی ہے۔

محمد اسلم رسولپوری (جام پور)

کینیڈا سے خاص محبت نامہ

تازہ مجلّے کی جھلکیاں دیکھیں، یوں لگا حلقۂ یارانِ شعر و ادب میں آ گیا ہوں۔ اگرچہ وہ سب تیز گام اور میں سست قدم۔تخلیقات کا معیار منفرد ہے اور مجموعی تاثر اتنا گھمبیر اور ہمہ گیر کہ حلقے سے باہر نکلنا مشکل۔ یہ سوچ کر نکلا کہ فی الوقت باہر کی آلائشوں سے نمٹ لوں اور کسی فرصت میں ان اکابرین ادب کی جانب ایک بار پھر رجوع ہوں لیکن جب میں چلنے کو تھا، آپ یعنی حیدر قریشی ''جسم اور روح'' پر بزبان تحریر بات کرتے مل گئے۔ موضوع میرا اپنا خاص اور بولنے والا اپنا خاص (جو بھی بھلا لگا وہ بڑی دیر سے ملا)، رُکنا ہی پڑا۔ یہ کیسا اسلوبِ بیان ہے کہ بات سے بات جُڑی ہوئی چل رہی ہے، کبھی خراماں خراماں، کبھی رواں، دواں، کبھی بہہ رہی ہے موج در موج، سیل در سیل، جیسے ہوا۔ اصل موضوع کا یہ حال کہ چلتے چلتے، بہتے بہتے بالکل غائب اور پھر غیر محسوس طریقے سے دوسری

باتوں کے درمیان ایک بار پھر نمودار۔۔خیال،فکر،احساس،ادراک،اپنے طور پر ہر قسم کی قید و بند سے آزاد جیسے سب اپنے طور پر اپنے اپنے کاموں میں مصروف، باہم آمیز ہو کر بھی اور جدا جدا بھی ایک غیر محسوس اسلوب کے بنتّوں (ٹکسچر) میں بندھے ہوئے۔ بظاہر دھاگے الجھے الجھے اِدھر اُدھر نکلتے ہوئے اور پھر خود بخود جُڑتے ہوئے، جیسے کبھی اُدھڑے ہی نہ تھے۔عرفانِ روح کے مذہب کے راستے کے علاوہ دوسرے راستوں کی نشاندہی نے مضمون کے دامن کو زیادہ معنی خیز بنا دیا لیکن موضوع کو تشنہ رہنا تھا،سو رہا۔اصل لطف تو طفلانہ معسومیت، حیرانی اور تجسس کی تحت موجی نے دیا جو مجھ سے کم مایہ قاری سے بھی چھپی نہ رہ سکی۔باتوں کا سلسلہ اس دوران آپ کی تحریر ’’اپنے وقت سے تھوڑا پہلے‘‘ کی سرحد میں داخل ہو چکا ہے۔جسم اور روح سے بھی زیادہ گھمبیر اور گہرے معاملے سے ہم اور آپ دوچار ہیں لیکن لفظیات کا تانا بانا قطعی مختلف ہے۔حیران کن۔۔عجیب طرح کا ہلکا پھلکا پن،ایک مکمل سپردگی،ایک کامل تسلیم و رضا بلکہ راضی بہ رضا والی کیفیت کی فضا میں ایقان کو چھونے والا یہ احساس کہ انسان کی مساعی ہی قدرت کی پر اسرار قوتوں کو مشکل کشائی،تعاون اور سرپرستی کی جانب راغب کرتی ہے۔ لاٹری۔۔نوجوان ،رقم سے معمور سوٹ کیس، پولیس۔۔درمیان میں آپ پولیس کے نرغے میں۔۔ٹرین سے چھوٹے بیٹے کا اترنا۔تبدیلیٔ شخصیت و شناخت۔۔پراسرار معاملات۔کشف کے،وجدان کے،جذب کے، ماہیت قلبی کے،جیسے کوئی شمس تبریز کسی جلال الدین رومی کو قیل وقال کی پستی سے مرتبۂ حال کی بلندیوں پر لے جا رہا ہو۔

یہ جو آپ ناول لکھنے کا سوچ رہے ہو اور توفیق کے طالب ہو، بالکل اسی طرح میں نے بھی سوچا اور حال ہی میں سوچا ہے۔جو دلیل آپ کے ذہن میں آئی ہے وہی میرے ذہن میں آئی تھی کہ میں نے ایک ناول کی زندگی بسر کر لی ہے۔میں آپ کے اس خیال سے سہمت نہیں ہوں جو آپ نے لغت کی اساس پر اپنایا ہے کہ فکشن ہوتا ہی جھوٹ ہے۔فکشن نہ تو سچ ہوتا ہے اور نہ جھوٹ۔فکشن کو سچ لگنا ہوتا ہے، سچ ہونا ضروری نہیں ہوتا۔فی الحال آپ جو یادوں کے سلسلے کے تحت لکھ رہے ہیں میری ناچیز رائے میں ’’نوویلا‘‘ (Novella) کی ایک شکل ہے۔ادب کی ایک صنف جو ایک زمانے میں جرمنی میں بہت مقبول تھی۔

عبداللہ جاوید۔مسی ساگا۔کینیڈا

حیدر قریشی کے افسانے ایک نئے طریقے سے قاری تک پہنچتے ہیں اور ان کی گفتگو کا لہجہ بھی مختلف ہے۔اس اعتبار سے ان افسانوں میں ایک ایسا رویہ بھی شامل ہے جو کہانی سنتے ہوئے سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔کہ کہانی محض کسی واقعے ہی کی بات نہیں کرتی بلکہ اس سچائی کا ذکر بھی کرتی ہے جو واقعیت کے رگ و ریشے میں جاگتی ہے اور سب سے کہتی ہے کہ مجھے پہچانو۔میں کون ہوں؟

سچائی نے ہمارے زمانے میں افسانے کا لباس پہن رکھا ہے۔

(افسانوی مجموعہ **روشنی کی بشارت** کا پیش لفظ از **پروفیسر جیلانی کامران** مطبوعہ ۱۹۹۲ء)